

# مسئلہ خلافت

مولانا ابوالکلام آزادؒ

مکتبہ جمال

تھرڈ فلور، حسن مارکیٹ، اردو بازار لاہور

فون 7232731

جملہ حقوق محفوظ

259/1  
اراسم

نام کتاب \_\_\_\_\_ مسئلہ خلافت

مصنف \_\_\_\_\_ مولانا ابوالکلام آزادؒ

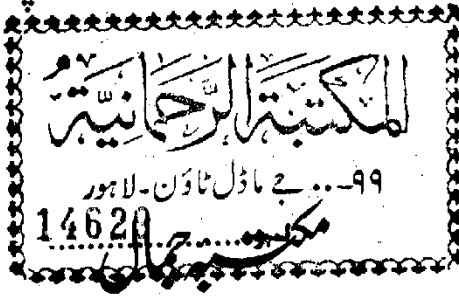
اہتمام \_\_\_\_\_ وقار احمد / شکیل احمد

ناشر \_\_\_\_\_ مکتبہ جمال

مطبع \_\_\_\_\_ اصغر پریس

سن اشاعت \_\_\_\_\_ 2006

قیمت \_\_\_\_\_ ۱۲۰ روپے



تھرڈ فلور، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 7232731

Email: maktaba\_jamal@email.com

maktabajamal@yahoo.co.uk

## فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
7	عرض ناشر	-1
9	پیش لفظ	-2
11	مقدمہ (طبع ثانی)	3
14	مقدمہ (طبع اول)	4
19	خلافت	5
23	خلافت خاصہ و خلافت ملوک	-6
26	عہد اجتماع و اختلاف و دورا شناسی و انتشار	-7
32	جمع و تفرقہ قومی و مناصب	-8
36	اطاعت خلیفہ التزام جماعت	-9
45	شرح حدیث حارث اشعری	-10
54	جماعت و التزام جماعت	-11
57	شرائط امامت و خلافت	-12
64	نصوص سنت و اجماع امت	-13
70	اذا بویع الخلیفتین فاقتلوا اخرهما	-14
71	اجماع امت جمہور فقہاء و اعلام	-15
76	سنی اور شیعہ دونوں متفق ہیں	-16
78	بعض کتب مشہورہ عقائد و فقہ	-17
81	من حمل علینا السلاح فلیس منا	-18
93	اقسام غلاشہ مسلح و حمل سلاح	19
98	واقعہ امام حسینؑ	-20
100	شرط قرشیت	-21
102	الائمہ من قریش۔۔ تحقیق امارت قریش و شرط قرشیت	-22
114	دعوائے اجماع	-23

123	24-	خلافت آل عثمان۔۔۔ چند لحاظ تاریخیہ
126	25-	خلافت و امامت سلاطین عثمانیہ
131	26-	مسلمانان ہند اور خلافت سلاطین عثمانیہ
136	27-	قرن متوسطہ و اخیرہ میں مرکزی حکمرانی
138	28-	ترکان عثمانی اور عالم اسلامی
143	29-	فریضہ عظیمہ دفاع۔۔۔ حقیقت حکم دفاع
146	30-	فضائل دفاع
155	31-	عہد نبوت کا ایک واقعہ
159	32-	ایک عام غلط فہمی
162	33-	احکام قطعیہ دفاع
170	34-	ترتیب و وجوب دفاع
173	35-	جزیرہ عرب و بلدو۔۔۔ مرکز ارضی
176	36-	احکام شرعیہ
180	37-	جزیرہ عرب کی تحدید
185	38-	مسجد اقصیٰ و ارض مقدس
187	39-	خاتمہ سخن۔۔۔ نتائج بحث
289	40-	خلیفۃ المسلمین اور گورنمنٹ برطانیہ
293	41-	موجودہ و آئندہ حالت اور احکام شرعیہ
296	42-	ترک و اختیار (ترک مموالات)
198	43-	واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ
201	44-	هل للامام ان يمنع المتخلفين والقاعدین
203	45-	ایک شبہہ اور اس کا ازالہ
205	46-	برٹش گورنمنٹ کے لیے اصلی سوال
207	47-	مسلمانان ہند اور نظام جماعت
215	48-	ضمیمہ
219	49-	مواعید و عہود
221	50-	ایفائے عہد

## عرض ناشر

مسئلہ خلافت پر جس جامعیت اور ہمہ گیریت سے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے راہوار قلم کو ہمیز دی ہے، وہ صرف اس کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے سے قارئین پر واضح ہو سکتی ہے۔ امام الہند نے خلافت کی لغوی کہہ سے لے کر معنوی اہتیا تک سفر جس شان سے اس کتاب میں قطع کیا ہے اس کے سامنے فکر و نظر کی ساری جولانیاں ماند پڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ امام الہند جس طرح بحث کو ”وامرہم شورعیٰ بہنہم“ کے سٹیج سے اٹھا کر ”انا امرکم بخمس.....“ کے میدان میں لائے ہیں اور پھر اسے ایک مرکز..... المرکز الجامع..... تک لانے میں کامیاب ہوئے ہیں وہ صرف اس کتاب کو پڑھنے سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔

تاہم سلاطین عثمانیہ کے حوالے سے ان کا موقف اس وقت کے ہندوستان کے کل علماء کرام کا متفقہ موقف تھا بلکہ اس وقت ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں نے اس وقت کے مسئلہ خلافت پر تاریخ ساز یگانگت اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ کاش مسئلہ قومیت پر ویسی ہی یگانگت دیکھنے میں آتی۔ ایک ہندو لیڈر کا تحریک خلافت کے خاتمہ پر نوحان لوگوں کے تمسخر کا کافی وشافی جواب ہے جو سمجھتے تھے کہ تحریک خلافت کے لیے جان و مال اور قیل و قال صرف کرنا مسلمانوں کی ایک بھیانک غلطی تھی۔

”مجھے غیب کا علم دیا گیا ہوتا اور میں جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی اہتیاک سے حصہ لیتا کہ جس نے قوم کو بیداری عطا کی ہے.....“ اور میرے خیال میں یہی بیداری تحریک پاکستان پر منتج ہوئی۔

مکتبہ جمال نے عزم کر رکھا ہے کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی ساری تصانیف ایک ایک کر کے زیور طبع سے آراستہ کی جائیں۔ زیر نظر کتاب ”مسئلہ خلافت: جزیرۃ العرب“ کے پہلے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مگر انیسویں کے کسی بھی پبلشر نے اسے اس کی اصلی صورت میں شائع نہیں کیا۔

بعضوں نے تو مولانا کی تحریر میں تبدیلیاں بھی کیں جو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی شان اور علمی آن کے ساتھ سخت نا انصافی ہے۔ مجھے اس کتاب کا اصل نسخہ تلاش بسیار کے بعد محترم پروفیسر افضل حق قرشی صاحب کی ذاتی لائبریری سے ملا۔ انہوں نے کمال شفقت سے یہ نسخہ اشاعت کی غرض سے عطا کیا اور اس سلسلے میں اپنی علمی رہنمائی اور سرپرستی سے بھی مستفید کیا۔

آخر میں محترم پروفیسر افضل حق قرشی صاحب کا بالخصوص اور محترم دوست اصغر نیازی صاحب کا ممنوں ہوں کہ ان کی رہنمائی اور علمی تعاون سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

میاں مختار احمد کھٹانہ

۱۔ تحریک خلافت، قاضی محمد عدیل عباسی، ص 254۔

نوٹ:-

پہلے ایڈیشن میں جو اغلاط رہ گئی تھیں، حالیہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اب بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارے کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی بھی تصحیح کی جاسکے۔

## پیش لفظ

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات وہ عظیم الشان تحریکیں تھیں جنہوں نے بر عظیم پاک و ہند میں برطانوی اقتدار کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور اس کی آزادی کو ممکن بنایا۔ ان تحریکوں کے جلیل القدر رہنماؤں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) مولانا عبدالباری فرنگی مہلی (۱۸۷۸-۱۹۲۶ء) مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸-۱۹۳۶ء) مولانا شوکت علی (۱۸۷۳-۱۹۳۸ء) اور مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) کے نام گرامی شامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات میں ایک بلند پایہ صحافی، بے مثال خطیب، عدیم الطیر نثر نگار، معاملہ فہم مدبر اور ایک عالی مرتبت عالم دین کی ہستیاں سمٹ آئی تھیں۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جس کی ہر جہت درخشاں اور تابناک تھی۔ سید سلیمان ندوی انہیں ابن تیمیہ (۱۲۶۳-۱۳۲۸) ابن قیم (۱۲۹۲-۱۳۵۰) شمس الامتہ سرخسی (۱۰۰۹/۱۰۱۰-۱۰۹۰) اور امیہ بن عبدالعزیز اندلسی (۱۰۶۸-۱۱۳۵) کے ہم پلہ سمجھتے ہیں اور ان کے بقول ”نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال و البلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشاء پر دازی اور زور تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا، اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے دروازے کھول دیئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔“

مولانا کی سیاسی زندگی میں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء نہایت اہم سال تھے۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو راجہ سے رہائی کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء تک جب انہیں گلگت میں پھر گرفتار کیا گیا آپ ملک بھر میں مسلسل دورے کرتے رہے۔ ۲۸-۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو پراونشل خلافت کانفرنس بنگال کے زیر اہتمام اجلاس منعقدہ گلگت میں خطبہ صدارت دیا اور لوگوں کو حکومت سے ترک موالات کی دعوت دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خطبہ زبانی تھا

اور اسے ہی بعد میں ”مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب“ کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ تاثر درست نہیں۔ ایک اور مسئلہ خلافت پر مشتمل اس خطبہ کو مئی ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کے شعبہ تبلیغ و اشاعت نے پہلی بار ”مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب“ کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے آغاز میں مولانا محمد اکرم خان آنریری سیکرٹری خلافت کمیٹی برنگال و شعبہ تبلیغ و اشاعت کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ”مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ رسالہ بطور خطبہ صدارت کے صفحہ ۹۱ تک لکھا تھا۔ بعد کو بقیہ مباحث بھی انہوں نے بڑھا دیئے تاکہ اس موضوع پر ایک مکمل تحریر مرتب ہو جائے..... جلسہ میں مولانا نے اپنی عادت کے مطابق محض زبانی تقریر کی تھی۔ چنانچہ تمہید اور خاتمہ کا حصہ وہی ہے جو اس زبانی تقریر سے قلمبند کیا گیا تھا۔ البتہ تحریر سے بعض ایسے حصے نکال دیئے گئے جو مسئلہ کے سیاسی و ملکی پہلو سے تعلق رکھتے تھے۔“ بعد میں مولانا نے اس پر نظر ثانی کی اور مباحث میں اضافہ کیا۔ نیز دو حصے شامل کیے۔ یہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن مولانا کے مقدمے کے ساتھ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مرزا فضل الدین احمد نے کلکتہ سے شائع کیا۔ اب اس کی ضخامت دو سو پینتیس صفحات تک بڑھ گئی۔ کسی ایک موضوع پر یہ مولانا کی طویل ترین تحریر ہے۔ تحریک خلافت میں تمام افکار کا سرچشمہ یہی ایک تحریر تھی۔ اس کے مطالعے سے قرآن حدیث اور تاریخ اسلام پر مولانا کے علم و نظر کی گہرائی اور گیرائی کا نقش دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے بقول اردو عربی فارسی انگریزی کسی زبان میں اس کی مثال موجود نہیں۔

اشاعت دوم سے اب تک بر عظیم پاک و ہند میں اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کسی بھی ناشر نے اسے اس کی اصل اور مکمل صورت میں شائع نہیں کیا۔ عزیزی میاں عطار احمد کھٹانہ ستاکش کے مستحق ہیں کہ وہ مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے اور کمپیوٹر پر کمپوز کروا کے اب اسے پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے ابوالکلام شناسی میں یہ ایک اہم اضافہ ثابت ہوگا۔

پروفیسر افضل حق قرشی

پنجاب یونیورسٹی لاہور



## مقدمہ

### ﴿طبع ثانی﴾

الحمد للہ وحدہ۔ چار مہینے ہوئے یہ رسالہ خطبہ صدارت کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اب مزید تہذیب و ترتیب اور اضافہٴ فصول و مطالب کے ساتھ بار دوم شائع کیا جاتا ہے۔

پہلے ایڈیشن سے تقریباً ایک ٹکٹ مطالب اس میں زیادہ ہیں۔ وہ تقریر کی شکل میں تھا۔ اس لیے ابواب و فصول منضبط نہ تھے۔ اب یہ کمی پوری کر دی گئی ہے۔

اس ایڈیشن کے حسب ذیل اضافات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں:

(۱) آیہ کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں تحقیق معنی ”اولی الامر“ جس کی طرف پہلے سرسری اشارہ کیا گیا تھا۔

(۲) شرح حدیث حارث اشعری مندرجہ مسند و ترمذی اور نظام و قوام جماعت۔

(۳) اشتراط قرہیہ کا بحث اب بالکل مکمل و ختم کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ الوسع مسئلہ کا کوئی ضروری پہلو بحث و نظر سے باقی نہیں رہا۔ پہلے ایڈیشن میں حدیث ائمہ قریش کے بعض طرق و سلاسل غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیئے تھے لیکن اب ان پر بھی نظر ڈال لی ہے تاکہ بحث بالکل مکمل ہو جائے۔ دعوائی اجماع پر بھی بعض نئے مباحث ملیں گے جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھے۔ امید ہے کہ اصحاب نظر و بصیرت کے لیے یہ حصہ خاص طور پر موجب انشراح خاطر و رفع اضطراب و دفع شکوک و ارتباب ہوگا۔

(۴) مسئلہ ”حمل سلاح علی المسلم“ کی طرف پہلے سرسری طور پر اشارہ کر دیا تھا۔ اب ایک مستقل باب بڑھا دیا ہے اور اصولی طور پر مسئلہ کے تمام اطراف و جوانب صاف ہو گئے ہیں۔

(۵) حکم دفاع کا حصہ بھی پہلے سے زیادہ مشرح و مکمل ہے۔

مسئلہ خلافت تاریخ اسلام کے ان نہایت نازک اور مزملہ اقدام مسائل میں سے ہے جو میدان

تقابل و التزام سے کہیں زیادہ صفحات کتب اور مجالس بحث و نظر میں معرکہ الآراء رہ چکے ہیں اور بعض اندرونی فرق و طوائف کی نزاعات اور مختلف عہدوں کے پولیٹیکل اثرات کی آمیزش و احاطہ نے مسئلہ کی صاف و سہل الفہم صورت کو طرح طرح کی مشکلوں اور پیچیدگیوں سے غبار آلود کر دیا ہے۔ علی الخصوص نصوص سنت کی تشریح، بے شمار اور بظاہر مختلف احادیث کی تطبیق و توفیق ان کے فقہ و حکم کی معرفت و تحقیق اور ہر حکم کو اس کے صحیح محل پر وارد و محمول کر دینے کا معاملہ نہایت غور و فکر اور وسعت نظر و وسوخ ظلم کا محتاج ہے۔ فکری ذرا سی لغزش اور نظری کی تھوڑی سی کوتاہی بھی نہایت سخت غلطیوں کا موجب ہو جاسکتی ہے۔

بائیں ہمہ مسئلہ کی تمام مشکلات جس طرح حل ہو گئی ہیں اور ضمناً جا بجا متعدد اصولی مسائل و مباحث کی نزاعات قدیمہ کا جس طرح بالکلی خاتمہ کر دیا گیا ہے اس کا اندازہ صرف وہی اصحاب علم و بصیرت کر سکتے ہیں جن کو بحث و نظر کی ان وادیوں میں قدم رکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور جو ان مسائل کو ان کے اصلی مصادر و موارد اور متداول کتب قوم میں دیکھ چکے ہیں اور مشکلات کار کے اندازہ شناس ہیں۔

قلیل ماہم۔

معمداً اختصار مانع تشریح و تفصیل رہا اور اکثر مقامات میں اس طرح اشارات کرنے پڑے گویا مخاطبین کی نظر و معلومات بطور مقدمہ کے فرض کر لی ہیں۔ بد قسمتی سے یہ مقدمہ محل نظر ہے مگر بغیر اس کے چارہ بھی نہ تھا۔ افسوس کہ ان مباحث کی نسبت خود مدعیان علم پر بھی عام طور پر واعظانہ و خطیبانہ رنگ غالب ہے۔ نظر و تحقیق سے ذوق رکھنے والے ناپید ہیں۔ اور ہمارے حصہ میں ایک ایسا عہد آیا ہے کہ اگر اس سے بھی زیادہ خیرہ مذاقی و کم نظری کا ماتم پیش آجائے تو گلہ مند نہ ہونا چاہیے:

کم اردنا ذاک الزمان بدم

فخلفنا بدم حد الزمان!

البتہ اس رسالہ کے طبع اول کی اشاعت سے مسئلہ کے تسلیم و اعتراف کا جو اقبال عام طور پر ظہور میں آیا۔ علی الخصوص طبقہ علماء کرام میں۔ اس کے لیے توفیق الہی کا شکر گزار ہوں۔ بے شمار اصحاب نے جن میں ایک بڑی تعداد علماء کی ہے، مؤلف کو مطلع کیا ہے کہ مسئلہ خلافت کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات عارض تھے مگر اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ واللہ یدہی من یشاء الی سواء السبیل۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مؤلف نے گذشتہ فردری کے اجلاس خلافت کانفرنس بنگال میں جب اس رسالہ کے مطالب پر تقریر کی تو بیان کیا تھا کہ اگر موجودہ حالات میں تبدیلی نہ ہوئی تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جائے گا کہ اس حکم شرعی پر عمل پیرا ہو جائیں جس کو مؤلف ”تزک موالات“ کے نام

سے موسوم کرتا ہے۔ پھر اس کی تشریح بھی کر دی تھی اور بتلایا تھا کہ از روئے نص قرآنی مسلمانوں کا اولین عمل فریقِ محارب کے مقابلے میں یہی ہونا چاہیے۔

اگرچہ اس وقت بجز مہاتما گاندھی جی کے تمام اربابِ کار نے اس مسئلہ سے سرد مہری برتی اور طرح طرح کے عذرات پیش ہوتے رہے تاہم حکم قرآنی کی الہامی دربانی صداقت بالا خرغیاب ہوئی اور رفتہ رفتہ تمام اصحابِ کار کو طوعاً و کرہاً اس پر متعلق ہو جانا پڑا:

انک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

اب ملک کی سیاسی جماعتیں بھی اس اعتراف میں ہمارے ساتھ شریک ہیں اور یقین کرتی ہیں کہ ملک کی نجات کے لیے اس کے سوا کوئی راہ نہیں۔ یہ یقیناً کارفرمائے غیب ہی کی کار سازی ہے کہ اس نے ملک کی ایک راست باز غیر مسلم ہستی یعنی مہاتما گاندھی جی کے صداقت اندیش دل کو بھی خود بخود اس حقیقت کے علم و فہم کے لیے کھول دیا اور انہوں نے بھی چارہ کار دیکھا تو وہی تھا جو تیرہ سو برس پہلے مسلمانوں کو بتلادیا گیا ہے۔

۲۰- جنوری سنہ ۲۰- کو جب دہلی میں خلافت ڈیپوشیشن کی ایک محبت مشورہ منعقد ہوئی اور سب سے پہلی مرتبہ ”نان کوآپریشن“ کی تجویز بحث میں آئی تو اس وقت صرف مسٹر گاندھی اور مؤلف رسالہ ہی کے دل و زبان پر تھی۔ باقی یا متردد تھے یا مخالف۔ لیکن الحمد للہ کہ آج ملک کے تمام مسلم و غیر مسلم اربابِ عمل و صفا کا متفقہ اعلان یہی ہے!

یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس رسالہ میں مسلمانان ہند کے فرائض و اعمال کی نسبت جو کچھ ہینڈ استقبالی لکھا گیا تھا وہ اشاعت کے بعد حال کے حکم میں آ گیا ہے۔ موجودہ صورت حال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں پر کیا کیا فرائض عائد ہو جائیں گے؟ بلکہ یہ ہے کہ جو کچھ عائد ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوال جو توجہ احکام کا نہیں ہے ادائے فرض کا درپیش ہے۔ رسالہ کے آخری ابواب میں مختصراً اس طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ تفصیل دوسرے حصہ میں ملے گی جو ”ترک موالات“ کے نام سے (مع مفصل طریق عمل و ترتیب کار) خلافت کمیٹی کی جانب سے شائع ہونے والا ہے اور جس کو آج کل قلمبند کر رہا ہوں۔ فان اعش، لہما بینہما لکم، و ان امت، لہما انا بصحبکم بحرہم۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

۹- محرم سنہ ۱۳۳۹

احمد

کان اللہ

(پنجاب میل اسٹیشن کانپور)

## مقدمہ (طبع اول)

مسئلہ خلافت و بلاد مقدسہ کی نسبت مسلمانوں کے مطالبات کی تمام تر بنیاد احکام شرعیہ پر ہے۔ اس لیے سب سے مقدم کام یہ تھا کہ ایک مبسوط تحریر اس موضوع پر شائع کی جاتی، جس میں تمام احکام شرعیہ کی پوری طرح شرح و تحقیق ہوتی اور جس قدر شبہات اس بارے میں پیدا ہو سکتے ہیں ان سب کا کما حقہ ازالہ کر دیا جاتا۔

یہ رسالہ اسی غرض سے شائع کیا جاتا ہے۔

۲۸-۲۹- فروری سنہ ۲۰ کو بنگال خلافت کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے لیے مولانا ابوالکلام نے یہ رسالہ بطور خطبہ صدارت کے صفحہ ۹۱- تک لکھا تھا۔ بعد کو بقیہ مباحث بھی انہوں نے بڑھادیئے تاکہ اس موضوع پر ایک کھل کر تحریر مرتب ہو جائے۔ جلسہ میں مولانا نے اپنی عادت کے مطابق محض زبانی تقریر کی تھی اور اسی کے ضمن میں احکام و دلائل کا خلاصہ بھی آ گیا تھا۔ چنانچہ تمہید اور خاتمہ کا حصہ وہی ہے جو اس زبانی تقریر سے قلمبند کیا گیا تھا۔ البتہ تحریر سے بعض ایسے حصے نکال دیئے گئے جو مسئلہ کے سیاسی و فکری پہلو سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً ہندو مسلمانوں کا اتحاد اور دنیا کا مستقبل عالمگیر امن۔ تاکہ یہ رسالہ صرف احکام شرعیہ کی بحث و تحقیق کے لیے خاص ہو جائے اور ان مباحث کو علیحدہ رسالوں کی شکل میں شائع کیا جائے۔

اس رسالہ کی اشاعت سے تبلیغ و اشاعت کا پہلا کام انجام پا گیا۔ یعنی مسئلہ پر شرح و بسط کے ساتھ ایک کھل کر بحث ہو گئی جس کا خطاب زیادہ تر حضرات علماء سے ہے۔

نیز ایک ایسا جامع رسالہ تیار ہو گیا، جس میں مسئلہ کا تمام ضروری مواد موجود ہے۔ اب جو ارباب قلم اور کارکنان مجالس خلافت تبلیغ و اشاعت کے لیے مضامین شائع کرنا چاہیں وہ اس مواد کو پیش نظر رکھ کر مختلف پیرایوں اور شکلوں میں متعدد رسالے مرتب کر لے سکتے ہیں۔

محمد اکرم خان

کلکتہ

آزربری سیکرٹری خلافت کمیٹی بنگال

مئی سنہ ۱۹۲۰ء



الحمد لله نحمدہ و نستعينه و نستغفره و نومن به و نتوكل عليه.  
و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا. من يهدي الله  
فلا مضل له، و من يضلله فلا هادي له. و نشهد ان لا اله الا الله  
و حده لا شريك له. و نشهد ان سيدنا محمد عبده و رسوله.  
صلى الله عليه و على اله و اصحابه و سلم۔

برادران و بزرگان ملک و ملت!

آپ کے صوبے کی یہ پہلی خلافت کا نفرنس ہے جس کی صدارت کی عزت مجھے دی گئی ہے۔  
آپ کی کمیٹی کے معزز ارکان میں سے ہر رکن یقیناً اس بات سے واقف ہوگا کہ اس قسم کی ریسیانہ اور رسمی  
حیثیت کا اختیار کرنا میری زندگی میں سب سے پہلا واقعہ ہے اور اس طریق عمل سے مجھے روگردان و  
مخرف ثابت کرتا ہے جس پر نہایت اصرار کے ساتھ قائم رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہوں۔ سنا ۱۹۱۱ء میں  
جبکہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک  
”مذہب عمل“ قرار دے لوں۔ خدمت ملک و ملت کے دشت تاپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے  
اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس  
نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہو۔ اس طوقانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا  
کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے۔ اس وقت اپنے مذہب  
عمل کی نسبت جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا، ان میں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی  
زندگی کے ہر حصہ میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت، انجمنوں کے عہدوں اور اسی طرح کے تمام ریسیانہ اور رسمی  
منصوبوں سے یک قلم کنارہ کش رہوں گا۔

یہ فیصلہ دراصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا قدرتی نتیجہ تھا۔ میں نے اپنے لیے جو راہ  
عمل منتخب کی تھی وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی۔ موجودہ زمانے کی مصطلح لیڈر شپ کی راہ نہ تھی۔ میرے سامنے  
اجتماع و اقتداء کے لیے لوح انسانی کے ان مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں

کے نام سے پکارے گئے ہیں اور جن کے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں ”حکمت“ اور ”سننہ“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میں اپنی راہِ طیبی کا ہاتھ ابراہیم و محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کے رہنما ہاتھوں میں دے دینے کے لیے مضطر تھا۔ گریبا لڈی، میزبری یا گلید اسٹن اور پارش بننے کا عشق میرے اندر نہ تھا۔ پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا وجود کسی گوشہ فقر و نامرادی میں خدمت و محنت کا ایک غیر دلچسپ منظر ہوتا یا انسانوں کے کسی جھوم میں ایک پکارنے والے کی بے پروا پکار۔ لیکن یہ بالکل ناممکن تھا کہ بیسویں صدی کے فراموش کردہ عہد نبوۃ و مذہب کا ایک ولدادۃ انجمنوں کا عہدہ دار اور مجلسوں کا باقاعدہ پریزیڈنٹ ہو۔ خدا کے رسولوں کا طریق خدمت و دعوت اور بیسویں صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست و حکومت ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے۔

حضراتِ اہلبہ عمل کے اس بنیادی اعتقاد نے میرے لیے قدم قدم پر مشکلات پیدا کر دیں۔ باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے مجھے ہمیشہ اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و رفیق اور صرف اپنے سایہ ہی پر قانع رہنا پڑا۔ یہ مدیعتِ زار عالم جو اپنے ہر گوشہ میں معقوں اور رفاقتوں کے راحت افزا جلوؤں سے معمور ہے میرے لیے ہمیشہ سمندرِ ری یا ایک صحرائے ریگِ زار لیکن کبھی ایک آبادی اور بستی کا اس نے کام نہیں دیا اور نہ کبھی میں اپنے تئیں اس قابل بنا سکا کہ اس کی رفاقتوں کا ساتھ دے سکوں۔ تاہم آپ حضرات کے لیے یہ عرض کرنا ضروری نہیں ہے کہ جہاں تک ایک ناچیز انسانی ہستی ارادہ کے ساتھ عمل کو جمع کر سکتی ہے میں اپنے اصولوں پر قائم رہنے کے لیے ہمیشہ سخت رہا ہوں اور موجودہ زمانے کی لیڈرشپ کی ولفریب سے ولفریب نما تئیں اور ایتانے عصر کی رفاقت و معیت کی صبر آزما دلچسپیاں بھی اس بارے میں میرے لیے موثر نہیں ہوئی ہیں۔

اسی بنا پر جب آپ کے لائق اور سرگرم سیکرٹری کا تار مجھے بنارس میں ملا اور انہوں نے لکھا کہ کانفرنس کی صدارت تم کو منظور کر لینی چاہیے۔ تو میں نے اداۃ تشکر و امتنان کے بعد اپنے آپ کو اس سے معذور ظاہر کیا۔

لیکن جب میں کلکتہ پہنچا اور اس بارے میں زبانی گفتگو ہوئی تو کچھ عرصہ کی رد و کد کے بعد میں نے منظور کر لیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ یقیناً اپنے دستور العمل سے ایک کلا انحراف ہے لیکن آپ یقین کیجئے کہ اس انحراف کے لیے جس چیز نے مجھے مجبور کیا، اس کی حفاظت بھی میرے لیے تمام اصولوں اور قاعدوں سے زیادہ ضروری تھی۔ اصول مقاصد کے لیے ہیں۔ مقاصد اصول کے لیے نہیں ہیں۔ پس دنیا کے اس سچے اور قدرتی قانون کی بنا پر کہ ہر بڑی چیز کے لیے چھوٹی چیز کو اور ہمیشہ مقاصد کے لیے وسائل کو قربان کر دینا چاہیے میں تیار ہو گیا کہ مقصد کی راہ میں مقصد کے ایک وسیلے یعنی اپنے

طریق عمل کو خیر ہاد کہہ دوں اور اس مجلس کی صدارت منظور کرنے سے انکار نہ کروں۔  
حضرات! میں چاہتا ہوں کہ نہایت صفائی کے ساتھ بے پردہ وہ اصلی سبب بھی عرض کروں جس نے مجھے یا ایک اپنے طریق عمل کے برخلاف اس بات کے لیے آمادہ کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے نظر بندی کے گوشہ قید و عزلت سے نکلے ہوئے بمشکل ابھی پورے دو مہینے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس تھوڑے عرصے کے اندر ہی میں نے پوری طرح اندازہ کر لیا ہے کہ موجودہ اسلامی دہلی مسائل کی نسبت کام کرنے والوں کے طریق عمل کا کیا حال ہے؟ مجھے صاف صاف عرض کر دینا پڑتا ہے کہ ملک کے کارفرما طبقہ کی نسبت اب سے سات سال پہلے جو رائیں میں نے قائم کی تھیں اور جن کی وجہ سے بسا اوقات نہایت قیمتی اور محبوب رفاقتوں سے بھی دست بردار ہو جانا پڑتا تھا بد قسمتی سے اب تک ان میں تبدیلی کا وقت نہیں آیا ہے۔

متضاد مناظر کا کچھ عجیب عالم ہے جس کو اپنے چاروں طرف پاتا ہوں۔ ایک طرف ملک کی عام پبلک ہے اور سورج کی روشنی کی طرح بالکل یقینی صورت میں دیکھ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر حالت میں وہ کسی صحیح راہ عمل پر چل کھڑے ہونے کے لیے منتظر و مستعد ہے۔ دوسری طرف کام کرنے والوں کی جماعت ہے اور جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں اس پر اب تک وہی تذبذب و اضطراب اور تزلزل و انتشار کا عالم طاری نظر آتا ہے جو تمام پچھلے دوروں میں طاری رہ چکا ہے۔ اب تک مقاصد سے اعراض ہے اور وسائل میں انہماک۔ اب تک حقیقی مصلحت بنی اور حیلہ جوئی و بہانہ سازی میں امتیاز کی راہ مسدود ہے اور عزم و یقین کی جگہ ظن و شک اور خوف و ہراس کی حکومت قائم ہے۔ زبانوں کی لکنت گو دور ہو چکی اور شاید چہروں کا ہراس بھی جاتا رہا لیکن دلوں کی دہشت بدستور باقی ہے اور ایمان کی کمزوری نے اب تک رحوں کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ زبانیں جس قدر تیز ہیں قدم میں اتنی تیزی نہیں ہے اور اعلان جس قدر بلند آہنگی اور رعد آسانی رکھتا ہے عمل میں اس قدر بلند بیانی نظر نہیں آتی۔ نیند گروٹ چکی اور شاید خفگان بستر غفلت کروٹیں بھی بدل چکے، لیکن آنکھوں میں خار بدستور باقی ہے اور دھواں بڑھتا جاتا ہے لیکن شعلوں کی چمک کہیں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ خدا کے مقدس نام کی تقدیس سے اب کوئی زبان نا آشنا نہیں رہی، لیکن دلوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا ڈر اور ایمان کے ساتھ نفس کا عشق بھی باقی ہے:

وَيُؤْمِنُونَ أَنْ يُشْعَلُوا مِنْ ذَٰلِكُمْ سَبِيلًا (۱۵۰:۳) اور چاہتے ہیں کہ ان دونوں راہوں کے تین تین کوئی تیسری راہ اختیار کریں۔ حالانکہ تیسری راہ اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں۔ راہیں صرف دو ہی ہیں۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۲۹:۱۸)۔ حضرت مسیح نے کہا ہے: "ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں کر سکتا" قرآن کا بھی فیصلہ یہی ہے: مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرِجَالٍ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا جُؤْهِرًا

(۳:۳۳) یعنی:

ہے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

حضرات! مجھے ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے اگر میں حقیقت کو اس سے بھی زیادہ بے نقاب دیکھنا چاہوں۔ افسوس کہ وقت کی جلدی اور قانون قدرت کی بے مبری نے ہماری غفلتوں کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اپنی ازلی بے پروائی کے ساتھ نتائج و عواقب کی آخری منزل تک بڑھتا چلا آیا ہے۔ اب موت و حیات بقاء و فنا، ایمان و کفر اور خدا اور ماسوائے اللہ کی منزل ہمارے سامنے ہے اور اس لیے میں قابل ملامت نہیں ہوں اگر حسن بیان اور بلاغت اظہار کے پرہیز آداب و قواعد کو موت و حیات کی کشمکش میں سنبھال نہیں سکتا۔ یہ حالات دیکھ کر میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر مجھ کو ایک مجلس کے صدر کی حیثیت سے اظہار مطالب کا موقع ملتا ہے تو میں اس سے انکار نہ کروں اور اگر صدارت کے حقوق و اختیارات کو اصل مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہوں تو اس کو ایک مفید فرصت تصور کروں۔ شاید اس طرح اس صحیح راہ عمل کی طرف کوئی قدم اٹھ سکے جس کو بارہ سال سے اپنے سامنے رکھتا ہوں لیکن رفیقان طریق نے ہمیشہ اس سے اعراض کیا ہے اور آج بھی جبکہ اس اعراض کے نتائج سامنے ہیں تذبذب و اضطراب عمل، عزم و ایمان کے استحکام پر غالب نظر آ رہا ہے۔

حضرات! صرف یہی ایک خیال تھا جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ آپ نے اپنی محبت اور مہربانی سے جو عزت مجھے دینی چاہی ہے اس سے گریز نہ کروں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں اور آپ کی دلی رفاقت و اعانت کا طلبگار۔ ہم سب کو اللہ کے فضل و توفیق پر اعتماد ہے جس کے بغیر کامنات ہستی کا کوئی ارادہ اور کوئی عمل کامیابی اور فلاح نہیں پاسکتا۔

امیر جمع ہیں احباب درو دل کہہ لے  
پھر التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے!  
وما توفیقی الا باللہ۔ علیہ توکلت والیہ الیہ۔

☆☆☆



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

## خلافت

”خلافت“ عربی کا ایک مصدر ہے۔ اس کا مادہ ہے ”خلف“ اور اسی سے ہے ”خليفة“۔ خلافت کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں۔ من لولک خلف فلان فلانا فی هذا الامر اذا قام مقامه فیه بعده (ابن فارس) یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے بعد اس کا نائب و قائم مقام ہوا تو یہ خلافت ہوئی، اور لغت میں اس کو خلیفہ یعنی بعد کو آنے والا اور قائم مقام کہیں گے، خواہ یہ نیابت سابق کی موت و عزل کی وجہ سے ہوئی ہو یا نھیبت کی وجہ سے، یا اپنا اختیار اور منصب سپرد کر دینے کی وجہ سے۔ مفردات امام راغب میں ہے۔ ”الخلافة، النيابة عن الغير، اما بالغیبة المنوب عنه، واما لموته، واما لمجزه واما لتشریف المستخلف“ (صفحہ ۱۵۵)

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے۔ یعنی عربی زبان کے ان لفظوں میں سے ہے جن کو لغت میں عام معانی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر قرآن حکیم نے اپنے خاص معطلحہ شرع معنی کے لیے اختیار کر لیا جیسے ایمان غیب، تقدیر، بعث، صلوة وغیرہ ڈاک۔ ایمان کے لغوی معنی یقین و طمانیت اور زوال خوف و شک کے تھے، لیکن قرآن حکیم نے اس کو ایک خاص طرح کے یقین و اقرار اور عمل کے لیے استعمال کیا اور اب ایمان قرآن کی بولی میں عام لغوی معنی کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار پا گئی ہے۔ قرآن کی زبان میں خلافت اور ”استخفاف فی الارض“ اور وراثت و تمکن فی الارض سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے۔ قرآن حکیم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافت ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کے لیے ایک خاص ذمہ دار قوم و حکومت قائم ہو۔ وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم و جور اور ضلالت و طغیان سے اس کی زمین پاک ہو جائے، ایک عام امن و سکون اور راحت و طمانیت دنیا میں پھیل جائے اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لے کر زمین کے ذرات تک نافذ و قائم ہے اور جس کو قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، زمین کے گوشے گوشے اور چپے

پہلے میں جاری و ساری ہو کر کرۂ ارضی کو سعادت و امانت کی ایک بہشت زار بنا دے!

لغت کے اعتبار سے یہ اطلاق اس لیے ہوا کہ سب سے پہلے جو قوم اور قوم کا جو فرد خلیفہ ہوا وہ زمین پر اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں اللہ کی نیابت اور قائم مقامی رکھتا تھا اور اس کے بعد والی قوم اپنے سابق کی نائب تھی اور ہر خلیفہ، سابق کا قائم مقام۔ ظہور اسلام کے بعد جب ارضی خلافت کے وارث مسلمان ہوئے تو اس سلسلہ کا پہلا خلیفہ اللہ صاحب شریعت و شارع اسلام تھا۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر ان کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آئی وہ اس خلیفہ اللہ کے نائب اور قائم مقام ہوئے، اس لیے ان پر خلیفہ کا اطلاق ہوا اور اب تک ہو رہا ہے۔

یہ زمین کی وراثت و خلافت یکے بعد دیگر مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دین حق کے خدمت گزار رہے۔ آیات ذیل میں اسی خلافت کا ذکر ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ خَلِيفَةَ الْأَرْضِ (۶: ۱۶۵)

وہی پروردگار عالم ہے جس نے تم کو زمین میں خلافت دی۔

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۱۱: ۵۷)

اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو میرا پروردگار تمہاری جگہ خلافت کسی دوسری قوم کو دے دے گا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَةَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰: ۱۴)

پھر ان قوموں کے بعد ہم نے تم کو ان کی جگہ دی تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں۔

وَأذْكُرُوا إِذْ جَعَلْنَاكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (۴: ۶۹)

اور یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (۳۸: ۲۶)

اے داؤد! ہم نے زمین میں تم کو خلیفہ بنایا۔

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے بھی تعبیر کیا گیا۔

وَأَقْلَدُكُمْ نَبِيًّا فِي الزُّبُرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا عِبَادِي

الصَّالِحُونَ (۲۱: ۱۰۵)

اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ یقیناً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں

ہی کی وراثت میں آئے گی۔

یہی چیز زمین کی ”حمکین“ یعنی طاقت و عظمت کا جواؤ اور قیام بھی ہے جو سر زمین فراعنہ میں کھان کے ایک اسرائیلی نوجوان نے حاصل کی تھی، جبکہ وہ غلامی کی حالت میں وہاں فروخت کیا گیا اور پھر اپنے عمل حق و صالح کی قوت سے ایک دن مصر کے تاج و تخت کا مالک ہو گیا۔

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ (۵۶: ۱۲)

اس طرح ہم نے یوسف کی عظمت مصر میں قائم کر دی۔

اور اسی کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

الَّذِينَ إِذَا مَنَّاهُمْ عَلَى الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا

بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاللَّهُ عَالِمُ الْأُمُورِ (۳۱: ۲۲)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کی طاقت زمین میں جمادیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز کو قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے دنیا کو روکیں گے۔

اس آیت کریمہ سے صاف طور پر یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ حمکین فی الارض یعنی حکومت کا

مقصد اصلی قرآن کریم کے نزدیک کیا ہے؟ مظلوم ہو گیا کہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی عبادت دنیا میں قائم کی جائے، نیکی اور راستی کا اعلان و ظہور ہو، برائی سے نوع انسانی کے دلوں اور ہاتھوں کو روک دیا جائے۔

دوسری آیت میں اس کو خلافت کے لفظ سے تعبیر کیا۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي

الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي

ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ط يَعْلَمُونَ نَبِيَّ لَا بُشْرَ لَكُمْ

بِهِ فَبِنَا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ. (۵۵: ۲۳)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی دشمنوں سے

گھری ہوئی تھی اور قلت تعداد و بے سروسامانی کی حالت کے ساتھ دشمنوں کے پے در پے حملوں کی وجہ

سے یہ حال تھا کہ کسی وقت بھی ہتھیار اپنے جسم سے دور نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت بعض مسلمانوں کی

زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا مایا تسی علینا یوم نامن فیہ ونضع عنا الاسلح۔

ایک دن بھی ہم پر ایسا نہیں آیا کہ امن و بے خوفی کے ساتھ صبح و شام بسر کرتے اور ہتھیار اپنے

جسم سے الگ کر سکتے۔

ابوالعالیہ راوی ہیں کہ اس پر مندرجہ صدر آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ مضطرب نہ ہوں، ایمان و عمل صالح کا پھل عنقریب ملنے والا ہے۔ جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا، مظلومی و پھارگی کی جگہ فرمائروائی و کامرانی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضہ اقتدار میں آجائے گی۔ (تفسیر طبری جلد ۱۸ صفحہ ۶۲۲)

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز ”خلافت“ ہے وہ خلافت فی الارض ہے۔ یعنی زمین کی حکومت و تسلط۔ پس اسلام کا خلیفہ ہونے میں سکتا جب تک بموجب اس آیت کے زمین پر کامل حکومت و اختیار سے حاصل نہ ہو۔ وہ مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی ودینی اقتدار نہیں ہے جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو۔ وہ کامل معنوں میں سلطنت و فرمائروائی ہے۔ اسلام کے قانون میں دینی و روحانی اقتدار خدا اور رسول کے سوا کوئی انسانی وجود نہیں رکھتا۔ ایسے اقتدار کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے اور اس کا مٹانا اس کے ظہور کا پہلا کام تھا۔

اتَّخَذُوا أَوْلِيَاءَهُمْ وَرَهْبَانَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳۱.۹) اور  
مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ  
كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّكُمْ عَلِيمُونَ  
الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۷۹.۳)

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا۔ آٹھ لو سال بعد جب داعی اسلام دنیا سے تشریف لے گئے تو تمام ہزیرہ عرب مسلمانوں کے قبضہ اقتدار میں آچکا تھا اور رومیوں کے مقابلہ کے لیے اسلامی فوجیں مدینہ سے نکل رہی تھیں۔ اس سلسلہ خلافت اسلامیہ کا پہلا خلیفہ اللہ خود حضرت داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود مقدس تھا اور آپ ﷺ نے اپنے بعد کے جانشینوں کو خود لفظ خلفاء سے تعبیر فرما کر واضح کر دیا تھا کہ وہ آپ کے نائب اور قائم مقام ہوں گے۔ ”علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدين“ (ابن ماجہ عن العراءض ابن ساریہ)۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت ابو بکرؓ جب جانشین ہوئے تو وہ خلیفہ رسول اللہ تھے۔



## خلافت خاصہ و خلافت ملوکی

آنحضرتؐ کے بعد خلافت اپنے خصائص و نتائج کے اعتبار سے دو بڑے سلسلوں میں منقسم ہو گئی۔ خود آنحضرتؐ نے نہ صرف ان کی پیشتر سے خبر ہی دے دی تھی، بلکہ تمام علائم و خصائص صاف صاف بیان کر دیئے تھے۔ اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں، وہ کثرت طرق، شہرت متن، قبول طبقات کی بنا پر حد تو اتر تک پہنچ چکی ہیں۔ پہلا سلسلہ، خلافت خلفائے راشدین مہدیین کا تھا جن کی خلافت منہاج نبوت پر تھی۔ یعنی وہ صحیح و کامل معنوں میں منصب نبوت کے جانشین اور جامعیت شخص رسالت کے قائم مقام تھے۔ ان کا طریق کار ٹھیک ٹھیک طریق نبوت کے مطابق تھا اور اس لیے گویا عہد نبوت کا ایک آخری جزو تھا اور جس طرح وجود نبوت میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا، اسی طرح ان کی شخصیت بھی جامع و حاوی تھی۔ دینی دعوت اور شرعی اجتہاد و امر حکومت و فرمانروائی اور قوام و نظام شرع نظام شریعت اور نظام سیاست، یہ تمام تو تیس ان کی ذات واحد میں جمع تھیں۔ ان کی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی۔ یعنی حکومت شوری، جس کو آج کل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ ری پبلک کہہ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔

دوسرا سلسلہ خلافت منہاج نبوت سے الگ مجرد حکومت و پادشاہت کا تھا، جب کہ عجمی بدعتیں خالص اسلامی و عربی تمدن سے مل کر ایک نیا دور شروع کر رہی تھیں۔ یہ سلسلہ خلافت اگرچہ بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں پہلے سلسلے سے اقرب تھا، لیکن خلافت راشدہ کے حقیقی خصائص ناپید ہو گئے تھے۔ خلفاء بنو امیہ سے لے کر آج تک جو سلسلہ خلافت اسلامیہ جاری ہے، وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔ احادیث میں پہلے سلسلہ کو بوجہ غلبہ طریق ہدایت و نبوت خلافت کے لفظ سے اور دوسرے کو بوجہ غلبہ سیاست و شخصیت بادشاہت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

”الخلافة بعدی ثلاثون عاما ثم ملک بعد ذلك“ (اخرجه اصحاب السنن)

اور حدیث ابو ہریرہ ”الخلافة بالمدينة والملك بالشام

ایک دوسری حدیث میں بالترتیب تین دور بتلائے گئے ہیں۔ ”نبوة ورحمة ثم خلافة

ورحمة“ ولفی لفظ ”خلافة علی منہاج النبوة ثم یکون ملک عضوض“ (رواه البزار وقال السیولمی حسن) امیر معاویہ نے اسی کی نسبت کہا تھا ہم نے عہد ملوکی پر قناعت کر لی۔

آخری حدیث کے مطابق تین دور ہوئے۔ عہد نبوت و رحمت، خلافت و رحمت، پادشاہی و فرمانروائی۔ پہلا دور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ختم ہو گیا۔ دوسرا دور نبی الحقیقت عہد نبوت کا ایک تہہ اور لازمی جز تھا (جیسا کہ سلسلہ دعوت اور تکمیل کا روبرو شروع میں ہمیشہ سفق اللہ رہی ہے) جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے مجرد عہد پادشاہی و استبدادی شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ اس دور کی بھی بہت سی مختلف شاخیں علیحدہ علیحدہ احادیث میں بتلائی گئی تھیں اور وہ سب ٹھیک ٹھیک ظہور میں آئیں۔ نبوت و رحمت کی برکات کی محرومی و فقدان کا ایک تدریجی منزل تھا اور بدعات و فتن کے ظہور و احاطہ کی ایک تدریجی ترقی ہوئی۔ کالہ حصیر عودًا عودًا۔ جو حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوئی اور جس قدر عہد نبوت سے دوری بڑھتی گئی اتنی ہی عہد نبوت اور خلافت رحمت کی سعادتوں سے لطف محروم ہوتی گئی۔ یہ محرومی صرف امامت و خلافت کبریٰ کے معاملہ ہی میں نہیں ہوئی، بلکہ قوام و نظام لطف کے مہادیات و اساسات سے لے کر حیات شخصی و انفرادی کی اعتقادی و عملی جزئیات تک، ساری باتوں کا یہی حال ہوا۔ فتن و فساد کے اس سیلاب کو صرف ایک دیوار روکے ہوئے تھی جو بقول حضرت حذیفہ (اعلم الصحابة بالفتن) حضرت عمر کا وجود تھا۔ جونہی یہ بنیان مرموص ہئی سیلاب عظیم امنڈا اور پھر کوئی سد و بند اس کی راہ نہ روک سکا۔ اسی سیلاب کو حضرت حذیفہؓ کی روایت میں التی تموج کموج البحر (رواہ بخاری) سے تعبیر کیا گیا تھا۔ یعنی سمندر کی موجوں کی طرح اس کی موجیں اٹھیں گی سو اتنی اٹھیں اور دور خلافت و رحمت اور خلافت علمیٰ منہاج النبوة کی عظیم الشان عمارت اس کے تلامذہ و طغیان میں آنا فنا ہو جائے گی۔

احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے ایک آخری دور کی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے دور اول کے خصائص تازہ کر دے گا اور جس کا حال یہ ہوگا کہ ”لا یدری اولہا خیراً ام اخرها“ نہیں کہا جاسکتا کہ لطف کی ابتداء زیادہ کامیاب تھی یا اس کا اختتام؟ یہی وہ آخری زمانہ ہوگا جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معنوں میں پورا ہو کر رہے گا کہ۔

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ. (۹۰۶۱)

دین اسلام اور اس کا رسول اس لیے آیا کہ تمام دینوں اور قوموں پر بالآخر غالب ہو کر رہے (کیونکہ آخری غلبہ دیناً صرف صلح کے لیے ہے اور تمام دینوں میں صلح صرف اسلام ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مایوسیوں اور نامرادیوں کی اس عالمگیر تاریکی میں بھی جو آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، ایک مومن قلب کے لیے فتح و اقبال کی روشنیاں برابر چمک رہی ہیں بلکہ جس قدر تاریکی بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ طلوع صبح کا وقت قریب آتا جاتا ہے۔ ان موعدهم الصبح الیس

الصبح بقریب۔ ان کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔ کیا صبح کا وقت قریب نہیں آ گیا؟  
تفاوت ست مہمان شنیدن من و تو  
بستن درو من فتح باب می شنوم



## عہد اجتماع و اختلاف و دور اشتات و انتشار

آپ آزرده خاطر نہ ہوں اگر موضوع کی وسعت چند لہجوں کے لیے مجھے اپنے اطراف و جوانب کی طرف بے اختیار مائل کر لے۔ اس مقام کی مزید وضاحت کے لیے بہتر ہوگا کہ دو خاص اصطلاحی لفظوں کے معانی پر آپ پہلے غور کر لیں۔ ایک ”اجتماع“ و ”اختلاف“ ہے اور دوسرا ”اشتات“ و ”انتشار“ نہ صرف امت اسلامیہ بلکہ تمام اقوام عالم کی موت و حیات، ترقی و تنزل اور سعادت و شقاوت کے جو اصولی اسباب و مراتب قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں، ان کی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔ ”اجتماع“ کے معنی ہیں ضم الشی بتقریب بعضہ من بعض (مفردات امام راغب ۹۵) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا اور اختلاف ”الف“ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں ما جمع من اجزاء مختلفه ورتب ترتیباً، قدم لہ ما حقہ ان یقدم، و اخر لہ ما حقہ ان یؤخر“ (مفردات ۱۹) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہی جگہ اسے ملے جو پہلے ہونے کی حقदार ہے وہ پہلے رہے۔ جس کو آخری جگہ ملنی چاہیے وہ آخری جگہ پائے۔ ”عہد اجتماع و اختلاف“ سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں اور تمام مواد، قوی، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے۔ بہ حدیکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہدگر جزا اور ملاما ہوا، ہر چیز بندگی اور کسبی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد متصل ہو جاتا ہے، کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے تو اسی سے تخلیق و نگون اور وجود ہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبہ ”تخلیق“ و ”تسویہ“ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ الذی خلق فسوی (۲۸۷) پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع و اختلاف اور موت و فنا نہیں ہے مگر اس کی ضد یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اس کو ”خیر“ اور شریعت کی زبان میں ”عمل صالح اور حسنت“ کہتے ہیں۔ جب یہ حالت جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں ”تندرستی“ سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ ”زندگی“ ہے اور پھر یہی حالت ہے جب



قوی و جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام ”حیات قوی و اجتماعی“ ہوتا ہے اور اس کا ظہور قوی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں معنی ایک ہے۔ مظاہر کو مختلف ہیں مگر اس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح، اس کا قانون حیات و وجود بھی اس کائنات اسی میں ایک ہی ہے و لنعم ما قبل۔

عبارت ان شتی و حسنک واحد و کل الی ذاک الجمال یشیر  
اس حالت کی ضد ”اشتات و اشتزاز“ ہے۔ اشتات ”شمتت“ سے ہے جس کے معنی لغت میں ”تفریق“ اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ ”یقال شت جمعہم شتا و شتاتاً و جاوا اشتاتاً۔ ای متفرقی النظام اشتاتاً (مفردات ۲۵۶)“

قرآن حکیم میں ہے یَوْمَیْذٍ یُّضَلُّوْا النَّاسُ اَشْتَاتًا (۶۰۹) اور مِنْ نُّبَاتٍ شَعْبَةٍ (۵۳:۲۰) اور وَفَلَوْ بِهُمْ شَعْبَةٌ (۱۳:۵۹) ای مختلفہ انتشار ”نشر“ سے ہے۔ اس کے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی تفرق کے۔ سورۃ جمعہ میں ہے فَاِذَا فُجِّیَتْ الصَّلٰوَةُ فَانْتَشِرُوْا (۱۰:۶۲) یعنی تفرقوا اشتات و انتشار سے مقصود وہ حالت ہے جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جائے، شفق اور پر اگندہ ہونے، اور باہر گر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جائے۔ مواد میں، قوی میں، اعمال میں، افراد میں، ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہو جائے۔ یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے تو ”نکوین“ کی جگہ ”فساد“ اور ”وجود“ کی جگہ ”عدم و فنا“ کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام پہلے ”بیماری“ اور پھر ”موت“ ہے۔ اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اسی کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح ”عمل سوہ“ اور عصیان سے تعبیر کرتا ہے اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہو جاتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور پلا خر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا ”اجتماع و ائتلاف“ کو قوی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اس لیے انسان کے لیے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے اور اس کو ”اعتصام بحبل اللہ“ اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اولین مادہ نکوین امت یعنی المل عرب کو مخاطب کر کے اور پھر تمام عرب و عجم سے فرمایا۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۗ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ عَلَیْكُمْ  
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَالْتَفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاصْبِرْکُمْ بِنِعْمَةِ اِخْوَانِکُمْ (۱۰۳:۳)

سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ سب کے ہاتھ اسی ایک جبل اللہ سے وابستہ ہوں۔ اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے سرفراز کیے گئے۔ تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا۔ پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اشتات و انتشار کی زندگی کو بقاء و قیام نہیں ہو سکتا۔ وہ ہلاکت کی ایک آگ ہے جس کے دہکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قوی زندگی نشوونما نہیں پاسکتی۔

وَ كُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا ۖ كَذَٰلِكَ يَهْتِنُ اللَّهُ لَكُمْ إِلَٰهَهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ. (۳: ۱۰۳)

اور تمہارا حال یہ تھا کہ آگ کے دہکتے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے پر اللہ نے تمہیں بچالیا۔ اللہ اپنے فضل و رحمت کی نشانیاں اسی طرح کھول کھول کر دکھاتا ہے، تاکہ کامیابی کی راہ پالو!

یہ بھی جا بجا بتلادیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع و اختلاف کی صالح و حقیقی زندگی پیدا کر دینا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں۔ دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اس کی وحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دے۔

لَوْ أَنْفَقْتُ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا آَلَفْتُ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ آَلَفَ بَيْنَهُمْ ۗ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. (۸: ۶۳)

اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان بکھرے ہوئے دلوں کو محبت و اتحاد کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے۔ جس نے متفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا۔

اور اسی لیے قرآن حکیم ظہور شریعت و نزول وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اجتماع و اختلاف پیدا ہوا، اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت و وحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اور اسی لیے یہ نتیجہ شریعت سے فی و عدوان اور اس کو بالکل ترک کر دینے کا ہے۔

فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ (۱۰: ۹۳)  
وَالَّذِينَ هُمْ يَنْتَبِئُونَ مِنَ الْأُمُورِ ۗ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِمَّا بَعْدَ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ  
بِقِيَامِ بَيْنَهُمْ (۱۷: ۳۵)

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَقَرَّبُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ (۳. ۱۰۵)

اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام ”جماعت“ رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو ”جہلیہ“ اور ”حیات جاہلی“ سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ آگے بالتفصیل آئے گا۔ ”من فارق الجماعة لعات، مہتة الجاهلیہ“۔

اور اسی بنا پر بکثرت وہ احادیث و آثار موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا۔ اگرچہ امیر غیر مستحق ہونا اہل ہو، فاسق ہو، ظالم ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے یعنی و ما اقاموا الصلوٰۃ اور ساتھ ہی بتلادیا گیا کہ جس شخص نے جماعت سے علیحدگی کی راہ اختیار کی تو اس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالے کر دیا۔ یعنی گمراہی اور ٹھوکر اس کے لیے ضروری ہے۔ زنجیر کا توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہو گئی ہو تو ایک چھوٹے سے حلقہ کا حکم رکھتی ہے جس کو انگوٹھے سے مسل دیا جاسکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے علیکم بالجماعة فان الشيطان مع الفذہ وهو من الاثمن ابعث

دوسری روایت میں ہے ”لان الشيطان مع الواحد“ یعنی جماعت سے الگ نہ ہو۔ ہمیشہ جماعت بن کر رہو۔ کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا اور انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور رہے گا۔ یعنی اتحادی و جماعتی قوت ان میں پیدا ہو گئی۔ اب وہ راہ حق سے نہیں بھٹک سکتے۔ یہ الفاظ مشہور خطبہ چاہیہ کے ہیں جو عبد اللہ بن دینار، حامر بن سعد اور سلیمان بن یسار وغیرہم سے مروی ہے اور یہی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح حدیث متواتر بالمعنی ”علیکم بالسواد الاعظم

اور لانه من شد شد فی النار

اور ید الله علی الجماعة

اور لا یجمع الله امتی علی الضلالتہ او کما قال

اور خطبہ حضرت امیر کہ وایاکم والفرقة فان الشاذ من الناس للشيطان کما ان الشاذ من الغنم لذئب. الامن دعا الی هذا الشعار فاقطوه ولو کان تحت عمامتی هذا وغير ذلك۔

اس بارے میں معلوم و مشہور ہیں۔ آخری قول دیگر روایات میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ہمیشہ جماعت کے ساتھ ہو کر رہو۔ جو جماعت سے الگ ہو اس کا ٹھکانا

دورخ ہے۔ افراد تباہ ہو سکتے ہیں مگر ایک صالح جماعت کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اللہ کبھی ایسا ہونے نہ دے گا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہو جائے۔

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نا اہل ہو لیکن سعی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا حتیٰ کہ ”صلوا خلف کل ہو و فاجو، تو اس میں بھی یہی حقیقت مضمّن ہے کہ زندگی درحقیقت جماعتی زندگی ہے۔ انفرادی وقت ہر حال میں بربادی و ہلاکت ہے۔ پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیے۔

اور یہی سبب ہے کہ سورۃ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھائی گئی اس میں تکلم واحد نہیں ہے بلکہ جمع ”حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی،،۔ ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ (۵:۱) فرمایا۔ ”اھدنی“ نہیں کہا گیا یہ اسی لیے ہے کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے۔ ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو۔ اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان و خلاصہ قرآن و عصارۃ اسلام ہے جمع تکلم کا مینہ آیا نہ کہ واحد کا اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت جو امتیازی دعا سکھائی گئی وہ بھی بیحد جمع آئی اگرچہ مخاطب واحد ہو۔ یعنی ”السلام علیکم“ ”السلام علیکم“ نہیں قرار دیا گیا۔ اسی طرح نماز سے باہر آنے کے لیے بھی ”السلام علیکم“ بیحد جمع رکھا گیا واحد کا مینہ استعمال نہیں کیا گیا۔ علت اس کی بھی یہی ہے نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی۔

اور اسی بنا پر احکام و اعمال شریعت کے ہر گوشے اور ہر شاخ میں یہی اجتماعی و امتلائی حقیقت بطور اصل و اساس کے نظر آتی ہے۔ نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے۔ حج بجز اجتماع اور کچھ نہیں۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال و اموال و خیرت میں جماعت کا ایک حصہ قرار دے دینا ہے۔ علاوہ بریں اس کی ادائیگی کا نظام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا بلکہ جماعتی حیثیت سے۔ یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بد قسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے بلکہ مصارف زکوٰۃ متعین کر کے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفہ وقت کے سپرد کر دے۔ پس اس کے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی۔ یہ امام کا کام ہے کہ اس کا مصرف تجویز کرے اور مصارف منصوبہ میں سے جو مصرف زیادہ ضروری ہو، اس کو ترجیح دے۔ ہندوستان میں اگر امام کا وجود نہ تھا، تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام عذر کی بنا پر کیا گیا، زکوٰۃ کا بھی کرنا تھا۔

اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں

مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ ”مثل المؤمنین فی توادعہم وتعاطفہم کمثل الجسد الواحد۔ اذا اشعکى منه عضو، تدعى له سائر الجسد بالسهر والحمى“ (صحیحین) اور ”المسلم للمسلم کالبنیان یشد بعضہ بعضاً“ (بخاری) یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضاء۔ ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو اور ان کی مثال دیوار کی سی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے پھر تھیک اصابع کر کے اس کی تصویر تلاء دی۔ یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلادیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل ہے۔ تو ان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے تو اجتماعی وجود ہے یعنی دیوار کا ایک جزء ہے اور انہی اجزا کے ملنے سے دیوار متشکل ہوتی ہے۔

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسویۃ صفوف پر سخت زور دیا گیا۔ یعنی صف بندی پر اور سب کے سروں، سینوں، پاؤں کے ایک سیدھ میں ہونے پر ”التسون صفوفکم اولیٰ مخالفن اللہ بین وجوہکم (بخاری)

اور روایت انس کہ ”سووا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامة الصلوۃ“

(بخاری) کو فی لفظ ”من تمام الصلوۃ“.

تو اس میں بھی یہی بھید ہے۔ تشریح کا یہ موقع نہیں۔ قرآن و سنت کی تصریحات و حکامات اس بارے میں اس قدر کثرت سے اور محتاج تفسیر و کشف ہیں کہ ایک ضخیم جلد مطلوب ہے۔ ”تفسیر البیان“ مفصل میں لکھ چکا ہوں۔



## جمع و تفرقہ قومی و مناصب

اس قانون الہی کے مطابق مسلمانوں کی زندگی و عروج کا اصلی دور وہی تھا جب ان کی قومی و انفرادی، مادی و معنوی، اعتقادی و عملی زندگی پر اجتماع و اختلاف کی رحمت طاری تھی اور ان کے تنزل و ادھار کی اصلی بنیاد اس دن پڑی، جب اجتماع و اختلاف کی جگہ اشتات و انتشار کی نحوست چھانی شروع ہوئی۔ ابتدا میں ہر مادہ مجتمع تھا۔ ہر طاقت کھلی ہوئی تھی، ہر چیز بندھی ہوئی تھی، لیکن بتدریج تفرقہ و انتشار کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا۔ ہر جماد پھیلا۔ ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر اور تتر بتر ہو گئی۔ قرآن حکیم کے بتلائے ہوئے قانون تنزل اقوام کے مطابق یہ حالت ہر چیز اور ہر گوشت و وجود عمل پر طاری ہوئی اور ایک ہزار برس پر تین صدیاں گزر چکی ہیں کہ برابر طاری ہو رہی اور بدھتی جاتی ہے۔ لوگ اسباب تنزل اللہ پر بحث کرتے اور پھر طرح طرح کی عفتیں ٹھہراتے اور طرح طرح کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ قرآن و سنت اور عقلیات صادقہ کے نزدیک تنزل کے تمام فسادات، نتائج صرف اسی ایک چیز کا نتیجہ ہیں۔ اس ایک حقیقت کو کتنے ہی مختلف ناموں سے پکار لو مگر اصلی علت اس کے سوا کوئی نہیں۔

قوتوں کے انتشار کا دور ساری چیزوں پر طاری ہوا لیکن یہاں صرف ایک ہی پہلو واضح کرنا مقصود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی۔ آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو صرف ایک داعی شریعت یا حامل وحی ہی کی جگہ خالی نہیں ہوئی بلکہ ان ساری قوتوں، سارے منصبوں، ساری حیثیتوں اور ہر طرح کے نظری و عملی اختیارات و قوی کی جو آپ کی شخصیت مقدسہ میں اکٹھی تھیں اور جن کا آپ کے تہجد وجود مقدس میں جمع ہونا اسلام کی شرعی و دینی خصوصیات میں سے تھا۔ اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی داعی کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالم ستان شہنشاہ۔ اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت و جہان بینی سے الگ نہیں رکھا۔ وہ تو یہ سکھلانے آیا تھا کہ دین و دنیا دونوں ایک ہی چیز ہے اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں ہے بلکہ سچی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جس کو شریعت نے خود پیدا کیا ہو۔ پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں ان تمام حیثیتوں اور منصبوں کا جامع تھا جو ہمیشہ دنیا کی صد ہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہیں۔ وہ اللہ کا پیغمبر تھا

شریعت کا مقصد تھا، امت کا بانی تھا، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا۔ وہ اگر چوں اور چھال سے ہٹی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الہی کا ترجمان اور انسانی سعادت و ہدایت کا داعی تھا تو اسی کے مہمن میں بہن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالار لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظام معاشرت و رست کرتا اور نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا اور ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا ہے۔ غرضیکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے اور اسلام کا نظام دینی بھی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔

جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ اسی اجتماع قوی و مناسب پر قائم ہوئی اور اسی لیے اس کو ”منہاج نبوت“ سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی یہ نیابت ٹھیک ٹھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے فہم جامع نبوت کی جہی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔

منصب نبوت مختلف اجزاء و نظر عمل سے مرکب ہے۔ ازاں جملہ ایک جزو وحی و تنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریح و تفسیر قوانین کا اختیار رکھنا ہے۔ یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع و قیام کی معصومانہ و غیر مسئولانہ قوت۔ اس جزو کے اعتبار سے نبوت آپ کے وجود پر ختم ہو چکی تھی اور قیامت تک کے لیے شریعت و قانون کے وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا۔ جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیے۔ اس کی جگہ کسی دوسری چیز کا آنا نقص کا ظہور ہوگا نہ کہ تکمیل کا۔ اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا (۳-۵)

لیکن منصب نبوت اس اصلی جزو کے ساتھ بہت سے جمعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا اور ضروری تھا کہ ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ اس چیز کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے۔ حضرت عطر کے لیے ”صحبت“ (بافتح) کا مقام بتلایا گیا۔ علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا۔ مہشرات صادقہ کو نبوت کا چالیسواں جزو قرار دیا۔ لم یبق الا المہشرات حدیث تجدید بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔ پس خلفاء راشدین کو جو نیابت پہنچی، اس میں وحی و تشریح کی قائم مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی لیکن اور تمام اجزاء و خصائص نبوت کی نیابت داخل تھی۔ داعی اسلام کا وجود نبوت کے ساتھ خلافت ارضی، حکومت و سلطنت، نظام و قوام سیاست قیادت فوج و حرب، فتح و عمران ممالک، ریاست مجالس شوریٰ وغیرہ، جہانبانی و حکمرانی کے تمام منصب تہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا تھا۔ اس لیے ٹھیک ٹھیک اسی طرح خلافت خاصہ میں بھی خلفاء راشدین کا تہا وجود ان ساری نظری و عملی قوتوں اور تمام منصوبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب امامت و خلافت بھی تھے، صاحب اجتہاد و قضا بھی تھے، اور صاحب سیاست و ظم احکام و بلاد بھی۔ اصلاً ”امامت کبریٰ“ کا مقام اجتہاد دینی اور

سیاست ملکی دونوں سے مرکب ہے۔ اس لیے ان کی امامت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے دارالشوری میں مسائل شرعیہ کا بہ حیثیت ایک مجتہد کے فیصلہ کرتے تھے۔ عدالت میں مقدمات سلجھتے تھے اور دیوان فوجی میں فوجوں کو تنخواہ بھی بانٹتے تھے اگر وہ نماز جنازہ کی معین تکبیرات پر صحابہ کا اجماع کراتے تھے تو راتوں کو شہر میں گشت لگا کر احتساب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ میدان جنگ میں احکام بھی وہی بھیجتے، اور روم کے سفیر کو بہ حیثیت شہنشاہ اسلام اپنے سامنے بھی وہی بلائے۔

اسی طرح نبوت کا مقام، تعلیم و تربیت امت کی مختلف قوتوں سے مرکب تھا۔ قرآن حکیم نے ان کو تین اصولی قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ يَنْزُلُوا عَلَيْهِمُ الْيُسُفُ وَيُؤْتِكُهُمُ الْمَالُ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۲-۶۲) تلاوت آیات، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب و حکمت، خلفاء راشدین ان تینوں منصبوں میں وجود نبوت کے نائب تھے۔ وہ منصب اجتہاد و قضاء شرع کے ساتھ قوت ارشاد و تزکیہ و تربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحب وحی کی طرح خدا کے کلام کی منادی کرتے، ایک نبی کی طرح دلوں اور دلوں کو پاکی بخشتے اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب اور حکمت و سنت سے امت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے وہ ایک ہی وجود میں ابوحنیفہ و شافعی بھی تھے اور حنیفہ اور شافعی بھی لخصی و حماد بھی تھے اور ابن معین و ابن راہویہ بھی۔ جسوں کا نظام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا اور دلوں کی حکمرانی بھی انہی کے قبضہ میں تھی۔ یہی حقیقی اور کامل معنی منصب نبوت کی نیابت کے ہیں اور اسی لیے ان کا وجود اور ان کے اعمال بھی اعمال نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ علیکم بسنتی و سنتی الخلفاء الراشدين اور اسی لیے وعضوا علیہا بالنواجل کے حکم میں نہ صرف سنت عہد نبوت بلکہ خلافت راشدہ خاصہ کی سنت بھی داخل ہوئی اور شرح اس مرالہی کی بہت طولانی ہے یہاں محض اشارات مطلوب۔

لیکن جیسا کہ پہلے سے خبر دے دی گئی تھی، اجتماع و اختلاف کی یہ حالت حضرت علیؓ علیہ السلام پر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سے اشتات و انتشار کا دور شروع ہوا۔ ازاں جملہ مرکزی قوتوں اور منصبوں کا انتشار و اشتات تھا۔ جس نے فی الحقیقت امت کا تمام نظام شرعی و اصلی و رہم و برہم کر دیا۔ خلافت خاصہ کے بعد یہ ساری یکجا قوتیں الگ الگ ہو گئیں۔ ایک وجود کی جگہ مختلف وجودوں میں ان کا ظہور اور نشوونما ہوا۔ حکومت و فرمانروائی کا ٹکڑا الگ ہو کر مجرد پادشاہی کی شکل میں آ گیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا۔ الخلافت بعدی ثلاثون سنة ثم ملک۔ سو واقعی اس کے بعد صرف پادشاہی رہ گئی۔ اجتہاد اور قضاء شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین و فقہاء کی ایک الگ جماعت پیدا ہوگئی۔ انہوں نے یہ کام سنبھالا۔ اسی طرح تعلیم و تربیت روحانی کے کاروبار سے نظام حکومت بالکل الگ ہو گیا۔ پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی اب



خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کے لیے اور فقہا کا مجرد استنباط احکام و مسائل کے لیے رہ گیا۔ تو تزکیہ نفوس اور ارشاد و قلوب کے لیے ایک دوسری بیعت مستظلاً قائم ہوئی، جو بیعت توبہ و ارشاد ہوئی اور اس طرح اصحاب طریقت و تصوف کی بنیاد پڑی۔ پہلے صرف ایک وجود تھا وہ پادشاہ، مجتہد، مرشد، قاضی القضاة، سپہ سالار جنگ، میر عدل و احتساب سب کچھ تھا۔ اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہو گئیں۔ حکومت و فرمانروائی الگ ایک وجود میں آئی۔ اجتہاد و تفسیر کے لیے دوسرا وجود مرکز بنا۔ قضا کے لیے تیسرا، ارشاد و تزکیہ قلوب کے لیے چوتھا و حلم جرا۔ غرضیکہ عہد اجتماع قوی و مناصب کے بعد دور انتشار قوی و مناصب شروع ہو کر رفتہ رفتہ کمال ظہور و بلوغ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ و مخالف ہو گئیں کہ یا تو ایک ہی وجود میں جمع تھیں یا اب مختلف وجودوں میں بٹ کر بھی متعلق نہ رہ سکیں۔ صرف اختلاف تعدد و تنوع ہی نہیں رہا بلکہ اختلاف تضاد کی شکل پیدا ہو گئی۔ یہی سب سے بڑی مصیبت و ہلاکت تھی جو تمت پر طاری ہوئی۔ مسلمانوں کے تنزل و ادبار کی اصلی علت یہ ہے۔ وہ افسانے نہیں ہیں جن میں تم سر مست ہو افسوس کہ سطحی جزئی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب و علل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی اور نہ بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد ہو سکے کہ خالص اسلامی فکر و نظر سے اسباب ترقی و تنزل پر تدبیر کرتے!

غرضیکہ خلافت راشدہ کے بعد جو سلسلہ خلافت قائم ہوا، وہ خواہ قرشی رہا ہو، یا غیر قرشی، مجرد ملوکی و پادشاہی کا سلسلہ تھا اور بجز چند مستثنیٰ اوقات کے (جیسا کہ عہد حضرت عمر بن عبدالعزیز)۔ یہ دور نیابت نبوت کے اور تمام اجزاء سے یک قلم خالی رہا۔ منصب بٹ چکے تھے۔ قوتیں منتشر ہو چکی تھیں۔ البتہ جو انقلاب سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں ہوا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلاطین عثمانیہ کی خلافت طریق استبدادی و شخصی سے طریق شوری میں تبدیل ہو گئی، سو بلاشبہ خلافت راشدہ کی طرف عود و رجعت کا یہ ایک مبارک قدم تھا جس کے لیے شوری اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے لیکن ان جزئی مستثنیات کے علاوہ عام حالات و خصائص ہر دور اور ہر سلسلے کے وہی رہے جو ایک جامع لفظ ”ملک عضو“ میں بتلا دیے گئے تھے اور اس میں کبھی کوئی نمایاں اور پائیدار تبدیلی نہ ہوئی۔



## اطاعت خلیفہ والتزام جماعت

اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اسلام کا وہ نظام شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفہ وقت کی معرفت اور اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف حکم نہ دے۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائنات ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جزء اور تووا ہستی کی زنجیر قدرت کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و وسعت ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جس کو ”قانون مرکز“ یا ”قانون دوائر“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یعنی قدرت نے خلقت و نظام خلقت کے بقا و قیام کے لیے ہر جگہ اور ہر شاخ و وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بہ منزلہ مرکز کے ہوتا ہے اور بقیہ اجسام ایک دائرے کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں اور پورے دائرے کی زندگی اور بقا صرف اس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کے لیے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں یا مرکزی اطاعت و انقیاد سے باہر ہو جائیں تو معنا نظام ہستی درہم برہم ہو جائے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم و باقی نہ رہ سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو بعض اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا ”الحقیقہ کالکمرہ“ اور صاحب فتوحات نے کہا۔ ”دائرہ قاب تو سین ہے۔

یہ قانون مرکزیت و دوائر نظام ہستی کے ہر جزو اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ نظام شمس جو ہمارے اوپر ہے، ستاروں کی یہ گنجان آبادی، کروں کا یہ صحرائے بے کنار، زندگی اور حرکت کا یہ محیر العقول طلسم کیا ہے، کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے؟ اسی قانون مرکزیت پر متحرک سیاروں کے ملتے اور دائرے ہیں۔ ہر دائرہ کا نقطہ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے۔ تمام ستارے اپنے اپنے کعبہ مرکز کا طواف کر رہے ہیں اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمس کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے۔ ذلک تقدیر العزیز العظیم (۳۸:۳۶) خود ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے۔ ہر ستارے کے طواف و دوران کے لیے حکمت الہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دے دیا ہے وہ اس سے باہر نہیں جاسکتا۔ سب یہ حکم و لکہ اسلم من لی السموات والأرض (۸۳:۳) اور انکم قرائن اللہ یسجدلہ من لی السموات ومن لی الأرض والشمس والقمر والنجوم (۱۸:۲۲)

خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق سب اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ لِي فَلَكَ يُسَبِّحُونَ (۳۶:۴۰)

قانون مرکزیت کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا۔ اب اس کے بعد جس قدر نیچے اترتے آئیں گے اور حرکت و حیات کی بلندیوں سے لے کر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے، ہر جگہ زندگی اور بھلاسی قانون سے وابستہ نظر آئے گی۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو، اس کی ایک جمیع وحدت کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے؟ ڈالیاں ہیں، شاخیں ہیں، پتے ہیں، پھول ہیں لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے۔ جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی موت و فنا اس پر طاری ہوگئی۔ آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ اور خود اپنے وجود کو دیکھو جس کے دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضاء سے مرکب ہے؟ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بہتی ہے جو تم میں آباد ہے۔ ہر جسم کا فصل ہے اور ایک خاصہ لیکن دیکھو! یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سر بسجود ہے؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے۔ اس سے الگ رہ کر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اذا صلحت، صلحت الجسد کله، واذا فسدت، فسدت الجسد کله۔ الا، وهی القلب“

اسلام فی الحقیقت سنت اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے اگر نوع انسانی کی سعادت و ارتقاء کے لیے قانون اسلام اسی فاطر السموات والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لیے قانون حیات بنایا تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو بلکہ پہلا قانون پچھلے قانون عام کا ایک ایسا قدرتی جز و نظر آئے جیسے زنجیر کی ایک کڑی۔ پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک ٹھیک اسی قانون مرکزیت پر قائم ہوا۔ قرآن نے یہ حقیقت جا بجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیا کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے، اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت و افراد کی جسمانی و معنوی بھلا بھی قانون مرکزیت پر موقوف ہے۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیاء کرام کا وجود ہے۔ پس ان کی اطاعت و انقیاد بقاء و حیات کے لیے ناگزیر ٹھہری: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رُسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (۴:۶۳)

دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اور اسی لیے فرمایا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجْعَلُوا لِي فِيهِمْ حَرَاجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴:۶۵)

اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲۱:۳۳)

پھر قوم و ملت کے بقاء کے لیے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیئے۔ اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو ٹھہرایا جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ (۳۸:۴)

عبادات میں نماز کو مرکز عمل ٹھہرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرہ اعمال منہدم ہو جاتا ہے "لَمَنْ اَقَامَهَا اِقَامَ الدِّينَ وَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّينَ" اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ "كان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يرون شيئاً من الاعمال تركه ككفر غير الصلوة (ترمذی)

یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کو۔ اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادی حجاز کا کعبہ اللہ قرار پایا۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَمًا لِّلنَّاسِ (۹۷:۵) قِيَمًا لِّلنَّاسِ پر غور کرو اور چونکہ یہ مرکز ٹھہرا اس لیے تمام دائرہ کارخ بھی اسی طرف ہوا۔ خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں لیکن ان کا منہ اسی طرف ہونا چاہیے۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوْهُكُمْ حَضْرَةَ (۱۵۰:۲)

پھر جس طرح شخصی و اعتقادی اور عملی زندگی کے لیے مراکز قرار پائے ضروری تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے لیے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا۔ لہذا وہ مرکز بھی قرار دے دیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے ٹھہرایا۔ اس کی معیت، اس کی رفاقت، اس کی اطاعت، اس کی حرکت پر حرکت، اس کے سکون پر سکون۔ اس کی طلب پر لبیک، اس کی دعوت پر اتفاق جان و مال، ہر مسلمان کے لیے فرض کرو یا گیا ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاہلیت کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آسکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام "خليفة" اور امام ہے اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے یعنی کتاب و سنت کے مطابق اس کا حکم ہے، ہر مسلمان پر اس کی اطاعت و اعانت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اس کے رسول کی:

يٰۤاَيُّهَا الدِّينَ اٰمَنُوْا اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولٰٓئِكَ اَمْرٌ مِّنْكُمْ ۚ  
فَاِنْ تَنٰزَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُوْمِنُوْنَ  
بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۵۹:۳)

(مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی اس کے رسول کی اور تم میں جو اولی الامر ہو اس کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تم مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی

طرف لوٹو اور اس کے فیصلہ پر متفق ہو جاؤ۔)

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے اللہ کی، رسول کی، مسلمانوں میں جو اولی الامر ہو، اس کی۔ اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت سے مقصود سنتِ قوی و فعلی ہے۔ باقی رہی اطاعت اولی الامر، تو نہایت قوی و روشن وجہ موجود ہیں کہ ”اولی الامر“ سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا، نظام امت قائم رکھنے والا اور تمام اچھا و ہی امور میں صاحبِ حکم و سلطان ہے۔

اولاً، یہ حکم القرآن بفسر بعضہ بعضاً اولو الامر کی تفسیر خود قرآن ہی کے اندر تلاش کرنی چاہیے۔ اسی سورت میں آگے چل کر یہ لفظ دوبارہ آیا ہے۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمِينِ أَوْ الْخَوْفِ إِذَا عَاوَا بِهِ ط وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَ الَّذِينَ يُسْتَبْطَنُونَ مِنْهُمْ ط (۳، ۸۳)

اور جب کوئی امن یا خوف کی خبر ان تک پہنچتی ہے تو بلاسوچے سمجھے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اللہ کے رسول کی طرف اور ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے جو ان میں اولی الامر ہیں، تو فوراً اصلیت کھل جاتی اور وہ اس خبر کے سچے جھوٹے ہونے کا پتہ لگا لیتے۔

اس آیت میں ایسے وقتوں کا ذکر کیا گیا ہے جب امن و خوف یعنی صلح و جنگ اور فتح و شکست کی افواہیں ملک میں پھیلتی ہیں اور بے اصل خبروں کی اشاعت سے لوگوں میں اضطراب و غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتیں منافقین اور بعض ضعیف القلب مسلمانوں کی وجہ سے عہد نبوی میں بھی پیش آ جاتی تھیں۔ پس فرمایا کہ جب کوئی افواہ سنو تو پہلے اللہ کے رسول اور اپنے ”اولی الامر“ تک پہنچاؤ تا کہ وہ اس کی صحت و عدم صحت کی تحقیق کر لیں اور خبر کی نوعیت اور راویوں کی حالت پر غور کر کے صحیح نتائج استنباط کریں۔ ایسا نہ کرو کہ جہاں کوئی افواہ سنی، فوراً اس پر یقین کر لیا اور لوگوں میں پھیلا کر شروع کر دیا۔

اب غور کرنا چاہیے کہ اس آیت میں ”اولی الامر“ سے مقصود کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ذکر امن و خوف کے حالات کا ہے یعنی صلح و جنگ اور فتح و شکست کا ان حالات کا تعلق صرف حکام و امراء ملک ہی سے ہو سکتا ہے۔ علماء و فقہاء سے نہیں ہو سکتا۔ معاملہ ظلم ملک و قیام امن کا ہے۔ استنباط مسائل اور حلال و حرام کا نہیں ہے پس لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اولی الامر سے مقصود وہی لوگ ہیں جن کے سپرد ملک کا انتظام اور جنگ و امن کا نظم و نسق ہوتا ہے اور جو ان خبروں کی تحقیق کر سکتے ہیں۔ جن کا اثر ملک کے امن و خوف پر پڑ سکتا ہے یعنی ارباب حکومت و امارت۔

ثانیاً، کتاب و سنت اور صدر اول کے آثار عربیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ

”امر“ جب ایسی ترکیب کے ساتھ بولا جائے جیسی کہ یہاں ہے تو اس کا اطلاق عموماً حکومت و سلطنت ہی کے معنوں پر ہوتا ہے۔ احادیث میں یہ استعمال اس کثرت سے موجود ہے کہ ایک صاحب نظر کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ نیز لغت کی بنا پر بھی ظاہر ہے کہ ”امر“ کے معنی حکم کے ہیں اور اولی الامر کے معنی امام بخاری نے ذوی الامر کے کیے ہیں۔ یعنی ”حکم والا“ اور معلوم ہے کہ صاحب حکم وہی ہو سکتا ہے جو صاحب حکومت ہو۔

حال احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس واقعہ کی نسبت اتری، وہ امیر جماعت کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ بخاری و مسلم میں ہے۔

عن ابن عباس نزلت فی عبد اللہ بن حذافہ بن قیس ابن عدی اذ بعثہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سریة“

اور امام طبری نے تفسیر میں ایک روایت درج کی ہے کہ عمار بن یاسر اور خالد بن ولید کے باہمی نزاع کے بارے میں اتری۔ خالد امیر تھے اور عمار نے بلا ان کے حکم کے ایک شخص کو مزدوری پر رکھ لیا تھا۔ ”نزلت فی قصۃ جوت لعمار مع خالد او کان خالد امیراً فاجاز عمار رجلاً بغير امره ففصاحما۔ دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ امیر کی اطاعت و عدم اطاعت کا تھا نہ کہ احکام و مسائل کے حکم و انشاء کا۔

راجعاً اکثر اقوال مرویہ صحابہ و تابعین سے بھی یہی تفسیر ثابت ہوتی ہے بلکہ صدر اول میں صرف یہی تفسیر مشہور و معلوم تھی۔ بہت سی موٹکائیاں جو پیدا کی گئی ہیں، سب بعد کے مفسرین کی طبع زاد ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ابن عیینہ کا قول نقل کیا ہے۔ سالت زید بن اسلم عنها ولم یکن بالمدينة احد یفسر القرآن بعد محمد بن کعب مثله۔ فقال اقرأ ما قبلها تعرف فقرات۔ ان اللہ یامر ان توذوا الامانات الی اهلها و اذا حکمتکم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ فقال هذه فی الولاية“ (فتح ۱۳: ۹۹)

یعنی مدینہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلم سے بڑھ کر قرآن کا کوئی مفسر نہ تھا۔ میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ اس آیت سے ما قبل آیت پڑھو۔ میں نے پڑھا۔ ”ان اللہ یتأمروکم ان توذوا الامانت الی اهلها و اذا حکمتکم بین الناس ان تحکموا بالعدل“ (۵۸: ۳)

پس کہا کہ مقصود اس سے حکام ہیں یعنی چونکہ پہلے سے ذکر حکومت و قضا کا ہو رہا ہے پس اولی الامر سے مقصود وہی ارباب اقتدار ہیں جو حکومت رکھتے ہوں۔ طبری نے بسند صحیح حضرت ابو ہریرہ

اور میمون بن مہران وغیرہ سے نقل کیا ہے ”ہم الامراء“ اور علامہ ابن حزم نے جب ان تمام صحابہ اور تابعین کو شمار کیا ہے جن سے یہ تفسیر منقول ہے تو وہ ۱۳ سے زیادہ ثابت ہوئے۔ باقی رہا بعض صحابہ اور تابعین کا کہنا کہ مقصود اہل علم و نظر ہیں مثلاً جابر بن عبد اللہ کا قول کہ ”ہم اهل العلم والخبر“ اور عباد و عطاء و ابوالعالیہ کا قول ہے کہ ہم العلماء جو ان اقوال میں اور صحابہ کی مشہور تفسیر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دراصل اسلام کا نظام حکومت و جماعت تو یہی تھا کہ حکومت و ولایت کا منصب تمام شرعی و علمی قوتوں سے مرکب ہو اور اس وقت تک قوتوں کے انتشار اور مناصب کے تفرقہ کی بنیادیں نہیں پڑی تھیں۔ جو شخص والی ملک اور حاکم مسلمین ہوتا تھا وہ بدرجہ اولیٰ عالم و فقیہ بھی ہوتا تھا۔ پس جن صحابہ و تابعین نے ”اولی الامر“ کی تفسیر میں علم و خیر کا ذکر کیا، انہوں نے واقعی بہت صحیح تفسیر کی۔ گویا ظاہر کر دیا کہ مسلمانوں کا اولی الامر ایسے ہی افراد کو ہونا چاہیے جو اہل علم و خیر ہوں۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اولی الامر سے مقصود علماء و فقہاء کا وہ مخصوص و متعارف گروہ ہے جو اسلام کے نظام جماعت کے القراض کے

بعد پیدا ہوا اور جس کا صدر اول کے مفسرین کو وہم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا؟

امام ابن جریر نے عکرمہ کا ایک قول نقل کیا ہے ”ابو بکر و عمر“۔ اس سے بھی ان کا مقصود یہی ہے کہ اولی الامر مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جیسے ابو بکر و عمر۔ رضی اللہ عنہما۔

اصل یہ ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے حجاز میں ایک طرح کی باقاعدہ طوائف السلو کی قائم تھی اور مکہ میں قریش کا قبیلہ بالکل خود مختار اور غیر مسئول تھا۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو اس نے ”جماعت“ اور ”امارت“ کے نظام پر زور دیا اور بڑے بڑے گردن کشوں کو بھی مجبور کر دیا کہ اطاعت امیر و التزام جماعت سے باہر نہ ہوں۔ قریش کی نسل فطرت اس اطاعت کیشی کے خلاف تھی، اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کو اس بات کا خوگر بنانا تھا۔ حافظ عسقلانی نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے۔ ”ورجع الشافعی الاول واحتج بان قریشا كانوا لا يعرفون الامارة ولا ينقادون الى امير، فانروا بالطاعة لمن اولی الامر، ولذا لک قال صلی اللہ علیہ وسلم من اطاع امیری فقد اطاعنی“

(فتح، ۸، ۱۹۱)

خلاصاً۔ تاریخ اسلام کے سب سے بڑے فقیہ یعنی امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے۔ کتاب

الاحکام میں باب باندھا۔ اطیعوا اللہ والرسول واولی الامر منکم

اور اس میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت درج کی ہے۔

”من اطاع امیری فقد اطاعنی“

جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی۔ جس نے اس سے انکار کیا

اس نے خود مجھ سے انکار کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک اہل الامر کی اطاعت سے مقصود امیر و امام ہی کی اطاعت ہے۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں۔ ”لھی هذا اشارة من المصنف الی توجیح القول الصائر الی ان الایة نزلت فی طاعة الامراء، خلافاً لمن قال نزلت فی العلماء۔“

(فتح ۹۹.۱۳)

سادماً۔ سب سے زیادہ قدیم اور مکمل تفسیر جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ امام ابن جریر طبری کی تفسیر ہے اور صحابہ و تابعین کی تفاسیر پر ان کا احاطہ و نظر معلوم، انہوں نے بھی تمام اقوال نقل کر کے ترجیح اسی تفسیر کو دی ہے۔

سابعاً۔ اس نکتہ پر نظر ذہنی چاہیے کہ تفسیر قرآن کے معاملہ میں جس قدر اختلافات کی کثرت اور مذاہب و طرق کا تعدد و تنوع نظر آتا ہے، وہ تمام متاخرین کی فلسفیانہ کاوش پسندی کا نتیجہ ہے۔ جب کہ معقولات کے شیوع اور یونانیت کے غلبہ و احاطہ سے علوم دینیہ میں اس تعقق کی بنیادیں پوری طرح پڑ چکی تھیں۔ اس کی نسبت کہا گیا تھا کہ ”ہلک المتمعنون“۔ فکر و نظر میں جمحیت کے ظہور، عربیت خالصہ و صالحہ کے بُد اور علوم سنیہ کے ترک و ہجر نے اس معاملے کو اور زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا۔ لیکن اوائل و سلف میں یہ تمام اختلافات یک قلم ناپید تھے۔ ہر آیت اور ہر لفظ کے ایک ہی صاف اور سادہ معنی تھے جو عربی لغت و محاورہ میں ہو سکتے ہیں اور لوگ اس پر قانع تھے۔ ابداع معانی کی کثیرہ اور تفصیص اشارات و مفہومات بعیدہ کی کاوش ہی نہیں کی جاتی تھی نہ فرضی تخمینی شکوک و ایرادات گھڑ کرنے سے معانی فرض کیے جاتے تھے۔ ”اولی الامر“ کا لفظ جب کبھی ایک ایسے عرب کے سامنے کہا جائے گا جس کی عربیت خالص و صحیح ہو تو صرف ایک ہی معنی اس کے ذہن میں آئیں گے۔ یعنی صاحب حکومت کسی دوسرے مفہوم کا اسے وہم بھی نہیں گزرے گا۔ صحابہ و تابعین اس پر قانع تھے لیکن امام رازی کی دقیقہ سنجی اس سہل پسندی اور لغوی سادگی پر قانع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ امکانی مطالب کا وسیع سے وسیع میدان ڈھونڈتے ہیں اور ہر ممکن مفہوم کو بحث و نظر کی ورزش کے لیے اختیار کر لیتا چاہتے ہیں۔ پس متاخرین کے اختلافات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ صرف اسی تفسیر کو اختیار کرنا چاہیے جو حدیث و آثار سے ماخوذ ہو اور لغت و عربیت اس کی تصدیق کرے۔ متاخرین کی کاوشیں دراصل ایک طرح کا منطقی تقض ہے جس سے دماغ کو ورزش ملتی اور ذہن میں حدت پیدا ہوتی ہے لیکن وہ تفسیر قرآن بہر حال نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر صرف وہی ہو سکتی ہے جو خود حامل قرآن کے علوم سے ماخوذ ہو اور ان لوگوں نے بتلائی ہو جن کے علم و عمل پر خود اللہ نے اہل رضاء و پسندیدگی کی شہادت دی ہے: رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ اگر سلف سے اعراض و انکار کرنا ہے کہ وہ اصول فقہ و علم کلام کی یونانی دقیقہ سنجیوں سے نا آشنا تھے تو کم از کم قرآن کا علم تو



ان کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ قرآن نازل تو ہوا ہو محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر لیکن اس کے معانی و مطالب اس وقت تک مسلمانوں کو معلوم نہ ہوں جب تک اس سڑے یونانی ان کی رہنمائی نہ کرے؟

امام رازیؒ وغیرہ کو زیادہ حیرانی اس بنا پر ہوئی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کا ذکر بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ کیا گیا ہے اور عطف تسویہ پیدا کر رہا ہے۔ پس اولو الامر ایسا ہونا چاہیے جس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہو۔ سلاطین و امراء کو یہ منصب کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ حالانکہ بات بالکل صاف تھی، حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن و سنت قانون ہے لیکن قانون بالکل بیکار ہے اگر کوئی قوت نافذ نہ ہو یعنی اس قانون پر عمل کرانے والی قوت اور ظاہر ہے کہ جو قوت نافذ ہوگی، اس کی اطاعت عین قوت مقتضی کی اطاعت ہوگی۔ ایک دہقانی تک جانتا ہے کہ گورنر اور نائب السلطنت کی اطاعت۔۔۔ عین پادشاہ کی اطاعت ہے بلکہ ایک سپاہی کی اطاعت بھی عین قانون اور بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے اور اس سے مقابلہ کرنا عین قانون اور پادشاہ سے بغاوت کرنا ہے۔ یہ ساری بحثیں اس لیے پیدا ہو گئیں کہ اسلام کے جماعتی نظام کی اہمیت پر نظر نہ ڈالی گئی۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر ہوئی کہ شریعت کے نفاذ اور تسع کے قوام و نظام کے لیے ایک مرکزی اقتدار ناگزیر ہے اور وہ امام اور اس کے نائب امراء ہیں، تو اولی الامر کا مطلب بالکل صاف تھا کسی کاوش و بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔

”ان تنازعہم ارجح ہے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اسلامی خلیفہ کا وجود مسیحیت کے پوپ سے کس درجہ مختلف ہے جو اسلام کے نزدیک ”ارباہا من دون اللہ“ میں داخل ہے۔ مسیحیت کا خلیفہ، ارضی خلیفہ نہیں ہے آسانی و دینی فرمانروا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے لیکن اسلامی خلافت کی اصل و بنیاد خلافت ارضی یعنی حکومت و سلطنت ہے۔ وہ صرف شریعت اور تسع کی حفاظت کرنے والا اور احکام شریعت نافذ کرنے والا ہے۔ یعنی محض ایک قوت نافذ ہے نہ کہ مقتضی۔ اس کی ذات کو اصل شریعت اور اس کے احکام میں کوئی دخل نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فرد وہ الہی اللہ والرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے جس میں نزاع و اختلاف پیدا ہو تو پھر اس کے آخری فیصلہ کی قوت خلیفہ کا حکم نہیں ہے بلکہ مرکز اولے و حقیقی کا۔ یعنی قرآن و سنت کا اور خود خلیفہ بھی اس کی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح جماعت تسع کا ہر عام فرد۔

یہی وجہ ہے کہ اطیعوا اللہ کے بعد پھر ”اطیعوا الرسول“ میں فعل کا اعادہ کیا گیا۔ مگر اولی الامر میں نہیں کیا گیا تاکہ واضح ہو جائے کہ اصل اطاعت جو مطلوب ہے وہ اللہ کی ہے اور رسول کی ہے۔ یعنی کتاب و سنت کی اور اولو الامر کی اطاعت صرف اسی لیے ہے تاکہ کتاب و سنت کی اطاعت

کی جائے۔ بالاستقلال نہیں ہے۔ پھر ”فان تنازعتم“ کہہ کر اور زیادہ واضح کر دیا کہ اگر اولی الامر کتاب و سنت کے خلاف حکم دے تو پھر اس حکم میں اس کی اطاعت نہیں ہے اللہ اور اس کے رسول ہی کے حکم کی طرف لوٹنا چاہیے قالہ الطیبی فی الشرح

بعض امراء بنوامیہ نے اپنے مظالم و بدعات کی اطاعت کرانے کے لیے جب اس آیت سے استدلال کیا اور کہا: ایس اللہ امرکم ان تطیعونا فی قولہ ”واولی الامر منکم!“ کیا خدا نے تم لوگوں کو ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے کہ ”اولی الامر منکم؟“ تو بعض ائمہ تابعین نے کیا خوب جواب دیا۔ ایس قد نزعتم عنکم بقولہ فان تنازعتم“ ہاں، مگر پھر اس منصب سے تم محروم بھی تو کر دیے گئے جب فرمایا کہ ”فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول۔“

غرضیکہ اس آیت کریمہ میں قرآن نے اس قانون شریعت کا اعلان کیا ہے کہ خلیفہ و امام کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے اور اسی کا وجود نظام جماعت کا مرکز و اقتدار ہے۔



## شرح حدیث حارث اشعری

احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارے میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہد صحابہؓ سے لے کر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات روات و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلى الله عليه وسلم: انا امرکم بعمس الله امرنى بهن الجماعة والسمع، والطاعة، والهجرة، والجهاد فى سبيل الله فانه من خرج من الجماعة قيد سبر، فقد خلع ربة الاسلام من عنقه الا ان يرجع، ومن دعاهد عوى جاهلية فهو من حبلى جهنم. قالوا يا رسول الله وان صام وصلى؟ قال وان صام وزعم انه مسلم. اخرجه احمد والحاكم من حديث " الحارث الاشعري على شرط الصحيحين قال ابن كثير هذا حديث حسن وله الشواهد.

یعنی فرمایا۔ میں تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک ہالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلا یا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے لوگوں نے عرض کیا۔ کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگر چہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں اگر چہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے ذمے میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

اس حدیث میں پانچ باتیں بتلائی ہیں:

(۱) پہلی چیز "جماعت" ہے یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔ آگے چل کر کثرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندگی اور کشتی ہوئی جماعت

کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو اسلام نے غیر اسلامی اور ابلہسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی ”جماعت“ ہے۔

”جماعت سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد اختلاف، احتراز اور نظم ہو۔  
”اتحاد“ سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں، ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں کسی گوشہ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

”اختلاف“ کا مرتبہ ”اتحاد“ سے بلند تر ہے۔ ”اتحاد“ صرف باہم مل جانا ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو لیکن ”اختلاف“ سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے، وہی جگہ سے ملے ہو اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے، جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زید کو سردار ہونا چاہیے اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے اور عمرو کی قابلیت کا عنصر صرف چھٹا تک بھر جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کو سیر بھر قرار دے دیا جائے۔

”احتراز“ ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اس میں کیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے، ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جن کی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہم گریل نہیں کھاتی اور اس لیے خواہ کتنا ہی و لوں کو ملاؤ لیکن تیل اور پانی کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئیں گے، باہم مل کر ایک جان نہ ہو پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عناصر کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ باہم گریل کر ایک نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں اسی طرح افراد انسانی کو بھی اس لیے پیدا کیا تاکہ ان کے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ ”جماعت“ ایک مرکب وجود ہے۔ افراد اس کے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا محض ایک ٹیٹا ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پاسکتا لیکن یہ باہم ملنا ”احتراز“ کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو یہ ہمیں ایسی انگشتی کے لیے تھا:

”نظم“ سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے دائرہ میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں نہ قائم رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی بالاتر

فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد اور موٹلف مزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک ”امام“ کا وجود ناگزیر ہوا اور اسی لیے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام و مطاع تسلیم کر لیں جو بکھرے ہوئے اجزاء کو اتحاد و اختلاف اور امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے اور اڑتے ہوئے ذروں سے ایک جی و قائم جماعتی وجود پیدا کر دینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز اس طاقت کا امام اعظم یعنی خلیفہ ہے اور پھر ہر ملک، ہر آبادی اور ہر گروہ میں اس کے ماتحت امام جماعت ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کے لیے بھی شرعاً جائز نہیں کہ بلا قیام امام کے زندگی بسر کریں حتیٰ کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں تو چاہے کہ ایک ان میں سے امام تسلیم کر لیا جائے۔ ”اذا كان ثلاثة في سفر، فليؤمروا احدهم“

پانچ وقت کی جماعت نماز میں جماعتی نظام کا پورا پورا نمونہ مسلمانوں کو دکھلادیا گیا کیونکہ نماز ہی وہ عمل عظیم ہے جو اسلام کے تمام عقائد و اعمال کا جامع ترین نمونہ ہے۔ کس طرح سینکڑوں ہزاروں منتشر افراد مختلف مقاموں، مختلف جتوں، مختلف شکلوں اور مختلف لباسوں میں آتے ہیں، لیکن یکا یک صدائے تکبیر سب کے انتشار کو ایک کامل اتحادی جسم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہزاروں اجزاء کا یہ منتشر مواد بالکل ایک جسم واحد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سب کے وجود ایک ہی صف میں جڑے ہوئے، سب کے کاندھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے، سب کے قدم ایک ہی سیدھ میں سب کے چہرے ایک ہی جانب۔ قیام کی حالت ہے تو سب ایک جسم واحد کی طرح کھڑے ہیں۔ جھکاؤ ہے تو تمام صفیں بیک وقت جھکی ہوئی ہیں۔ ظاہر کے ساتھ باطن بھی یکسر متحد و مزوج۔ سب کے دل ایک ہی کی یاد میں محو، سب کی زبانیں ایک ہی کے ذکر میں مترنم، پھر دیکھو، سب کے آگے صرف ایک ہی وجود امام کا نظر آتا ہے جس کے اختیار میں جماعت کے تمام اعمال و افعال کی باگ ہوتی ہے۔ جب چاہے سب کو جھکا دے جب چاہے سب کو اٹھا دے۔

اسلام کی زبان میں ”جماعت“ سے مقصود ایسا اجتماع ہے۔ انبؤہ اور بھیڑ کا نام جماعت نہیں ہے۔ جماعت کے جن اوصاف و خواص کا اوپر ذکر کیا گیا، وہ تمام تر قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں لیکن شواہد کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۲) دوسری چیز ”سمع“ ہے یعنی امام جو احکام دے اس کو سننا اور اس سے تعلیم و ارشاد حاصل کرنا۔ ”سمع“ کے لفظ میں قبولیت احکام طلب و تعلیم، دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور امام کی مصلحت و حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

- (۳) تیسری چیز ”طاعت“ ہے یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت و فرمانبرداری اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کر دینا اور اس کے ہر حکم کی بلاچون و چرا تعمیل کرنا۔ البتہ اطاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں کہ العما الطاعة لی المعروف۔
- (۴) چوتھی بات ”ہجرت“ ہے۔ ہجرت ہجر سے ہے جس کے معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔

”الهجرة والهجران مفارقة الانسان غيره اما بالبدن او باللسان او بالقلب والمهاجرة، مصارمة الغير ومشاركة (۵۵۸)۔

اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنی زندگی و محبوبات و مال و اوقات ترک کر دے۔ مثلاً دولت کو، آرام و راحت کو، عزیز واقربا کے قرب کو، وطن کو، مکان کو تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رسول اور ان کے پیروؤں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی: ”انی مهاجر الی ربی“ اور ”انی ذاہب الی ربی“۔

چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل و عیال، مال و متاع، دوست و احباب، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور اس کی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے اس لیے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی اور زیادہ تر مہاجرت کا اطلاق تاریکین وطن ہی پر کیا گیا۔ ولکل امری مانوی۔ لمن کانت ہجرته الی اللہ ورسولہ فہجرته الی اللہ ورسولہ ومن کانت ہجرته للدنیا یصیبھا، او امرأة یغزو جہا فہجرته الی ماہاجر الیہ (بخاری عن عمر) یعنی ہر شخص کے لیے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوئی، اور جس نے اس لیے گھر چھوڑا کہ دنیا کمائے، یا نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہوئی جس کے لیے اس نے گھر چھوڑا۔ پھر ہجرت کے بھی اقسام ہیں اور مراتب بعضہما فوق بعض کتاب و سنت اس کی تفصیل سے لبریز ہیں۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

پانچویں چیز ”جہاد فی سبیل اللہ“ ہے۔ ”جہاد“ جہد سے ہے جس کے معنی ”استفراغ الوسع فی مدالعة العدو ظاہراً و باطناً ہیں (مفردات راغب)۔ یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے کے لیے انتہا درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی ہوتی ہے جان سے بھی ہوتی ہے۔ جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ و جاهدوا المشرکین باموالکم و انفسکم و استکم“ رواہ ابو داؤد، واحمد

ولسالی واہن حبان عن النس)

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقا و قیام کی اصلی بنیاد ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زبردہ نہیں رہ سکتی جس کی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے نہیں مل سکتی۔ تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے، مگر کوئی چیز بھی بغیر جماعت، اطاعت، ہجرت اور جہاد کے حاصل نہ ہو سکے گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کرو گے تو وہ سب ان ہی پانچ سچائیوں کے ثمرات و نتائج ہیں۔

دنیا کے تمام نزاعات و اختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسامہ و مصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب صداقت کے اکثر جھگڑے حکایت شہد و عمل سے زیادہ نہیں۔ یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشہ عمل میں حقیقت و مسلمی کے اعتبار سے ایک ہی ہے لیکن ہمیں مختلف ہو گئے ہیں اور نام متعدد۔ معصیت یہ ہے کہ دنیا معانی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے اور گو سب طلب گارو پر ستار ایک ہی حقیقت کے ہیں لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہر گر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے شہد۔ دوسرا کہتا ہے عمل۔ مگر کوئی نہیں جو دونوں کو سمجھاوے کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے۔ اختلاف اسمی میں نہیں ہے صرف اسم میں ہے۔ ایک شخص شب و روز ایک حقیقت کو مانتا اور جانتا ہے لیکن اپنی اصطلاح و رسم میں کسی خاص لقب سے پکارتا ہے۔ وہی حقیقت جب ایک دوسرے نام سے اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو فوراً انکار کر دیتا ہے اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس سے ہر طرح نفرت کرے۔ مذہب کے اختلافات سے لے کر معاشرت و رسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلافات تک، ہر جگہ یہی علت کام کر رہی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ ظواہر و اسامہ کے تمام پردے اٹھا دیئے جائیں اور حقیقت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آ جائے تو یکایک دنیا کے تمام نزاعات ختم ہو جائیں اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلوب ایک ہی ہے۔ اگرچہ ہمیں مختلف ہیں اور سب کا مقصود ایک ہی ہے اگرچہ نام بہت سے ہیں۔

عبارتنا ہستی و حسنک واحد و کل الی ذاک الجمال یشیرا

علوم و حقائق کے مشاہد و مناظر میں یہ مشہد سب سے اعلیٰ و ارفع مقام رکھتا ہے۔ اسی کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ”علم الجمع بین المختلفات“ سے تعبیر کرتے ہیں ۲ اور عامرہ اصحاب اشارات و سلوک نے ”مشہد وحدت“ کی اصطلاح اختیار کی ہے جو سالک طریق کے لیے کشف حجب اور میر حقائق کا سب سے بلند تر مقام ہے۔ مقصود اس سے وہ قوت نظر و فکر ہے جو ظواہر سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جائے اور اسامہ و تعبیرات کے اختلافات دور کر کے مقاصد و معانی کا اتحاد معلوم کرے۔ یہ حد یکہ سارے نزاعات و اختلافات دور ہو جائیں اور سخت سے سخت تنازع و متضاد راہوں پر چلنے والے بھی دیکھ لیں کہ اصل

مطلوب دونوں کا ایک ہی ہے۔

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کرو گے تو واضح ہو جائے گا کہ جماعت، تعلیم، اطاعت، ہجرت اور جہاد دنیا کی وہ عالمگیر صدائیں ہیں، جن کی حقیقت سے کسی فرد بشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے ان کا اقرار کیا ہے، ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے اور ہر عامل جماعت شب و روز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے یہ ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے ان کو تعبیر کیا ہے ان سے دنیا کو اختلاف ہے لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی، اگر کرے تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔

اس نظام میں پہلی چیز ”جماعت“ ہے جس کی مختصر تشریح اوپر گزر چکی۔ غور کرو، دنیا کا کونسا کام ایسا ہے جس کو بلا اجتماع و جماعت کے انجام دیا جا سکتا ہے۔ جماعت کی زیادہ دقیق اور فلسفیانہ تعریف چھوڑ دو۔ صاف اور سیدھے سادھے معنی جو ہو سکتے ہیں، صرف انہی پر غور کر لو، سوسائٹی، پارٹی، کمیٹی، کلب، انجمن، کانفرنس، پارلیمنٹ، بلکہ قوم، ملک، فوج ان سب سے مقصود کیا ہے؟ یہی کہ ”جماعت“ اور ”اتزام جماعت“۔ وحشی قوموں تک کو دیکھتے ہو کہ جنگل کے درختوں کے نیچے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مل جل کر اپنے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر جماعت بے سود ہے اگر اس کا نظام نہ ہو اور کوئی سردار و رہنما نہ ہو۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو تو سب سے پہلے ایک پریزیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر مجلس نہ مان لیں گے یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی باقاعدہ کام نہ کر سکے گی۔ فوج ترتیب دیتے ہو تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے اس کی اطاعت ماتحتوں کے لیے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ پانچ دس آدمی بھی اگر بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیوں گمراہے فرائض بلا امیر کے انجام دے سکتی ہیں؟ اس سے بھی سادہ تر مثال یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں کو دیکھو! خود تمہارا گھر بھی تو ایک چھوٹی سی آبادی ہے؟ اگر بیوی تمہارا حکم نہ مانے تو تم کیوں بگڑتے ہو! اگر گھر کے لوگ تمہارے کہنے پر نہ چلیں تو تم کیوں لڑتے ہو! تم کہتے ہو کہ فلاں گھر میں امن و انتظام نہیں۔ روز خانہ جنگی ہوتی ہے یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ ”الجماعة والسمع والطاعة پر عمل نہیں ہو رہا۔“ کوئی جماعت امن و نظم و ضبط نہیں پاسکتی جب تک اس کا کوئی امیر نہ ہو اور جب تک امیر کی اطاعت نہ کی جائے۔ گھر اور خاندان بھی ایک چھوٹی سی جماعت ہے تم گھر کے بڑے ہو یعنی امیر ہو۔ پس گھر کی عافیت و کامیابی اس پر موقوف ہے کہ سب تمہاری سنیں اور تمہارے کہے پر چلیں۔



”ہجرت“ کا لفظ کس قدر تمہارے لیے نا آشنا اور نامانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی براہمختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی تک کو قربان کر دیتا تھا لیکن بتلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں وہ ”ہجرت“ کی حقیقت سے کب خالی ہیں! اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرہ عروج بھی کس عمل حقیقت کا نتیجہ ہے۔ ”ہجرت“ سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حاصل ہوں ان سب کو ترک کر دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں، حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہو سب کو چھوڑ دینا۔ پھر بتلاؤ علم و عمل کا کون سا گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبے کے مل سکتی ہے؟ انسان کی مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی ہلاکتیں ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گزرے اس نے پالی ہو۔ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل محیط و فلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو تو معلوم کر لو گے کہ صرف عمل ہجرت کے۔ اگر انسان اور انسانوں کی جماعتوں نے طلب مقاصد و عزائم میں ہزاروں قربانیاں نہ کی ہوتیں، ہر طرح کے آرام و راحت سے مفارقت نہ کر جاتے اپنی ساری خواہشوں اور ولولوں کو ترک نہ کر دیتے، گھر کے عیش، اہل و عیال کی محبت، خویش و یگانہ کی الفت اور ملک و وطن کی دامن گیریوں سے بالکل آزاد ہو کر راہ ہجرت میں قدم نہ اٹھاتے تو آج دنیا میں علم کی جگہ جہل ہوتا، تمدن کی جگہ وحشت ہوتی، آبادیوں کی جگہ جنگل ہوتے اور ان تمام ترقیوں میں سے ایک ترقی بھی کرۂ ارضی کی پشت پر نظر نہ آتی۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون موجود ہیں، ان سب کی تکمیل کیونکر ہوتی اگر ولولہ ہجرت سے انسان کا قلب خالی ہوتا! کتنے ہی انسانوں نے اپنے گھروں اور وطنوں سے ہجرتیں کی ہیں۔ دنیا کے ایک ایک گوشہ ایک ایک چپہ کو چھان مارا ہے۔ جب کہیں جا کر فن طب کی تکمیل ہوتی ہے اور ادویہ و اشیا کے خواص کا علم مکمل ہوا ہے۔ اگر مہاجرین علم کے قافلے اپنے اپنے گوشوں سے نہ نکلتے اور گھر کے آرام و راحت کی جگہ سفر و غربت کی صعوبتیں گوارا نہ کرتے تو اشیا کی تحقیق کیونکر ہوتی ایجاد اور کی معلومات کیونکر تکمیل پاتیں؟ جغرافیہ کیونکر وجود میں آتا؟ علم انبیاء کے تجارب کی جزئیات کیونکر جمع ہو سکتیں انہی نئی ایجادات اور اکتشافات کی کس طرح راہ کھلتی؟ کولمبس اگر ہجرت نہ کرتا تو آج دنیا کا نصف تمدن نامید تھا۔ یورپ اگر ہجرت نہ کرتا تو آج نیویارک اور واشنگٹن کی سر بلبلک عمارتوں کا وجود نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی قومیں اپنے ملکوں سے مہاجرت نہ کرتیں تو آج تمام دنیا کی

دولت ان کے گھروں میں کھینچ کر نہ جاتی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈبڑھ سوا قائلے یکے بعد دیگرے لٹکیں اور یکسر قربان و ہلاک ہو جائیں تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال اور جذبہ نوح پرستی کی انتہا ہے لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ ”ہجرت“ سے تعبیر کرے تو تم اس کا انکار کرو۔ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سینکڑوں انسان اپنا گھربار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں؟ اگر نینٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ کشش ثقل کا قانون دریافت کرے تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے لیکن اگر تم عزم و طلب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اس عاجز صادق کے لیے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کے لیے نہیں بلکہ قانون نجات عالم کے لیے اپنا گھربار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے!

آج تمام یورپ قومی ترقی اور ملکی استحکام کی سب سے بڑی بنیاد ”کالونیل سٹم کو یقین کرتا ہے یعنی نوآبادی کے اصول کو اور اس کا اس درجہ پرستار ہے کہ صرف اسی کی خاطر پانچ سال تک دنیا کو عالمگیر جنگ و قتال میں مبتلا رکھتا ہے۔ لیکن نوآبادی کے اصول کے کیا معنی ہیں؟ یہی نہ کہ ترک وطن کر کے اپنی نئی نئی آبادیاں قائم کرنا اور قومی دولت و طاقت کو بڑھانے کے لیے دنیا میں دور دور تک پھیل جانا۔ اب غور کرو یہ وہی ”ہجرت“ اور ترک وطن کی بات ہوئی یا نہیں؟ اور الجماعۃ والسمع والطاعة والہجرۃ“ پر دنیا عمل کر رہی ہے یا نہیں؟ نام مختلف ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے۔

”جہاد“ کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان و مال سے کمال درجہ سعی و محنت کرنا۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان کوئی گھر، کوئی انسان بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ و قائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا؟ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو وہ کارزار پرستی میں بقاء و قیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو، اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ ”جہاد“ سے تعبیر کیا ہے۔ اگر تم سے ڈارون اور رسل و ملیس تنازع البقاء Struggle for Existences اور انتخاب طبیعی Natural Selection اور بقائے الصلح Survival of the Fittest کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کارزار حیات میں بقا صرف اصلح و اصلح کے لیے ہے تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو اور فطرت کے قتل و غارت کا افسانہ خونیں تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا۔ لیکن اسی حقیقت کو قرآن و اسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو قانون الہی زمین کے کیڑوں کوڑوں تک پر نافذ ہے اس سے جمعیت بشری کیونکر بری ہو سکتی ہے! پس دنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق و ہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا چاہیے اور انہیں قانون الہی

کا ہاتھ بن کر مٹا دینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں۔“  
 لیظہرہ علی الدین کلہ“ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدر ترقی قانون ہستی  
 کے ذکر میں تم کو قتل و غارت گری کی وہشت نا کی نظر آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نوآبادیوں  
 سے بھر دیں اور کہیں کہ فریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کی حقدار ہیں۔ اس کو تو  
 تم گوارا کر لو لیکن اگر اسلام کہے کہ ”ان الارض لله ورسوله“ خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے  
 کفر و ضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں ہے تو تم اس کو وحشت اور خوفناکی کہو؟



## حواشی

- ۱ مفردات القرآن امام راغب اصفہانی ص 558۔
- ۲ گمہات میں لکھتے ہیں۔ ”لعمامت ہی دورة الحکمة۔ البسنی اللہ خلعة المجددۃ  
 فعلمت علم الجمع بین المختلفات

KITABOSUNNAT.COM

## جماعت و التزام جماعت

یہاں ایک اور اہم اور قابل غور امر یہ بھی ہے کہ اس حدیث اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعت خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اس کے عکس کو جاہلیت۔ جاہلیت کی زندگی میں ہلاکت کا اصلی غم کیا تھا؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ تفرقہ اور باہم و مگر طہیدگی اور کسی ایک مرکزی قوت کے ماتحت نہ ہونا۔ اسلام نے ظاہر ہو کر زندگی کی جو غم ریزی کی، وہ کیا تھی؟ باہمی اتحاد و اختلاف کہ تمام منتشر افراد کو ایک متحد جماعت بنا کر نفس واحد کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوٹ پر جھکا دیئے: ”وَ اذْ كُرُوا بِعَمَتِ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءَ فَالْفَ اَنَّ لِقَوْلِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِعَمَةِ اَعْوَابًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُم مِّنْهَا“ الخ (۳: ۱۰۳)

پس جاہلیہ کا دوسرا نام تفرقہ ہو اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہوگی اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ مزید احادیث میں سے بعض روایات صحاح یہ ہیں:

”من اطاعنى فقد اطاع الله، ومن اطاع اميرى فقد اطاعنى ومن عصى اميرى فقد عصانى، (صحیح عن ابی ہریرة) جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی (یعنی میرے نائب کی اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی) اور جس نے امیر سے روگردانی کی اس نے میری اطاعت سے انکار کیا۔ یعنی امیر المؤمنین کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں ”امیری“ کی جگہ صرف ”الامیر“ ہے یعنی جو شخص مسلمانوں کا امام ہو، اس کی اطاعت۔

”اسمعوا واطيعوا وان استعمل عليكم عبد حبشي كان راسه زبيبة“

(صحیحین عن السنن)

اگر ایک حقیر صورت حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے، تو چاہیے کہ اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بار بار اور اکثر سے خطبوں میں آپ ﷺ فرماتے تھے۔ اسی لیے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع کی نسبت سے مروی ہے۔ جیتہ الوداع کے عظیم الشان اور یادگار عالم موقعہ پر (جب کہ دو تین ماہ کے بعد آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے اور ایک آخری پیام دنیا کو سنار ہے تھے) فرمایا ”ولو استعمل علیکم عبد یفقدکم بکتاب اللہ، اسمعوا و اطیعوا“ (اسلم) اگر ایک جوشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکومت کرے تو اسکی سنوار اطاعت کرو۔

من خرج من الطاعة وفارق الجماعة، فمات، مات ميتة جاهلیة وعن ابن عباس ”من رای من امیروہ شیئا یکرهہ فلیصبر، فانہ من فارق الجماعة شہراً فمات، مات ميتة جاهلیة“ وفی لفظ ”فانہ لیس احد من الناس خرج من السلطان شہراً فمات علیہ الامات ميتة جاهلیة“ (متفق علیہ)

یعنی جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا، خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہو گیا اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی (اسلام سے پہلے اہل عرب پر جو زمانہ گزرا ہے، اس کو عہد جاہلیت کہتے ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ عرب جاہلیت کی طرح گمراہی پر موت ہوئی)۔ دوسری روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اسے پسند نہ آئے تو چاہیے کہ صبر کرے۔ اس کی اطاعت سے باہر نہ ہو کیونکہ جو کوئی سلطان اسلام کی اطاعت سے باشت بھڑ بھی باہر ہو اور اسی حالت میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی حالت پر ہوئی۔ حضرت ابن عمر کی روایت میں ہے: ”من خلعت بدأ من طاعة، لقی اللہ یوم القيامة ولا حجة ومن مات ولمس فی عنقه بعة، مات ميتة جاهلیة۔“

جس نے خلیفہ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچا یعنی اطاعت نہ کی، تو قیامت کے دن وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا اور اس کے لیے کوئی بچاؤ نہ ہوگا اور جو مسلمان دنیا سے اس حال میں گیا کہ خلیفہ کی بیعت و اطاعت کے حلقہ سے اس کی گردن خالی ہوئی تو یقین کر دو کہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی۔

”من فارق الجماعة شہراً فکانما خلعت ربقة الاسلام من عنقه (ترمذی) یعنی جو جماعت سے باشت بھڑ بھی باہر ہوا اس کا حکم یہ ہے کہ گویا اس نے اسلام کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ ایک روایت میں ہے ”دخل النار (اخرجه الحاكم علی شرط الصحیحین) یعنی جو خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہوا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔“

”کانت بنو اسرائیل تمسوسهم الالیاء۔ کلما هلک نبی خلفہ نبی وانہ لانی بعدی۔ وسیکون خلفاء لیکثرون۔ قالوا فما تامرنا؟ قال۔ فوابعة الاول فالاول، ثم

اعطوہم حقہم، فان اللہ یسألہم عما استرعاہم“ (متفق علیہ)

یہی اسرائیل کی رہنمائی و ریاست انبیاء کرتے تھے۔ ایک نبی گیا تو دوسرا اس کی جگہ مامور ہوا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، البتہ خلفاء ہوں گے۔ لوگوں نے عرض کیا ہم کو ان کی نسبت کیا حکم ہوتا ہے؟ فرمایا! جس سے پہلے بیعت کی یعنی جس کی حکومت پہلے مان لی گئی اس کی اطاعت مقدم ہے پھر کسی دوسرے کو خلیفہ نہ مانو۔ اور فرمایا ان کا تم پر جو کچھ حق ہے وہ ان کے حوالے کرو یعنی ان کی اطاعت کرو۔ زکوٰۃ و خراج وغیرہ انہی کو دو۔

ان کے علاوہ بے شمار احادیث ہیں۔ اجماع کے شواہد اور کتب عقائد و فقہ کے اقوال نقل نہیں کیے گئے۔ کہ مشہور و معروف ہیں اور احادیث کے بعد ان کی ضرورت بھی نہیں۔



## شرائط امامت و خلافت

تمام نصوص و دلائل کتاب و سنت اور اجماع ائمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شرائط امامت و خلافت کے بارے میں دو صورتیں اختیار کی ہیں اور قدرتی طور پر یہی دو صورتیں اس مسئلہ کی ہو سکتی تھیں۔

اسلام نے اس بارے میں نظام عمل یہ مقرر کیا تھا کہ امام کے انتخاب کا حق ائمہ کو ہے اور طریق انتخاب جمہوری تھا نہ کہ شخصی و نسل۔ یعنی قوم اور قوم کی صاحب الرائے جماعت (اہل حل و عقد) کو شرائط و مقاصد خلافت کے مطابق اپنا خلیفہ منتخب کرنا چاہیے۔ یہ حکم ”وامروہم شورىٰ بینہم“ بنیاد تمام امور کی شرعاً شوریٰ یعنی باہمی مشورہ ہے نہ کہ نسل و خاندان۔ خلافت راشدہ کا عمل اسی نظام پر تھا۔ خلیفہ اول کا انتخاب عام جماعت میں ہوا۔ خلیفہ دوم کو خلیفہ اول نے نامزد کیا اور اہل حل و عقد نے منظور کر لیا۔ خلیفہ سوم کا انتخاب جماعت شوریٰ نے کیا۔ خلیفہ چہارم کے ہاتھ پر خود تمام جماعت نے بیعت کی۔ نسل، خاندان، ولی عہدی کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ اگر دخل ہوتا تو ظاہر ہے کہ خلافت خلیفہ اول کے خاندان میں آجاتی یا دوم و سوم کے خاندان میں، مگر ایسا نہیں ہوا۔ خلیفہ دوم نے تو قوم کو بھی اس کا موقع نہ دیا کہ ان کے لڑکے کو خلیفہ منتخب کرے۔ وصیت کر دی کہ وہ کسی طرح منتخب نہیں ہو سکتا۔

پس پہلی صورت یہ ہے کہ اگر صحیح نظام شرعی قائم ہو جو خالص جمہوری ہے اور قوم کو اپنا خلیفہ منتخب کرنے کا موقع ملے تو کیا شخص منتخب کرنا چاہیے اور اس میں کیا کیا اوصاف ہونا چاہئیں؟

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ نظام باقی نہ رہا ہو۔ قوم کی رائے اور انتخاب کو اس میں دخل نہ ہو۔ محض طاقت اور تسلط کی بنا پر کوئی خاندان یا کوئی طاقتور فرد تخت خلافت پر قابض ہو جائے تو اس صورت میں آزر وئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اگر وہ اہل نہیں ہے، ظالم ہے، جاہل ہے، شرائط خلافت اس میں نہیں پائے جاتے تو اس کی اطاعت کرنی چاہیے یا اس پر خروج کرنا چاہیے؟ وہ شرعاً خلیفہ المسلمین ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے ماتحت وہ تمام کام انجام پا سکتے ہیں یا نہیں جو آزر وئے شرع خلیفہ اسلام کی موجودگی پر موقوف ہیں؟ اس کو زکوٰۃ دینی چاہیے؟ اس کے پیچھے جمعہ پڑھنا چاہیے؟ اس کے تمام احکام کی اطاعت کرنی چاہیے؟

یہ مسئلہ امت کی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ تھا اور ممکن نہ تھا کہ شریعت اس کی پوری پوری تشریح و توضیح نہ کر دیتی۔ اس بارے میں نصوص سنت بے شمار اور بالکل واضح ہیں۔ اسی لیے جب خلافت راشدہ کے بعد غوامیہ کی حکومت جبر و استبداد کے ساتھ قائم ہوئی تو صحابہ کرام کو اپنے طرز عمل کے فیصلے میں ذرا بھی تاثر و تذبذب نہ ہوا۔ بالکل اس شخص کی طرح جو پہلے سے ایک خاص وقت کا سمجھا بوجھا منتظر ہو فوراً یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کر لیا جو کچھ انہوں نے بتلایا اور کیا، اسی پر اجماع امت کی مہر لگ گئی اور تیرہ سو برس سے جمہور اہل اسلام کا وہی متفقہ اعتقاد و عمل قرار پائیا۔ بلاشبہ پہلی صورت میں بعض اسلامی فرقوں کو اختلاف ہوا، مگر دوسری صورت میں قولاً و فعلاً سب متفق ہو گئے۔

پہلی صورت میں شریعت نے اہلیت و صلاحیت کی وہ تمام شرائط اپنے انتہائی اور کامل مرتبہ میں قرار دی ہیں جو ایک ایسے مرکزی اور اہم ترین منصب کے لیے قدرتی طور پر ہونا چاہیے۔ کیا ہاں اعتبار قوت علمی کے، کیا ہاں اعتبار قوت عملی کے اور چونکہ یہ منصب متحدہ جمیہیتوں سے مرکب ہے اس لیے ہر حیثیت کے لحاظ سے ضروری اوصاف بتلائے گئے۔ مثلاً اسلام، علم و نظر، عمل و تقویٰ، شجاعت و صولت، عدالت و ایثار، قدرت و نفوذ، طاقت و شوکت۔ چنانچہ تمام کتب عقائد میں صدیوں سے مسلمان پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں: ”ویشترط ان یکون من اهل الولاية المطلقة الكاملة بان یکون مسلماً حراً ذکراً، عاقلاً، بالغاً، سائساً بقوة رایہ و رویئہ، ومعونة باسئہ و شوکئہ، قادراً بعلمہ و عدالتہ و کلمائتہ و شجاعتہ علی تنفيذ الاحکام، و حفظ حدود الاسلام و انصاف المظلوم من الظالم عند حدوث المظالم“ (النج) کذا فی شرح المواقف، والنسفی، والتمهید، وشرح لفقہ الاکبر للقاری وشرح المقاصد. و من کتب المحدلین شرح عقیدہ ابن حلیل، وفتح الباری، وشرح منظومۃ الاداب، و خلاصہ ابن مفلح، و نیل الاوطار، و نیل المرام اللشوکانی، و الاقناع وشرح وغیرہم۔“

یعنی ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کرنا چاہیے جس میں حسب ذیل اوصاف پائے جائیں۔ مسلمان ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عاقل و بالغ ہو، صاحب رائے و نظر ہو، تدبیر و انتظام کی پوری قوت رکھتا ہو، احکام شریعت کا محافظ ہو، ان کے جاری و نافذ کرنے اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دشمنوں کی روک تھام کے لیے جس قدر علمی و عملی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہوں۔ اتباع شریعت، عدل و انصاف، شجاعت و ہمت، شوکت و صولت، ساری صفیوں اس میں موجود ہونی چاہئیں۔

جس وقت تک خاندان عباسیہ کی خلافت باقی رہی، یعنی خلافت خاندان قریش و عرب میں رہی۔ (۶۳۰ء مطابق ۱۲۳۳ھ) تک اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک بوجہ بقائے خلافت عباسیہ مصر کے



علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال رہا کہ بموجب حدیث ”ان حد الامرنی قریش“ خلیفہ کو قریشی بھی ہونا چاہیے۔ یعنی اگر مسلمان خلیفہ مقرر کریں تو جہاں اور بہت سی باتیں اس میں ہونی چاہئیں، وہاں یہ بات بھی ہو کہ خاندان قریش میں سے ہو۔

اسی طرح جماعت امامیہ اس طرف گئی کہ خلافت ائمہ اہل بیت کے لیے منصوص ہے۔ ان کے اعتقاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ ہونا چاہیے تھا اور ان کے بعد ان کی نسل کے ائمہ عترہ رضی اللہ عنہم کو۔

”زیادہ“ اس طرف گئے کہ ہنسی فاطمہ یعنی تمام سادات مستحق خلافت ہیں۔ ائمہ عترہ کی خصوصیت ضروری نہیں اور شرطوں کے ساتھ صرف اس قدر کافی ہے کہ امام سید یعنی ہنسی فاطمہ میں سے ہو۔

لیکن دوسری صورت میں (یعنی اگر نظام شرعی کی جگہ ملکی قبضہ و تسلط کی صورت پیدا ہو جائے اور جمہور کو انتخاب و نصب کا موقع نہ ملے تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟) سو اس کی نسبت چونکہ خود احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ و عترہ میں بالکل صاف صاف موجود تھا اس لیے تمام ائمہ بلا اختلاف اس پر متفق ہو گئی کہ جب ایک مسلمان منصب خلافت پر قابض ہو جائے اور اس کی حکومت جم جائے تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اسی کو خلیفہ اسلام تسلیم کرے، اسی کے سامنے گردن اطاعت جھکائے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک اہل و مستحق خلیفہ کے آگے جھکتا چاہیے۔ اطاعت و اعانت کی وہ تمام باتیں جو منصب خلافت کے شرعی حقوق میں سے ہیں ایسے خلیفہ کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس سے روگردانی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اس کے مقابلے میں خروج اور دعوے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا اگرچہ کیسا ہی افضل اور جامع الشروط کیوں نہ ہو۔ جو کوئی ایسا کرے، مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کے مقابلے اور قتل میں خلیفہ کا ساتھ دیں۔ وہ شرعاً باغی ہے اس کو قتل کر دینا چاہیے۔

شریعت نے دوسری صورت میں یہ حکم کیوں دیا؟ اس کی علت و مصلحت اس قدر واضح ہے کہ شرح و تفصیل کی حاجت نہیں۔ شریعت اور ائمہ کا قائم و باقی رہنا حکومت کے وجود و قیام پر موقوف تھا۔ نساری باتیں شاخ ہیں۔ جڑ یہی مقام و منصب ہے۔ پس اس کے لیے ایک نظام شرعی مقرر کر دیا گیا جو بہتر سے بہتر نظام ہو سکتا ہے۔ یعنی اسلامی حکومت کی بنیاد جمہور اور شوری کے انتخاب پر رکھی۔ غرض، نسل، تسلط، اقتدار اور پادشاہی، ملوکیت کو اس میں دخل نہیں۔ ساتھ ہی اس منصب کی اہلیت کے لیے تمام ضروری شرطیں اور صفات بھی بتلا دیں کہ اپنا خلیفہ بناؤ تو ایسے غرض کو بناؤ۔ ایسے کو نہ بناؤ جو اس کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ پھر پورے زور کے ساتھ اس کا بھی اعلان کر دیا کہ لوگوں کو خود خلیفہ بننے اور امارت و سرداری حاصل کرنے

کا خواہشمند نہ ہونا چاہیے۔ نہ دعوے دار بن کر دوسروں سے لڑنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس عہد پر لوگوں سے بیعت لینے "لا ینازع الامر اہلہ" سرداری کا جو اہل ہوگا، اسی پر سرداری چھوڑ دیں گے۔ دنیا اگر اس چھوٹے سے جملہ پر عمل کرے تو روئے زمین کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باعدھا ہے۔ ماہیکرہ من الحرص علی الامارۃ" اور ابوموسیٰ کی روایت لائے ہیں جس میں آپ نے فرمایا: "انا لا نولی هذا من مسالہ ولا من حرص علیہ" جو شخص خود اس چیز کا طالب ہو یا اس کی حرص رکھتا ہو اس کو میں یہ کام سپرد نہ کروں گا۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ جب لوگ خود طلب و حرص نہ کریں گے تو کش کش اور مقابلہ بھی نہ ہوگا اور امت کے لیے نہایت آسان ہو جائے گا کہ اہل و صالح کو منتخب کرے۔

مسئلہ خلافت کا اصلی نظام شرعی یہ تھا۔ اگر یہ قائم ہو تو دنیا امن و سکون کی بہشت بن جائے۔ لیکن چونکہ معلوم تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا یہ نظام تیس برس سے زیادہ قائم رہنے والا نہیں، اس لیے شرع و ملت کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ نظام اصلی پر زور دینے کے ساتھ ان وقتوں کے لیے بھی صاف صاف احکام دے دیے جائیں جب احتیاج و نصب و خلافت کے بارے میں شریعت کا ٹھہرایا ہوا طریقہ باقی نہ رہے اور جمہوری حکومت کی جگہ شخصی و استبدادی طریقہ قائم ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں دو ہی راہیں سامنے آتی تھیں۔ اگر ایسے لوگوں کی خلافت تسلیم کر لی جائے تو اس سے امت کی جمعیت، جان و مال کا امن ممالک اسلامیہ کی حفاظت احکام شرع کا اجراء جماعت کا قیام و بہتاد اور اسی طرح کے بے شمار مصالح و فوائد حاصل ہو جاتے ہیں کیونکہ بلا کسی نزاع کے اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور حرید جنگ و جدال اور کشت و خون کا سدھاب ہو جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی غیر مستحق کی خلافت اور غیر شرعی نظام کے قائم ہونے سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

لیکن اگر خلافت تسلیم نہ کی جائے، ان پر خروج کرنے کی اجازت دے دی جائے اور اطاعت امت کا مستحق صرف اہل اور جامع الشروط علیہ ہی کو قرار دیا جائے تو پھر دائمی کشت و خون، جنگ و قتال، وجود میں تصادم، قوتوں میں تراجہ، ہمیشہ کی بد امنی، کبھی نہ ختم ہونے والی طوائف الملوکی اور اتار کی، امت کی جابھی، ملکوں کی خرابی، نظام جماعت کا اختلال، احکام شرع کی تعطیل، مسلمانوں کے جان و مال کی بد امنی، اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے دشمنوں کا حملہ و تسلط اور اسی طرح کی بیشمار ہلاکتوں اور بربادیوں کا ہمیشہ کے لیے دروازہ کھل جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کی امید بھی کی جاسکتی ہے کہ شاید ان بربادیوں کے بعد اصلی نظام خلافت قائم ہو جائے اور نااہلوں کی جگہ کسی اہل اور جامع الشروط کو خلافت دلائی جاسکے۔

پہلی صورت میں مصلحت کا بہانہ و حصول، مگر خرابیوں کا امکان تھا۔ دوسری صورت میں خرابیوں کا وقوع، مگر مصالغ کا امکان تھا۔

اسلام نے پہلی صورت اختیار کی اور پوری قوت و اصرار کے ساتھ دوسری راہ مسدود کر دی۔ یعنی مصالغ کے امکان پر ان کے وقوع کو ترجیح دی۔

کیا دنیا میں ایک عقل صحیح بھی ایسی مل سکتی ہے جو شریعت کے اس فیصلہ کو غلط بتلائے؟ اللہ کی شریعت کا اصل اصول جلب مصالغ اور دفع مفاسد ہے۔ یعنی ہمیشہ فوائد حاصل کرنا اور مفاسد کو دور کرنا اور جب مصالغ کے ساتھ مفاسد بھی جمع ہو جائیں تو جس راہ میں مصالغ زیادہ ہوں اور خرابیاں کم، اسی کو اختیار کرنا۔ تمام احکام کا محور یہی اصل ہے پس اگر پہلی راہ اختیار کی جاتی اور خلیفہ کی اطاعت کے لیے خلیفہ کا جامع الشروط اور بطریق صحیح منتخب ہونا شرط قرار دے دیا جاتا تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا؟ نصب و انتخاب کے لیے نظام شرعی درہم برہم ہو چکا تھا۔ ہر دماغ میں حرص و دعویٰ اور ہاتھ میں تلوار تھی۔ یہی نتیجہ نکلتا کہ ایک عام طوائف المسلمو کی اور انار کی پھیل جاتی۔ ہر شخص یہ کہہ کر کہ خلیفہ اہل و مستحق نہیں ہے۔ بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ تمام امت میں خون اور موت کی وبا پھیل جاتی۔ شہروں کا کوئی محافظ نہ رہتا۔ آبادیوں کا کوئی حاکم نہ ہوتا۔ نہ مجرموں کو کوئی سزا دینے والا، نہ ڈاکوؤں سے کوئی بچانے والا۔ زکوٰۃ کس کو دی جاتی؟ جمعہ کون قائم رکھتا؟ سرحدوں کی کون حفاظت کرتا؟ تمام عالم اسلام ایک دائمی خانہ جنگی و بد امنی میں مبتلا ہو جاتا۔ امن و نظم ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا؟ دشمنان اسلام ہر طرف سے امنڈ آتے۔ ان کو روکنے کے لیے کوئی طاقت موجود نہ ہوتی۔ پس اگرچہ ایک نا اہل مسلمان کا خلیفہ ہو جانا برائی ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ برائی ہے کہ تمام ملک برباد ہو جائے۔ اسلام نے ملک و شرع کی حفاظت کو مقدم رکھا جو کلی مصلحت کا حکم رکھتی ہے اور نا اہل و فاقہ الشروط کا تسلط گوارا کر لیا۔ جس کا فساد جزئی فساد ہے۔

KITABOSUNNAT.  
COM

### حواشی

۱۔ حق یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدون صحیح بخاری کی شرح و تفسیر کا قرض اب تک امت کے ذمہ باقی ہے۔ بیشارت شروحوں اور حاشیوں کے بعد بھی یہ قول ویسا ہی صحیح ہے جیسا کہ ابن خلدون کے عہد میں تھا۔ اس کتاب کے علوم و دقائق کا کوئی احاطہ نہ کر سکا۔ ہر کتاب، ہر باب، ابواب کی ہر ترتیب اور ہر عنوان و ترجمہ، اس فقہ الارض و انجمنہ

الدہری کی فتاہت ربانی کی ایک آیت باہرہ و حججہ قاہرہ ہے۔ اسی مسئلہ خلافت کو سامنے لاؤ اور دیکھو، کس وقت نظر کے ساتھ محض ترتیب ابواب ہی میں اسلام کا نظام شرعی واضح کر دیا ہے اور ساری مشکلات حل کر دی ہیں؟ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ اسلام کا نظام مرکزیت اس بارے میں کیا ہے؟ تو پہلا باب "اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم" کا باندھا۔ اور "من اطاع اميرى فقد اطاعنى" (الخ) کی روایت درج کر کے بتلا دیا کہ مرکز کتاب اللہ ہے، رسول اللہ ہے اور پھر خلیفہ و امام ہے۔ "اولو الامر" خلیفہ کے سوا کوئی نہیں۔ اس کی اطاعت (بشرطیکہ کوئی خلاف شرع حکم نہ ہو) مثل خدا اور رسول کی اطاعت کے فرض ہے۔ پھر باب باندھا "الامراء من قريش" اور اس میں ابن جبر والی روایت لائے "ما القامو الدين"۔ جب تک قریش میں دین قائم رکھنے کی اہلیت رہے گی خلافت بھی انہی میں رہے گی۔ یعنی واضح کر دیا کہ ایک خاص مدت تک قریشی خلافت کی پہلے سے خبر دے دی گئی ہے مگر خلیفہ کا قریشی ہونا کوئی شرط اصلی و بشرعی نہیں۔ صرف پیش گوئی ہے اور "ما القامو الدين" کے ساتھ مشروط۔ اسکے بعد ایک نہایت ہی اہم اور دقیق نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے اور باب باندھا "اجرو من قضى بالحكمة"۔ انہوں اس باب کے ربط و ترتیب کی اصلی علت لوگ نہ سمجھے۔ منصب خلافت کے اثبات کے بعد یہ چیز سامنے آتی تھی کہ اعمال خلافت کی بنیاد کیا ہے؟ اور اس کا طریق کس منہاج سے ماخوذ ہے؟ امام صاحب واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیاد اس کی طریق "حکمت" پر ہے۔ یعنی انبیاء کرام کے طریق تربیت ام پر جو "سنت" کا اصلی اور وسیع مفہوم ہے اور جس کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں "حکمت" سے تعبیر کرتا ہے۔ ترجمہ باب میں اس پر قرآن سے دلیل بھی لائے "ومن لم يحكم بما انزل الله فلاولئك هم الفاسقون" حکم و قضا "ما انزل الله" کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر خلاف ہو تو فسق ہے "ما انزل الله" کتاب و سنت ہے "يعلمهم الكتاب والحكمة" پس ثابت ہوا کہ اعمال خلافت کی بنیاد حکمت و منہاج نبوت پر ہونی چاہیے۔ اس بارے میں جو زیادہ واضح و مفصل احادیث تھیں، وہ چونکہ ان کی شروط کے مطابق نہیں لی جاسکتی تھیں اور بنیاد استدلال کی صرف مرفوع ہی پر رکھتے ہیں اس لیے آثار و موقوفات بھی نہیں لے سکتے تھے۔ پس مشہور حدیث "لا حسد الا في الثنتين" (الخ) درج کر کے قضا بالقبلیت کی اہمیت و مطلوبیت واضح کر دی۔ جب یہ مقدمات طے ہو چکے تو اب دکھانا تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کس طرح امت پر فرض کر دی گئی ہے؟ پس باب باندھا السمع والطاعة للامام مالم تكن معصية" امت کا سننا اور اطاعت کرنا امام کے حقوق میں سے ہے۔ جو اس حکم کے کہ معصیت ہو۔ اس میں وہ تمام احادیثیں لائے ہیں جن میں صریح حکم موجود ہے کہ خلیفہ اہل ہویا تا اہل، جامع الشروط ہو یا فاقد الشروط، عادل ہو یا جائر، مکروہات کا حکم دے یا محبوبات کا، جب تک وہ مسلمان ہے، نماز قائم رکھتا ہے اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ کسی مسلمان کے لیے اس کی اطاعت سے باہر ہونا جائز نہیں اس کے بعد بالترتیب تین باب آتے ہیں۔ "من لم يسأل الامارة اعانة الله" و "درا" من سال الامارة و كل

الیہا۔ تیسرا ”ماہکروہ من الحورص علی الامارة“ حاصل ان تینوں عنوانوں کا یہ ہے کہ جہاں شارع نے امت کو خلیفہ و امام کی ضروری صفیں اور شرطیں بتلا دی ہیں، وہاں اس سے بھی روک دیا ہے کہ کوئی شخص خود امامت و سرداری کا خواہاں ہو اور اس کے لیے مقابلہ کرے۔ حتیٰ کہ عبدالرحمن بن سمرہ سے کہا ”جو اہل اور حق ہو اور اسی کا ساتھ دو۔ خود اپنے لیے خواہاں نہ ہو۔ اگر چہ اس کے لیے قسم بھی توڑنی اور کفارہ بھی دینا پڑے۔“ پس ان تمام ابواب کی یکے بعد دیگرے ترتیب سے واضح ہو گیا کہ اس بارے میں نظام شرعی کی اصلی ترتیب یہ ہے۔

(الف) امت کے لیے حسب نصوص ”واولی الامر منکم“ مرکز اجتماع و جماعت خلیفہ کا وجود ہے۔ اس کی

اطاعت فرض ہے۔

(ب) خبر دیدی گئی تھی کہ جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہے گی، خلافت پر قابض رہیں

گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(ج) بنیاد معاملہ خلافت کی ”حکمت“ پر ہے وہ حکمت کہ جو ”وعلیہم الكتاب والحکمة“

میں مضمون ہے۔ یہ نیا نبوت ہے اور اعمال و سنت نبوت ہی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ”حکمت“ ہے۔ پس ضرور ہے کہ خلیفہ کے تمام کاموں کی بنیاد سنت پر ہو۔ بدعت و احداث پر نہ ہو۔ یہی معنی خلافت ”علی منہاج النبوة“ کے ہیں۔

(د) جب خلافت منقذ ہوگئی تو تمام امت پر اس کی اطاعت فرض ہے فی ما احب و بکروہ۔ مالک

یؤمر بمعصية۔

(ه) امت کو چاہیے کہ اہل و اہل کو منتخب کرے۔ لیکن مستحق کو نہ چاہیے کہ خود خلافت کی خواہش

کرے۔ جس نے ایسا کیا، اللہ کے حضور شرمندگی پائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب لوگ خود خواہش نہ کریں گے اور حق انتخاب جمہور کو ہے تو کسی طرح بھی کش کش نہ ہوگی۔ نہ بہت سے دعویداروں میں باہم جھگڑا ہوگا۔ امن سکون کے ساتھ یہ معاملہ انجام پاجائے گا۔

یہ تمام صحیح نظام شرعی، جس کے علم و فہم کے لیے صرف صحیح بخاری ہی کافی ہے اور اسلام کی کوئی حقیقت

ہے جس کے لیے صحیح بخاری کافی نہیں؟ لیکن افسوس کہ نظام شرعی قائم نہ رہا۔ شوریٰ کی جگہ میدان جنگ میں خلافت کا فیصلہ ہوا اور محض تسلط و جبر سے دعویدار قابض ہونے لگے۔ چنانچہ پہلے ہی سے اس کی خبر دے دی گئی تھی۔

## نصوص سنت و اجماع امت

سب سے پہلے احادیث پر نظر ڈالنی چاہیے اگر وہی اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کی اور کوئی دلیل نہ ہوتی تو صرف یہی ایک بات بس کرتی تھی کہ آنے والے واقعات کی تمام تفصیلات کس طرح اول روز ہی بتلا دی گئیں؟ اور ایک ایک جزئی حالت کا کیسا کامل نقشہ صدیوں پہلے کھینچ دیا گیا؟ یہ معاملہ اس قدر یقینی اور ہر طرح کے شک و شبہ سے ماوراء ہے کہ اگر دنیا اس پر یقین لانے کے لیے تیار نہیں تو دنیا کے پاس ماضی کی جس قدر معلومات موجود ہیں ان میں سے کوئی بات بھی یقینی نہیں ہو سکتی۔ نہ تو اس دنیا میں سکندر نامی کوئی بادشاہ گزرانہ رومان نامی کوئی سلطنت قائم ہوئی، نہ ہم بیسویں صدی کے انسان اس کے لیے مجبور ہیں کہ پنولین کا وجود اور وائرلوی کی جنگ کا وقوع تسلیم کر لیں۔

بہر حال احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہونے والے واقعات پوچھنے سے معلوم تھے۔ ہر حالت اور ہر وقت کے لیے صاف صاف حکم دے دیا گیا تھا۔ احادیث کے اس حصہ کا نہایت دقیقہ نظر کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہر دور کی خاص حالت ہے اور اس لیے اسی کے مطابق خاص حکم ہے۔

سب سے پہلے وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں جن میں خلافت خاصہ وراثہ کا ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ خلافت ٹھیک ٹھیک طریق نبوت و سنت پر قائم ہونے والی تھی اس لیے امت کو وصیت کی ہے کہ نہ صرف ان کی اطاعت کی جائے بلکہ ان کی تمام اجماعی باتوں اور کاموں کو مثل اعمال نبوت کے ”سنت“ سمجھا جائے اور اس کی پوری طرح پیروی و اتباع ہی کی جائے۔

چنانچہ مشہور حدیث عمر باض بن ساریہ ”قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم، فوعظنا موعظتہ بلیغۃ، وجلت منها القلوب، وذرقت منها العیون فقبل ینا رسول اللہ ووعظنا موعظتہ مودع فاعهد الینا بعدہ۔ قال علیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعہ وان کان عبداً حبشیاً، وسترون من بعدی اختلافاً شدیداً فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المہدیین عوا علیہا بالنواجذ“ (ابن ماجہ وترمذی) اور حدیث ”خیر القرون قرلی ثم یلونہم (الخ) اور اما طبقتی وطبقۃ اصحابی فاهل علم وایمان“ (الخ) رواہ البغوی عن انس وامثالہا، اسی قسم میں داخل ہیں۔

خلاصہ ان کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو، اپنے امام کا حکم سنو اور مانو اگرچہ وہ ایک جھٹی غلام ہو اور دیکھو میرے بعد بڑے سخت اختلافات پڑنے والے ہیں۔ پس چاہیے کہ فتنوں سے بچو اور ہمیشہ میری سنت اور میرے بعد کے جانشینوں کی سنت پر کار بند رہو اور اس کو اس طرح مضبوطی سے پکڑ لو جیسے کوئی شخص دانتوں سے کوئی چیز پکڑ لیتا ہے اور فرمایا بہتر زمانہ میرا ہے پھر وہ جو میرے بعد کا ہے اور فرمایا: میرا اور میرے اصحاب کا طبقہ علم اور ایمان کا طبقہ ہے۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود کی حدیث۔ ”ما من نبی بعثہ اللہ فی امۃ قبلہ الا کان لہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتلون بامرہ، الخ (مسلم) میں بھی اسی عہد خلافت کا ذکر کیا گیا ہے۔

غرضیکہ اس پہلے دور کے لیے دو حکم دیے گئے ایک طاعت کا، دوسرا اقتداء اور پیروی کا۔ لیکن اس کے بعد وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں، جن میں خلافت کے دوسرے دور کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس دور میں پہلا حکم تو بدستور باقی رہا لیکن دوسرا حکم بالکل بدل گیا۔ یعنی اس دور کے خلفاء و سلاطین کی اطاعت کی تو ویسی ہی وصیت کی جاتی ہے جیسے پہلے دور کے لیے کی گئی ہے لیکن ان کے کاموں کی پیروی اور اقتداء کا حکم نہیں دیا جاتا بلکہ بتدریج ترک اقتداء و مخالفت کا حکم دیا جاتا ہے اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں جو لوگ خلافت پر قابض و مسلط ہوں گے، ان کی خلافت شریعت کے مطلوبہ نظام پر نہ ہوگی اور نہ ان کا چلن قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ ان میں اچھے بھی ہوں گے اور برے بھی اس لیے امت کو اب صرف اطاعت کا اور ان کی خلافت کے آگے سر جھکا دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ان کے طور طریقوں کی پیروی کرنے اور ان کے کاموں کو شرعی کام سمجھ لینے کا حکم نہیں دیا جاتا بلکہ اس بات کی بھی وصیت کی جاتی ہے کہ جب وہ لوگ برائیاں پھیلائیں تو جس کی طاقت جہاں تک کام دے برائیوں کے روکنے کی پوری کوشش کرے۔ ہاتھ سے کام لے، زبان کو حرکت میں لائے اور اگر یہ دونوں درجے نصیب نہ ہوں تو کم از کم دل ہی دل میں برائی کو برا سمجھے۔ و ذالک اضعف الایمان۔ لیکن برے کاموں کو ان کی حکومت کے دباؤ سے اچھا نہ سمجھ لے اور نہ ان کا ساتھ دے ”ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل“۔ عن ”عبادۃ بن الصامت۔ قال ”بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا والرة علينا، وان لانتازع الامر اهلہ، الا ان تروا کفرا بواحدکم فیہ من اللہ برهان“ (متفق علیہ)۔ عبادہ بن الصامت کہتے ہیں ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر بیعت لی کہ ہر حال اور ہر طرح کی زندگی میں امام کی اطاعت کریں گے۔ حکومت و سرداری کو اس کے کرنے والوں پر چھوڑ دیں گے اور کبھی اس

ہارے میں کوئی جھڑائیں کریں گے۔ الا یہ کہ بالکل کھلا کھلا کفر امام سے ظاہر ہو اور ایسی بات میں جس کے لیے اللہ کی کتاب میں حکم و دلیل موجود ہے تو اس وقت کسی کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت سے ندرک سکے گی۔ یعنی جب تک امام سے صریح کفر نہ مرز ہو، ہر حال میں اس کی اطاعت واجب ہے۔

خيار امتکم الذين تحبونهم ويحبونكم، وتصلون عليهم ويصلون عليكم  
وشوار امتکم الذين تفضونهم ويفضونکم وتلعنونهم ويلعنونکم“ قال لنا افلا لنا بلهم  
عند ذلك؟ قال ”لا“ ما قاموا فيکم الصلوة الا من ولى عليه وال فراه شيئاً من معصية  
الله فليكره ماياتى من معصية الله ولاينز عن يداً من طاعة، (رواه احمد ومسلم)

وعن حديفة انه (صلعم) قال“ يكون بعدى ائمة لا يهتدون بهدى  
ولا يستنون بسنتى وسيقوم فيکم رجال للوبهم للوب الشياطين فى جثمان انس.“  
قال قلت“ كيف اصنع يا رسول ان ادرکت ذالک؟“ قال تسمع وتطيع وان ضرب  
ظهرک واخذ مالک فاصم واطع“ (رواه مسلم و احمد)

یعنی فرمایا تمہارے بہتر حاکم وہ ہیں کہ انکی محبت تمہارے دلوں میں ہو اور تمہاری ان کے دلوں  
میں۔ تمہاری زبانوں سے ان کے لیے رحمت کی دعا نکلے اور ان کی زبانوں سے تمہارے لیے۔ اور  
بدترین حاکم وہ ہیں کہ تمہارے دلوں میں ان کی دشمنی ہو اور وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہوں تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ  
تم پر۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ایسے حاکموں سے ہم نہ جھڑیں۔ فرمایا نہیں۔ جب تک وہ تم میں  
نماز قائم رکھیں ان کی اطاعت ہی کرو۔ ہاں جو بات گناہ کی دیکھو اسے پسند نہ کرو۔ مگر امام کی اطاعت سے  
ہاتھ نہ کھینچو۔ نیز فرمایا میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو میرا طریقہ چھوڑ دیں گے اور میری سنت پر نہیں  
چلیں گے۔ عنقریب تم پر ایسے حکمران ہوں گے کہ ان کا جسم انسانوں کا ہوگا مگر دل شیطان کا سا۔ راوی  
نے پوچھا اگر ہم نے ایسا زمانہ پایا تو کیا کریں۔ فرمایا سنو اور اطاعت کرو اگر وہ تمہاری پیٹھ پر تازیانے  
لگائیں اور تمہارا مال چھین لیں جب بھی ان کی سنو اور اطاعت کرو۔

ستكون بعدى الزة وامور تنكرونها. قالوا فما تامرنا؟ قال تودون الحق  
الدى عليكم وتسالون الله الذى لكم“ (متفق عليه) عن انب مسعود، واخرجه  
ايضاً الحرث بن وهب و اورده الحافظ فى التخليص، وعن جابر بن عتيك مرفوعاً  
عند ابى داؤد بلفظ سياتيكم ركب مفضون، فاذا توكم فرحبوا بهم و خلوا بينهم  
وبين ما يفتنون. فان عللوا فلا نفسهم، وان ظلموا فعليهم

وعن وائل بن حجر. قال سمعت رسول الله صلعم ورجل يسأله فقال ارايت



ان کان علينا امرء یمنعونا حقنا ویسألونا حقهم قال " اسمعوا واطیعوا فانما علیهم ما حملوا وعلیکم ما حملتم (مسلم و الترمذی و صحیحہ)

"علی المرء المسلم السمع والطاعة فی ما أحب وکره الا ان یؤمر بمعصیة

فان امر بمعصیة فلاسمع ولاطاعة" (شیخان وغیرہما عن ابن عمر)

سب کا خلاصہ وہی ہے جو اوپر گزر چکا۔ آخری روایت میں فرمایا ایک مسلمان کا فرض ہے کہ خواہ گوارا ہو یا ناگوار، مگر امام کا کہا سننے اور ماننے۔ ہاں اگر وہ ایسا حکم دے جس کی تعمیل میں گناہ ہو تو پھر اس حکم میں نہ تو سنتا ہے اور نہ مانتا۔

بڑی سے بڑی مخلوق کی خاطر بھی خدا کا چھوٹے سے چھوٹا حکم نہیں ٹالا جاسکتا اور نہ مخلوق کی خاطر خالق سے نافرمانی کی جاسکتی ہے۔ یہ اسلام کا، اور دراصل دنیا کی تمام سچی تعلیموں اور سچے انسانوں کا عالمگیر قاعدہ کلیہ ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ صدقات و زکوٰۃ وغیرہ مالیات کی ادائیگی کی نسبت حکم دیا گیا کہ اگرچہ وصول کرنے والے حکام ظالم و جاہر ہوں یا بیت المال کا روپیہ ناجائز طور پر خرچ کر رہے ہوں لیکن اگر امام کی طرف سے مامور ہیں تو ان کی اطاعت ہی کرنی چاہیے۔ جس شخص نے زکوٰۃ ایسے عامل کو دے دی اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ بلاشبہ قوم کو کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے عامل معزول کیے جائیں لیکن جب تک معزول نہ ہوں نظام شریعت و حکومت کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ بشر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا ان قومنا من اصحاب الصدقة یعتدون علینا اعمال صدقة لینے میں ہم پر ظلم کرتے ہیں کیا حق سے زیادہ نہ دینے میں ان کا مقابلہ کریں؟ فرمایا نہیں (ابوداؤد) سعد بن وقاص ہی روایت میں فرمایا۔ اذفعوا الیہم ما صلوا

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عمر کی نسبت ہے کہ کسی نے پوچھا زکوٰۃ کسے دیں؟ کہا وقت کے حالکوں کو۔ سائل نے کہا۔ "اذا یغفلون بہا الثیابا وطیباً" وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور زینت میں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ فرمایا "وان" اگرچہ ایسا کرتے ہوں مگر زکوٰۃ انہی کو دو۔

اسی بنا پر محدثین نے باب باندھا ہے "ہواء رب المال بالدفع الی السلطان مع العدل والجدور" کما فی المنتقى "یعنی صاحب مال نے جب اپنی زکوٰۃ عمال کے حوالے کر دی تو وہ شرعاً بری الذمہ ہو گیا اگرچہ وہ ظالم و جاہر ہوں اور اسی لیے جمہور فقہاء کا بھی یہی مذہب قرار پایا کہ اگر حکام جور کو زکوٰۃ دے دی گئی تو ادا ہوگئی۔ ائمہ اہل بیت و معتز نے بھی قولاً و فعلاً اس سے اتفاق کیا جیسا کہ حضرت امام باقر علیہ و علی آہانہ السلام سے اصول میں منقول ہے اور اسی لیے محققین امامیہ و فقہاء زیدیہ بھی اس فیصلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں۔



## حواشی

۱۔ احادیث کا یہ حصہ نہایت اہم اور غور طلب ہے۔ مختلف حدیثوں میں مختلف دوروں اور لوگوں کا ذکر ہے۔ اس لیے احکام بھی مختلف ہوئے۔ اس نکتہ پر جس کی نظر نہ گئی وہ احکام و عقائد کو مختلف و متضاد دیکھ کر یا تو حیران رہ گیا یا سخت غلطیوں سے دوچار ہوا۔ عہد نبوت سے لے کر آخر تک مختلف دور آنے والے تھے۔ ہر دور کے خصائص و حالات دوسرے سے مختلف تھے۔ پس ان کے احکام میں بھی اختلاف ضروری تھا۔ پوری وقت نظر کے ساتھ احادیث کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پہلے ان کے باہمی مشترکات، مختلفات کو الگ الگ کر دینا چاہیے پھر ہر حدیث اور حکم کو اس کی صحیح جگہ دینی چاہیے ایسا نہ کرنے سے لوگوں کو بڑی بڑی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ بہتوں کو یہ لغزش ہوئی کہ ”اطاعت“ اور ”اقتداء“ کا فرق نہ سمجھے۔ جن حدیثوں میں ”اقتداء“ کی ممانعت بلکہ خلاف کرنے کا حکم پایا ان کو منع اطاعت اور جواز خروج پر محمول کر لیا۔ خوارج اور معتزلہ کے ایک گروہ کو یہی دھوکا ہوا ایک دوسری جماعت نے یہ غلطی کی کہ حکم اطاعت کو عام اور مطلق سمجھ لیا اور منع اقتداء و تاسی اور وجوب امر بالمعروف نے جو تخصیص کر دی تھی وہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ یعنی اس دھوکے میں پڑ گئے کہ جب امراء و حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، خواہ ان کے اعمال کیسے ہی خراب ہوں تو پھر چاہیے کہ نہ کسی برائی پر ٹوکیں، نہ منکرات کے خلاف جدوجہد کریں۔ ہر حال میں چپ چاپ بیٹھ کر اطاعت کرتے رہیں۔ یہ جو صدیوں سے علماء و مشائخ نے اصحاب اقتدار کے خلاف امر بالمعروف یک قلم ترک کر دیا ہے تو نفس خادع ان کو بھی یہی دھوکا دے رہا ہے۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے۔ ان لوگوں نے چونکہ ”اطاعت“ اور ”اقتداء“ کا فرق نہیں سمجھا اور دیکھا کہ پادشاہوں اور امیروں کو برائی پر ٹوکنے اور ان کے خلاف حق کے اعلان میں بڑی بڑی مصیبتیں پھیلنی پڑتی ہیں۔ اس لیے اس دھوکے میں پڑ گئے کہ یہی مصائب فتنہ ہیں۔ پس اس فتنہ سے بچنا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل میں کوئی تیز باقی نہ رہی۔ تمام زبانیں گونگی اور تمام دل مردہ ہو کر رہ گئے۔

حالا نکل دونوں جماعتوں نے ٹھوک کھائی۔ دونوں نے حدیثوں کا صحیح مورد اور محل نہ سمجھا۔

ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا قومی پادشاہ مان لیں اور ایک پادشاہ کی جیسی فرمانبرداری رعایا کو کرنی چاہیے ٹھیک ٹھیک ویسی ہی فرمانبرداری بجالائیں۔ کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے۔ اس کا نام ”اطاعت“ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو اپنے دینی و اخلاقی اعتقاد و عمل میں پیشوا مان لینا اور راستی و ہدایت کے اعتبار سے اس کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنالینا اور اس کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرنا، اس کا نام ”اقتداء“ اور ”تاسی“ ہے۔ دونوں صورتیں الگ الگ ہیں۔ بلاشبہ ”اطاعت“ ایک عام حالت ہے اور اس میں ”اقتداء“ کی حالت بھی داخل ہے لیکن ”اقتداء“ اطاعت سے زیادہ خاص ہے اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت

اقتداء بھی ہو۔ احادیث میں خلفاء راشدین کی نسبت امت کو ”اطاعت“ اور ”اقتداء“ دونوں کا حکم دیا گیا لیکن بعد کے خلفاء و سلاطین کو صرف ”اطاعت“ کا مستحق بتلایا ”اقتداء“ کا نہیں۔ کیونکہ معلوم تھا کہ ان کے کام اچھے نہ ہوں گے شریعت و عدالت سے منحرف ہو جائیں گے اور چونکہ نظام جماعت کے قیام کے ساتھ احکام کتاب و سنت اور عدل و صداقت کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا۔ اس لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ہر حال میں باقی رہا۔ یعنی حکم دیا گیا کہ ایسے وقتوں میں سلطان اسلام کو اپنا امام مان کر پوری اطاعت کرو لیکن پادشاہ کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ سفید کو سیاہ اور دن کو رات مان لو، حق حق ہے، باطل باطل۔ برائی جب دیکھو، ٹوکو۔ ظلم جب کیا جائے روکو اس کام میں ایک پادشاہ اور ایک مزدور دونوں برابر ہیں۔ لا طاعة للمخلوق فی معصیة المخلوق۔ قاعدہ کلیہ ہے اور قواعد بالحق و قواعد بالظن۔ (۱۰۳: ۳) حکم عام و مطلق۔ کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کی جاسکتی جس میں خالق کے حکم کی نافرمانی کرنی پڑے اور یہ جو جابجا کہا گیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے تو یاد رہے کہ ”اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے نہ کہ ”اقتداء“ نہ کرنے میں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں۔ یعنی خلیفہ اسلام سے بغاوت نہ کرو اس میں جمعیت امت کے لیے بڑا ہی فتنہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ برائی کی مخالفت اور حق کے اعلان میں فتنہ ہے۔ حق کا اعلان تو ہمیشہ اور ہر حال میں دنیا کے لیے نعم و امن ہے۔ وہ کبھی فتنہ نہیں ہو سکتا۔ اگر حق کی پکار فتنہ ہو جائے تو پھر نظام ہستی کس بنیاد پر قائم رہے؟ و لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط (۷۱: ۲۳)

## اذا بویع الخلیفتین فاقتلوا اخرهما

اگر ایک خلیفہ کی حکومت جم چکی ہے اور قائم ہے اور دوسرا مدعی کھڑا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ باغی ہے فرمایا اسے قتل کر دو۔ اس کی زندگی تمام امت کے نظم و امن کے لیے فتنہ ہے وہ امت میں پھوٹ ڈالنا اور جھے ہوئے انتظام کو درہم برہم کر دینا چاہتا ہے۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ (۱۹۱:۲)

عن عرو لجه الاشمعی قال۔ سمعت صلعم یقول ” من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوه“ (احمد و مسلم)۔

اسی لیے جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ خلیفہ خواہ اہل ہو یا نااہل لیکن اگر اس کی حکومت قائم ہے تو جو اس پر خروج کرے، اس کا حکم باغی کا ہوگا اگرچہ کتنا ہی افضل اور جامع الشروط ہو۔ اس سے لڑنا اور اس کی جماعت کو قتل کرنا جائز ہے بشرطیکہ تبلیغ و دعوت اور دفع شکوک کے بعد بھی باز نہ آئے۔ ایک گروہ علمائے کہا کہ نہ صرف جائز ہے بلکہ بہ حکم لَفَقَاتِلُوا الَّذِیْ تَبَغَّیْ (۹:۳۹) واجب ہے۔ “ و قد حکمی فی البحر عن العترة جمیعا ان جهادهم الفضل من جهاد الکفار الی دیارهم، اذ فعلهم فی دار الاسلام کفعل الفاحشة فی المسجد“ (نیل الاوطار۔ جلد ۵ ص ۸۰) یعنی امام ائمہ اہل بیت و عترتہ سے منقول ہے کہ ایسے باغیوں سے جہاد کرنا کفار پر حملہ کرنے سے بھی افضل ہے۔

مصلحت و حکمت اس حکم کی ظاہر ہے۔ اگر اول روز ہی سے دعویٰ اور خروج کا دروازہ بند نہ کرو یا جاتا تو کوئی بہتر سے بہتر اسلامی حکومت بھی خروج و شورش سے محفوظ نہ رہ سکتی۔ ایک جامع الشروط خلیفہ کی موجودگی میں بھی صدا و دعویٰ ارٹھ کھڑے ہوتے اور کہتے کہ جمع الشرائط و اہل بیت میں ہم زیادہ احق و افضل ہیں۔ اوصاف و فضائل کا قطعی فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ افضل و مفضول کے امتیاز کے لیے کوئی قطعی معیار ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ ہمیشہ کشت و خون کا ہزار گرم رہتا اور امت کا نظام جمعیت کبھی نہ سدھرتا۔ پس ناگزیر تھا کہ خلافت قائمہ کی موجودگی میں ہر طرح کے دعوے کو بغاوت و جرم قرار دے دیا جائے اور اس کے لیے ایسی سزا جو جزیہ کی جائے جو سخت سے سخت سزا ہو سکتی ہے یعنی قتل۔ ایک انسان کو قتل کر دینا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ ہزاروں انسان قتل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حکم کی علت کی طرف واضح اشارہ کر دیا گیا کہ ”یرید ان یشق عصاکم“۔

یہ مضمون مختلف الفاظ و اسناد سے صحاح میں مروی ہے۔ ہم نے صرف ایک روایت پر اختصاراً

اکتفا کیا ہے۔



## اجماع امت و جمہور فقہاء و اعلام

اُمراء ہوا میری حکومت جبر و استبداد کے ساتھ قائم ہوئی اور اس وقت ایک جم غفیر صحابہ کرام و ائمہ اہل بیت نبوت کا موجود تھا۔ عہد عباسیہ کی پوری پانچ صدیاں گزر گئیں اور یہی زمانہ تمام علوم شرعیہ کی تدوین و ترتیب کا ہے۔ تمام ائمہ و اعلام اور فقہائے مذاہب اسی عہد میں پیدا ہوئے اور عقائد و مسائل نے آخری ترتیب و تنظیم پائی۔ لیکن ان تمام عہدوں میں سب کا اتفاق اسی اعتقاد و عمل پر رہا۔ عقائد ضرور یہ اور ارکان اربعہ کے بعد شاید ہی کسی اسلامی اعتقاد پر اس درجہ محکم و یقینی اجماع و تعامل امت ثابت کیا جاسکے۔

صحابہ کرام و ائمہ تابعین کا حال معلوم ہے۔ مروان مدینہ کا گورنر تھا اور حضرت ابو ہریرہؓ مسجد نبوی میں مؤذن تھے۔ مروان کی عبادت سے بدذوقی کا یہ حال تھا کہ سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا اور مقتدیوں کو شرکت کا موقع دینا بھی اس کی جلد بازی پر نہایت شاق گزرتا تھا۔ سورہ فاتحہ ختم کرتے ہی بلاسکتے کے قراۃ شروع کر دیتا۔ حالانکہ احادیث میں آمین کہنے کی نہایت درجہ فضیلت وارد ہے۔ ”لنمن وافق تامینہ تامین الملاحکہ غفرلہ مالمقدم من ذنبہ۔“ (بخاری) ابو ہریرہؓ اس سے وعدہ لے لیتے۔ لافتنی بامین قرات میں ایسی جلد بازی نہ کرو کہ میری آمین ضائع جائے لیکن نماز اسی کے پیچھے پڑھتے اور اس کی اطاعت سے انکار نہ کرتے۔ (بخاری)

لوگ ان کی پادہ گوئی سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ عید کے دن نماز کے بعد ہی جمع منتشر ہو جاتا۔ خطبہ کا لوگ انتظار نہ کرتے۔ یہ حال دیکھ کر مروان نے ایک مرتبہ چاہا کہ عید کے دن نماز سے پہلے خطبہ دیدے تاکہ نماز کے انتظار کی وجہ سے لوگوں کو مجبوراً خطبہ سننا پڑے حالانکہ یہ صریح سنت کے خلاف تھا۔ سنت ثابتہ خطبہ عید کے بارے میں یہی ہے کہ نماز پہلے ادا کی جائے پھر خطبہ دیا جائے۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اس پر فوراً ایک شخص نے ٹوکا اور حضرت ابوسعید خدریؓ نے ”من رای منکم منکرأ فلیغورہ“ نسخ والی روایت بیان کی۔

اسی بے شمار باتیں کی جاتی تھیں۔ صحابہ کرامؓ نہایت بے باکی سے امر بالمعروف کا فرض ادا کرتے اور ہمیشہ ٹوکتے۔ لیکن خلیفہ انہی کو ماننے اور اطاعت انہی کی کرتے۔ کسی صحابی نے بھی اطاعت

سے پہلے اس کی جستجو نہ کی کہ خلیفہ میں ساری شرطیں خلافت کی پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اگر اس کی جستجو کرتے تو سب سے پہلی شرط یعنی بطریق انتخاب شرعی و شوری منتخب ہونا ہی مفقود تھا۔ باقی شرطیں تو سب اس کے بعد کے دیکھنے اور جانچنے کی ہیں۔

حضرت سیدنا بعین حضرت سعید بن المسیبؓ کہا کرتے تھے۔ بنی مروان انسانوں کو بھوکا مارتے اور کتوں کو کھلاتے ہیں اور لوگ ان کے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم و شدائد بھی سہتے مگر ساتھ ہی بہ حیثیت سلطان اسلام کے اطاعت بھی انہی کی کرتے۔

مامون و معتصم کے عہد میں بدعت اعتزال اور قول بہ علق قرآن کی وجہ سے ایک فتنہ عظیم برپا ہوا۔ علماء ستف پر جو جو مظالم و شدائد ہوئے معلوم ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اسی کوڑوں کی ضرب اور برسوں تک قید خانے میں رہنا گوارا کر لیا اور مامون و معتصم کی دعوت بدعت کی پیروی نہ کی لیکن اطاعت کا مستحق انہی کو سمجھا اور اپنے نام و وصیت میں لکھا تو یہی لکھا۔

والدعاء لائمة المسلمين بالصلاح والاعتقاد عليهم بالسيف والانتقال هم في الفتنة“ كذا نقل عنه ابن الجوزي في سيرة.

حافظ عسقلانی نے ابن التین کا ایک قول نقل کیا ہے۔ ”قد اجمعوا انه (ای الخلیفہ) اذا دعا الي كفر او بدعة انه يقام عليه“ یعنی علماء نے اس پر اجماع کیا کہ اگر خلیفہ کفر اور بدعت کی طرف بلائے تو اس پر خروج کرنا چاہیے۔ پھر اس قول کی نسبت لکھتے ہیں:

”ما ادعاه من الاجماع على القيام في ما اذا دعا الي البدعة مردود الا اذا حمل على بدعة تودي الي صريح الكفر والا فقد دعا المامون والمعتصم والواقى الي بدعة القول بخلق القرآن وعاقبو العلماء من اجلها بالقتل والضرب والعبس والنواع الاهانة ولم يقل احد بوجوب الخروج عليهم بسبب ذلك ودام الامر بضع عشرة سنة حتى ولي المتوكل الخلافة فابطل المحنة (فتح ۱۳: ۱۰۳)

یعنی جو ابن التین نے کہا کہ اگر خلیفہ بدعت کی طرف بلائے تو اس پر خروج کرنا جائز ہے اور اس پر اجماع ہو چکا ہے تو یہ قول مردود ہے لہذا یہ کہ بدعت سے اس کا مقصود ایسی بدعت ہو جو صریح طور پر کفر تک پہنچ جاتی ہو کیونکہ یہ معلوم ہے کہ مامون، معتصم، الواقی، تینوں خلیفوں نے بدعت علق قرآن کی طرف دعوت دی اور اس کی وجہ سے علماء ستف کو طرح طرح کے مصائب و شدائد جھیلنے پڑے، قتل ہوئے، پیٹے گئے، قید کیے گئے لیکن پھر بھی کسی نے ان پر خروج واجب نہیں بتلادیا اور برابر ان کی اطاعت کرتے رہے حتیٰ کہ تقریباً دس برس تک یہی حالت رہی۔ خلیفہ متوکل نے تخت نشین ہو کر اس مصیبت کو دور کیا۔

آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت و اطاعت کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا عہد سلف کے مسلمانوں نے اس پر عمل کر کے دکھلادیا کہ اس کا اصلی مفہوم و مقصد کیا ہے؟ وہ اپنے طرز عمل میں احکام خلافت کے ہر ککڑے اور ہر قسم کی ایک عملی تفسیر و شرح تھے۔ گذشتہ فصول میں ان احادیث پر نظر ڈال چکے ہیں جن میں آنے والے وقتوں کی نسبت امت کو احکام دیے گئے ہیں۔ خلافت راشدہ کا عہد قتل و فسادوں سے محفوظ تھا لیکن اس کے بعد جو سلسلہ خلافت شروع ہونے والا تھا وہ اپنے متضاد خصائص و حالات کی وجہ سے امت کے لیے ایک بڑی ہی سخت کش مکش اور اتلا رکھتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں سیاہ بھی تھا اور سفید بھی، نور بھی تھا اور ظلمت بھی، حق بھی تھا اور باطل بھی۔ جب و بغض و جبر و وصل، ترک و طلب، اطاعت و مخالفت دونوں چیزیں ایک ہی وجود میں جمع ہو گئی تھیں۔ اور حکم شریعت یہ تھا کہ بہ یک وقت دونوں کو بھاؤ اور اپنی اپنی جگہوں پر دونوں ہاتھیں بجالاؤ۔ ایک طرف تو اس پر زور دیا گیا کہ وہ خلیفہ و امام ہیں اس لیے واجب الاطاعت ہیں۔ جب تک ان کے عمل سے کفر صریح ظاہر نہ ہو، ان کی فرمانبرداری سے منہ نہ موڑو۔ دوسری طرف یہ بھی کہہ دیا گیا کہ ان کے اعمال اچھے نہ ہوں گے پس اطاعت کرو مگر بیروی و اقتداء نہ کرو۔ برائیوں کی طرف بلائیں تو ہاتھ سے، زبان سے، دل کے اعتقاد سے، جس طرح بھی بن پڑے، پوری طرح مخالفت کرو اور ان کے قہر و تسلط سے دب کر حق کا ساتھ نہ چھوڑو۔ غور کرو! معاملہ کس درجہ کشمکش اور جذبات انسانی کے لیے کیسا بڑا امتحان تھا؟

انسان ایک وقت میں ایک ہی جذبہ کام میں لاسکتا ہے یا محبت کرے یا دشمنی۔ یا اطاعت کرے یا نافرمانی۔ جس کو اطاعت کا مستحق سمجھے گا اس کی ہر بات اس کی نظروں میں محبوب ہو جائے گی جس کو برا سمجھے گا..... اس کی فرمانبرداری کبھی اس کے نفس کو گوارا نہ ہوگی۔ لیکن یہ وہ منزل عمل تھی جس میں ایک ہی وجود مدح و مذموم اور محبوب و مبغوض دونوں صورتیں رکھتا تھا۔ ایک ہی انسان کے آگے جھکتا بھی تھا اور پھر اسی کے سامنے سرکشی بھی کرتی تھی۔ البتہ جھکنے کا موقع دوسرا تھا، سرکشی کی گھڑی دوسری۔ جذبات و عواطف کے لیے سخت آزمائش اس میں آ پڑی تھی کہ ہر جذبہ اپنے صحیح موقع پر کام میں لایا جائے ورنہ ذرا سی بے اعتدالی بھی سخت گمراہی و ہلاکت کا موجب ہو جاتی۔ اطاعت کیشی میں اگر بے اعتدالی ہوتی تو وہ اقتداء اور تاشی ہو جاتی جس کا نتیجہ باطل پرستی اور حق سے انحراف تھا۔ عدم اقتداء اور امر بالمعروف میں اگر بے اعتدالی ہوتی تو وہ خروج و بغاوت تک پہنچا دیتی، جس کا نتیجہ بدامنی و خونریزی ہوتا اور سخت معصیت و فسق کا وقوع۔ اس تیرہ سو برس میں کتنے ہی فتنے صرف اسی بے اعتدالی اور افراط و تفریط سے پیدا ہوئے، کتنوں ہی نے جوش حق پرستی میں بغاوت و خروج کر کے جمعیت امت و استحکام خلافت کو نقصان پہنچایا اور

کتنوں ہی نے افراتو افرات کیشی میں حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر امت کا نظام حق و عدل درہم برہم کر دیا۔

دنیا میں کوئی قوم نہیں جس کے اجتماعی اعمال کی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر مل سکے کہ ایسے سخت و نازک حکم پر عمل کیا گیا ہو اور پوری کامیابی کے ساتھ اس کے دونوں پہلوؤں کو سنبھالا گیا ہو۔ لیکن عہد صحابہ و سلف کے مسلمانوں نے صدیوں تک عمل کر کے ثابت کر دیا کہ سچائی اور اخلاق کی کوئی عملی شکل ایسی نہیں جو بیرون اسلام کے لیے مشکل ہو۔ انہوں نے نہ صرف اس پر عمل کیا، بلکہ پوری کامیابی کے ساتھ اس اخلاقی امتحان سے عہدہ برا ہو کر نکلے۔ انہوں نے ایک ہی وقت میں دونوں متضاد عمل کر دکھائے۔ اطاعت بھی کی اور مخالفت بھی لیکن اطاعت اسی بات میں کی جو مستحق اطاعت تھی اور مخالفت وہیں کی جہاں مخالفت کرنی تھی۔ ”اطاعت“ اور ”اقتداء“ کے اس نازک فرق کو جس کو فلسفہٴ اخلاق بڑی بڑی دقیقہ سنجیوں کے بعد حل کر سکتا ہے، انہوں نے اپنی عملی زندگی کی سادگی سے حل کر دکھایا اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ اخلاق کے فلسفہ کے لیے جو چیز سب سے زیادہ مشکل ہے وہی ایک مومن کے عمل کے لیے سب سے زیادہ آسان ہے!

قومی حکومت کی اطاعت اور فرمانبرداری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے جو صحابہ و تابعین نے بنو امیہ کے امراء کی دورِ ظلم و جور میں کی! اور ان کے بعد علماء سلف نے بنو عباس کے دعاوتِ بدعت کے زمانے میں کی! ہر طرح کے مظالم سے۔ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلیں، قید کیے گئے، دڑوں سے مارے گئے، قتل ہوئے مگر پھر بھی اطاعت سے ہاتھ نہ نکھا اور ہمیشہ یہی کہتے رہے۔ ”ینصب لکل غادر لواء یوم القیامہ ونحن بائعناہم“ وہ جو فرمایا تھا کہ ”قید شہر“ بالشت بھرا اطاعت سے الگ نہ ہو، سو واقعی ویسا ہی عمل کر کے دکھادیا۔

مگر ساتھ ہی استقامت حق اور امر بالعرف و دعوت الی اللہ کا بھی یہ حال تھا کہ نہ تو عبد الملک کی بے پناہ تلوار اس پر غالب آ سکتی تھی نہ حجاج کی خون آشامی اور نہ مامون و معتصم کی قہرنایت۔ قدم جب اٹھتا تھا تو حق کی طرف، زبان جب کھلتی تھی تو سچائی کے لیے اور دل میں کسی کی گنجائش نہ تھی مگر عشق کتاب و سنت کی۔ انہوں نے جس طرح اس حکم کی پیروی کی کہ:

”تسمع و تطیع وان ضرب ظہرک و اخذ مالک فاسمع و اطع رواہ مسلم  
 ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس فرمان کی بھی کی کہ فان امر بمعصیۃ فلاسمع ولا طاعة“  
 اور من رای منکم منکر اللہ فیہرہ بیدہ فان لم یستطع فلیسانہ، او ان لم یستطع فلیقلبہ  
 وذلک اضعف الایمان. (رواہ مسلم)



حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی پیٹھ پر لوجلا دتا زیادہ مار رہے تھے۔ خود لمٹھم سر پر کھڑا تھا۔ تمام پیٹھ سے خون کے فوارے بہ رہے تھے اور یہ سب کچھ صرف اتنی بات کے لیے ہو رہا تھا کہ قرآن کی نسبت ایک ایسے سوال کا جواب دے دیں جس کا جواب اللہ کے رسول اور اس کے اصحاب نے نہیں دیا ہے اور نہ دینے کا حکم دیا ہے۔ وہ سب کچھ سہہ رہے تھے مگر جواب نہیں دیتے تھے۔ اگر کوئی صدا نکلتی بھی تھی تو یہی نکلتی "اعطونی شیشا من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول" "وڑے مارنے سے کیا ہوتا ہے؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ثابت کر دکھاؤ تو اقرار کر لوں۔ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے جس کے آگے اتباع و اقتداء کا سر جھک سکے۔

ماقصہ سکندر و دارانہ خواندہ ایم

از ماجز حکایت مہر و وفا پیرس



حواشی

ساتھ کرہ الحفاظ امام ذہبی ۱: ۱۷۷

## سنی اور شیعہ دونوں متفق ہیں

اسی طرح تمام ائمہ اہل بیت کا زمانہ خلفا بنو امیہ و عباسیہ کے عہدوں میں گزرا۔ یہ معلوم ہے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف اپنے ہی کو سمجھتے تھے نہ کہ بنو امیہ و عباسیہ کو۔ بائیں ہمہ کسی نے بھی ان کے خلاف خروج نہ کیا اور نہ اطاعت سے انکار کیا۔ سب اسی پر متفق ہوئے کہ حکومت ان کی قائم ہو چکی ہے، اس لیے سلطان وقت وہی ہیں۔

خاندان اہل بیت میں سے جس کسی نے خروج کیا ائمہ نے برابر اپنی مخالفت ان سے ظاہر کی۔ جیسا کہ حضرت زید کے خروج اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے انکار سے ثابت و معلوم ہے۔

حضرت امام علی رضا کو مامون الرشید نے اپنا ولی عہد قرار دیا۔ امام موصوف نے ولی عہدی قبول کر لی۔ یعنی تسلیم کر لیا کہ مامون خلیفہ ہے اور اس کو اپنے استخلاف اور ولی عہدی کا حق پہنچتا ہے اگر وہ خود خلیفہ نہ تھا تو دوسرے کو ولی عہدی کیوں کر مل سکتی تھی!

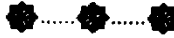
ائمہ اہل بیت کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود نہیں کہ انہوں نے لوگوں کو بنو امیہ و عباسیہ کی اطاعت سے روکا ہو۔ برخلاف اس کے کتب حدیث امامیہ (مثلاً اصول کافی وغیرہ) میں ایسی تصریحات موجود ہیں کہ ہا وجود ان ظہار استحقاق خود و شکوہ غصب و تعدی و عدم اطاعت خروج سے ہمیشہ مانع رہے۔

سب سے زیادہ قاطع اور فیصلہ کن اسوۂ حسنہ اس بارے میں خود حضرت علی علیہ السلام کا ہے۔ حضرات امامیہ انکی خلافت کو منصوص تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انکی موجودگی میں اور کوئی جائز خلیفہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بائیں ہمہ ظاہر ہے کہ یکے بعد دیگرے تین خلیفہ ہوئے اور حضرت علیؑ نے نہ تو خروج کیا، نہ بیعت سے انکار کیا، نہ علیحدگی اختیار کی بلکہ متصل بیس برس تک ان کا یہی طرز عمل قائم رہا۔ اس سے بڑھ کر قاطع و فاضل دلیل اس بات کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب امت ایک سلطان پر مجتمع ہو جائے تو پھر کسی طرح بھی اس کی مخالفت جائز نہیں اور اس کی اطاعت کرنا ہر فرد پر واجب ہے؟ جب ایک خلیفہ و امام منصوص من اللہ کے لیے انکار جائز نہ تھا تو عام امت کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے؟

غرضیکہ اس بارے میں اہل سنت و امامیہ دونوں متفق ہیں۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح

ہوگئی کہ حضراتِ امامیہ اور اہل سنت میں مسئلہ خلافت کی نسبت جو مشہور اختلاف ہے، وہ صرف پہلی صورت میں ہے نہ کہ دوسری صورت میں۔ یعنی اس بارے میں ہے کہ اگر امتِ خلیفہ و امام منتخب کرے تو کس کو اور کیسے کو منتخب کرے؟ شیعہ کہتے ہیں کہ اس کا استحقاق صرف ائمہ اہل بیت کو ہے وہی امام ہو سکتے ہیں۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شرط ضروری نہیں۔

لیکن اگر اصلی نظام باقی نہ رہا ہو اور غلبہ و تسلط سے کوئی شخص اسلام کی مرکزی سلطنت پر قابض ہو گیا ہو تو اس کی اطاعت پر جس طرح اہل سنت کی تمام جماعتیں متفق ہیں، ٹھیک اسی طرح شیعہ بھی متفق ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک خلافت کی تمام شرطیں صرف خلفاء راشدین ہی میں جمع تھیں اور انہیں کا انتخاب صحیح نظام شرعی کے مطابق ہوا، ان کے بعد پھر نہ ہوا۔ امامیہ کے نزدیک ابتداء ہی سے نہ ہوا۔ لیکن اطاعت دونوں عہدوں میں اہل سنت نے بھی ضروری قرار دی۔ شیعوں نے بھی ضروری قرار دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک قائم و نافذ اسلامی سلطنت کی اطاعت پر سنی و شیعہ دونوں متفق ہیں۔ یہی حال زید یہ وغیرہ فرقوں کا ہے۔



## بعض کتب مشہورہ عقائد وفقہ

تمام اسلامی مدرسوں میں صدیوں سے جو کتابیں پڑھی پڑھائی جا رہی ہیں، ان سے بعض کی عبارتیں ہم نقل کریں گے۔  
شرح مقاصد میں ہے:

”واما اذالم يوجد من يصلح ذلك‘ اولم يقدر على نصبه لاستيلاء اهل الباطل وشوكة الظلمة وارباب الضلال، فلا كلام في جواز تقليد القضاة تنفيذ الاحكام والقامة الحدود وجميع ما يتعلق بالامام من كل ذي شوكة“  
اور شرط امام بیان کر کے لکھتے ہیں:

”نعم اذالم يقدر على اعتبار الشرائط جازا الابتاء للاحكام المتعلقة بالامامة على كل ذي شوكة يقتدر تغلب او استولى“  
اور اسی میں ہے:

”فان لم يوجد من قریش من يجمع الصفات المعتره، ولي كنانى، فان لم يوجد، فرجل من ولد اسماعيل، فان لم يوجد فرجل من العجم.“  
مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے:

”واما الخروج عليهم وقاتلهم فمحرم وان كانوا فسقة ظالمين.“  
اور ”حدیث من اتاكم وامركم جميع على رجل واحد“ کی شرح میں لکھتے ہیں  
”ای له اهلية الخلافة او التسلط والغلبة“  
شامی میں ہے۔

”ويثبت عقدا لامة اما باستخلاف الخليفة اياه كما فعل ابو بكر،  
واما ببيعة جماعة من العلماء، او من اهل الرأى“۔

سارہ میں ہے۔

”والمطلب تصح منه هذا الامر راي ولايه القضاء والامارة  
والحكم بالاستفتاء ونحوها للضرورة، وصار الحال

عند التقلب كمالم يوجد قرشى عدل، او وجد ولم يقدر (ای لم توجد قدرة على توليته لقلبة الجورة) ان يحكم فى كل من صورتين بصحة ولاية من ليس بقرشى ومن ليس بعدل للضرورة.

اور شرح موافق میں امامت کی شرطیں بیان کر کے لکھتے ہیں:

”لكن للامة ان ينصبوا فالقدها، دفعا للمفاسد التي تندفع بنصبه“ (۶۱۳)

سب سے زیادہ شرح بحث حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں کی ہے:

وقد اجمع الفقهاء على وجوب طاعة السلطان المتعبد والجهاد معه. وان طاعته خير من الخروج عليه لما فى ذلك من حقن الدماء وتسكين الدهماء ولم يستنوا من ذلك الا اذا وقع من السلطان الكفر الصريح، فلا يجوز طاعته فى ذلك بل تجب مجاهدة لمن قدر عليها كما فى الحديث“ (جلد ۱۳-۷)

اور روایت حدیث۔ ”فاعتزل تلك الفرق كلها“ الخ مندرجہ کتاب الفتن کی شرح میں

لکھتے ہیں۔ ”قال ابن بطال: فيه حجة لجماعة الفقهاء فى وجوب لزوم جماعة المسلمين وترك الخروج على ائمة الجور لانه وصف الطائفة الاخيرة بانهم دعاة على ابواب جهنم مع ذلك امر بلزوم الجماعة“ (۳۱-۱۳)

اور حدیث ”اسمعوا واطيعوا وان استعمل عليكم عبد حبشي“ کی شرح میں لکھتے

ہیں۔ ”واما لو تغلب عبد حقيقة بطريق الشوكة فان طاعته تجب اخماداً للفتنة“ (۱۰۹-۱۳)

حافظ نوادى شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

”وهذا الاحاديث فى البحث على السمع والطاعة فى جميع الاحوال وسببها اجتماع كلمة المسلمين فان الخلاف سبب لفسادا احوالهم فى دينهم وديارهم وقوله صلعم: وان كان عبد مجدع الاطراف يعنى مقطوعها والمراد اخس العبيد. اى اسمع واطيع للامير وان كان دنى النسب..... ويتصور اماراة العبد اذ ولاء بعض الائمة او يغلب على البلاد بشوكته“ الخ (جلد ۲-۱۴۵)

اور قاض شوکانی درر البہیہ میں لکھتے ہیں:

”وطاعة الائمة واجبة الا فى معصية الله ولا يجوز الخروج عليهم ما

القامو الصلوٰۃ“ (شرح درر- ۴۱۲)

اور حجۃ اللہ البالغہ میں ہے۔ ”ان الخلیفۃ اذا عقدت خلافتہ ثم خرج اخرین اذ عہد حل قلعہ۔“

اور ازالۃ الخفاء میں ایک مفصل اور دقیق بحث مسئلہ خلافت و حقیقت خلافت پر کرتے ہوئے (جس سے بہتر اور جامع بحث شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے) لکھتے ہیں۔

”و حرام ست خروج بر سلطان بعد ازاں کہ مسلمین بروے جمع شوند، مگر آنکہ کفر بواج ازوے دیدہ شود، اگرچہ آن سلطان متبحر شرانگہ نہ باشد و این مضمون متواتر بالمعنی ست۔“ (جلد ۱- ص ۱۳)

حاصل ان تمام عبارتوں کا وہی ہے جو اوپر گزر چکا۔ یعنی ہر زمانے میں امت کے لیے ایک خلیفہ ہونا چاہیے جو صاحب طاقت و اقتدار ہو۔ اگر امت منتخب کرے تو اس کے لیے فلاں فلاں شرطیں ہیں۔ لیکن اگر کسی مسلمان کی حکومت قائم ہوگئی ہے اور وہی صاحب اقتدار و شوکت ہے تو اسی کو خلیفہ ماننا چاہیے۔ خواہ تمام شرطیں اس میں پائی جائیں یا نہ پائی جائیں۔ قرشی ہو یا غیر قرشی، ظالم ہو یا عادل، عالی خاندان ہو یا ذنی المنسب حتیٰ کہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کی اطاعت و حمایت ہر مسلمان پر واجب ہے۔ جب تک کفر صریح اس سے ظاہر نہ ہو لیکن اگر ایسا ہوا، تو پھر نہ بیعت قائم رہی نہ عہد اطاعت باقی رہا۔ اس حالت میں مسلمانوں پر واجب ہو جائے گا کہ اس کا مقابلہ کریں۔ جو شخص مقابلہ کی طاقت اپنے میں نہ دیکھے، وہ اس کے ملک سے ہجرت کر جائے۔ ”فمن قام علی ذلک فله الثواب ومن اهن فعلیہ الاثم ومن عجز وجبت علیہ الہجرۃ من تلک الارض“ کلنا فی الفتح (۱۰۹، ۱۳)

فتح الباری کی اس عبارت سے ضمنیہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ جس ملک میں کفار کی سلطنت قائم ہو جائے، وہاں مسلمان کو خروج کرنا چاہیے اور حق کے اظہار و اعلان میں کسی طرح کی مدد نہ گوارا نہ کرنی چاہیے۔ لیکن اگر اس کی طاقت اپنے اندر نہ دیکھیں تو پھر اس ملک سے ہجرت کر جائیں۔ یعنی یہ کسی حال میں جائز نہیں کہ تسلط کفر بر قلع و درضا مند ہو کر زندگی بسر کریں۔



## حکم حمل سلاح علی المسلم من حمل علینا (الخ)

سورہ نساء میں ہے۔

وَمَنْ يُقْتَلْ مُؤْمِنًا مَّتَعِمًّا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَهُ  
وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا. (۹۳:۳)

جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ کی پھانسی ہے  
اللہ کا غضب ہے، اس کی پھانسی ہے اور بڑا ہی دردناک عذاب ہے جو اس کے لیے تیار ہو چکا ہے۔  
یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے اور ظاہر ہے کہ جو مسلمان دانستہ بلا کسی حق شرعی کے  
دوسرے مسلمان کو قتل کرے وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اللہ کے غضب و لعنت کا مورد ہوگا اور عذاب الیم  
کا مستحق۔

بخاری و مسلم میں ہے۔ ”سباب المسلم فسوق و قتاله کفر“ رواہ الترمذی  
وصحیحه ولفظه. ”قتال المسلم اخواہ کفر و سبابہ فسوق“۔ یعنی: مسلمان کو دشنام دینا فسق  
ہے اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقع پر جو یادگار عالم خطبہ دیا تھا اور جو خطبہ مجید  
الوداع کے نام سے مشہور ہے، اس میں ہمیشہ کے لیے تمام امت کو وصیت فرمائی۔ ”لا ترجعوا (ولہی  
روایۃ لا ترجعون) بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض (بخاری) میرے بعد کافروں  
کی طرح نہ ہو جانا کہ تم میں سے ایک دوسرے کی گردن اڑائے۔“

اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے لایسور احدکم علی اخیہ بالسلاح  
فانہ لایلدی لعل الشیطان ینزع فی یدہ (ولہی روایہ ینزع بالعمین) ”لیقع فی حفرة من  
النار“ (وايضاً اخرجه مسلم عن ابن رافع، وابونعیم فی المستخرج من مسند ابن  
راہریہ)

یعنی فرمایا۔ کبھی اپنے بھائی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کیا کرو مگر یہ ہے کہ ہتھیار لگ  
جائے اور تم جہنم کے گڑھے میں گر پڑو۔ یعنی اگر اشارہ کرنے میں تلوار کام کر گئی اور مسلمان کا خون ہو گیا تو

ایک ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائے گا جس کی پاداش عذاب جہنم ہے۔

اور ابن ابی شیبہ نے ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ”الملائكة تلعن احدكم اذا اشار الى الاخر بحديدته وان كان اخاه لايهه وامه“ اور امام ترمذی نے ایک دوسری اسناد سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ”من اشار الى اخيه بحديدته لعنه الله والملائكة“ (قال حسن صحيح غريب) و كذا اصححه ابو حاتم من هذا الوجه، یعنی فرمایا جب کسی کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے تو اللہ اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔

فتح الباری میں ہے۔ قال ابن العربي اذا استحق اللعن بشي من الحديده اللعن، فكيف الذي يصيب بها؟ وانما استحق اللعن اذا كانت اشارة تهديداً سواء كان جادا ام لاعباً (جلد ۱۳-۲۱)

یعنی ابن العربی نے کہا: جب صرف ہتھیار اٹھا کر اشارہ کرنے کی نسبت ایسی شدید وعید آئی کہ فرشتے لعنت بھیجتے ہیں تو اس بد بخت کا کیا حال ہوگا جو صرف اشارہ ہی نہ کرے بلکہ سچ سچ اپنے ہتھیار سے ایک مسلمان کو قتل کر ڈالے اور یہ جو فرمایا کہ اشارہ کرنے والا مستحق لعنت ہوتا ہے تو اس سے مقصود وہی شخص ہوگا جو ڈرانے کے لیے ایسا کرے خواہ غصہ سے ہو خواہ ہنسی مذاق سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہنسی دل لگی سے بھی کوئی شخص ہتھیار اٹھا کر کسی مسلمان کو ڈرائے تو وہ لعنت کا مستحق ہوگا۔ یعنی کسی حال میں بھی یہ بات مسلمانوں کے لیے جائز نہیں اور یہ فعل اس درجہ شریعت کے نزدیک مغضوب ہے کہ اس کی ہنسی دل لگی بھی لعنت کا موجب ٹھہری۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔ ”زوال الدنيا كلها هون على الله من قتل رجل مسلم (اخبره الترمذی وقال حديث حسن (اخبره النسائي ولفظه) ”لقتل المؤمن اعظم عند الله من زوال الدنيا) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی نظروں میں تمام دنیا کے زائل ہو جانے سے بھی بڑھ کر جو چیز ہے وہ ایک مسلمان کا قتل ہونا ہے اور اسی بنا پر فرمایا۔ ”اول ما يقضى بين الناس في الدماء (رواه البخاري عن ابن مسعود وزاد مسلم) ”في يوم القيمة“ قیامت کے دن سب سے پہلے جس کا معاملہ چکایا جائے گا وہ انسان کا خون ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے جب ایک قاتل لایا گیا تو آپ نے فرمایا ”نزود من الماء البارد فانك لن تدخل الجنة“ (رواه البيهقي) بن پڑے تو اچھی طرح ٹھنڈا پانی ساتھ لے کر چل کیونکہ تیرا مکانہ دوزخ ہے تو تھمنا جنت میں نہ جائے گا۔



حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر اور کوئی کفر نہیں ہو سکتا کہ اپنے مسلمان بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین کرے۔

شریعت نے مسلمانوں کی جمعیت و قومیت کی بنیاد یا ہی مواخات پر رکھی ہے یعنی ہر مسلمان کا شرعی رشتہ دوسرے مسلمان سے بھائی کا رشتہ ہے۔

فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَةِ إِخْوَانِنَا (۱۰۳:۳) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمْ  
أَخْوَانِكُمْ (۱۰:۳۹)

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں پس جب دو بھائیوں میں رنجش ہو جائے تو صلح کرادو، مسلمانوں کی قومی سیرۃ جا بجا یہ تھلائی (أَذْلَبَةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعْرَظَةٌ عَلَى الْكُفْرَانِ) (۵۳:۵) أَصْلِحُوا عَلَى الْكُفْرَانِ رُحْمَاءٌ بَيْنَهُمْ (۲۹:۲۸) ان میں جس قدر بھی نرمی ہے مسلمانوں کے ساتھ ہے جس قدر بھی سختی ہے غیروں کے ساتھ ہے۔ وہ سب سے زیادہ نرم بھی ہیں اور سب سے زیادہ سخت بھی۔ نرم اپنوں کے لیے، سخت غیروں کے لیے۔ ان کے پاس محبت بھی ہے، عداوت بھی۔ لیکن محبت پر ستار ان حق کے ساتھ کرتے ہیں اور عداوت دشمنان حق کے ساتھ۔

احادیث میں اس حقیقت کی جو بے شمار تشریحات و تمثیلات ملتی ہیں وہ مشہور و معلوم ہیں اور مہاجرین و انصار اور عموم صحابہ کرام نے ان کی عملی تصویر بن کر ہمیں ملادیا ہے کہ اخوت و دینی کے معنی کیا ہیں؟ ہر مسلمان پر اس کی نماز اور روزہ سے بھی بڑھ کر جو چیز فرض کر دی گئی وہ یہی ہے کہ مسلمانوں سے محبت کرے، جہاں تک بن پڑے ان کی بھلائی چاہے اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے کسی مسلمان کو نقصان پہنچے۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو ایمان و اسلام بھی نہیں۔ پہاڑوں جتنا بھی زہد و عبادت ہو اور سمندر جتنی دولت بھی خرچ کر ڈالی جائے لیکن اگر یہ چیز نہیں تو بالکل بیکار و عبث ہے۔

فرمایا ”لایومن احدکم حتی یحب لایحبه ما یحب لنفسه“ (رواہ الشیخان)  
کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ جو بات اپنے لیے پسند کرے، وہی اپنے بھائی مسلمان کے لیے بھی پسند کرے۔

اور فرمایا ”لا تلدخلون الجنة حتی تؤمنوا ولا تؤمنون حتی تحابوا“ تم کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ اور کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں محبت و پیار نہ کرو۔

اور فرمایا۔ ”لا تحسبوا ولا تجسسوا ولا تناجسوا، ولا تباعضوا، ولا تلذابوا  
ولا تباہزوا وکونوا عبادا لله اخوانا، (شیخان) ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو، باہم کینہ اور عناد نہ

رکھو، بدگوئی نہ کرو اور ایسا کرو کہ آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔

حضرت جابرؓ کو وصیت کی ”ان تصبح وتمسى وليس في قلبك غش لاحد“ (مسلم) تمہ پر صبح کا سورج چمکے تو اس حالت میں چمکے کہ اس کی کرنوں کی طرح تیرا دل بھی صاف ہو اور شام آئے تو اس طرح آئے کہ کسی کی طرف سے تیرے اندر رکھوٹ نہ ہو۔

اور فرمایا ”المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده (بخاری) مسلمان وہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

اور فرمایا۔ ”المسلم اخو المسلم، لا يظلمه ولا يخذله، ولا يحقره“ (مسلم) مسلمان مسلمان کا بھائی ہے پس اپنے بھائی کے ساتھ نہ تو ظلم کرے نہ اسے ذلیل کرے، نہ اس کو حقیر جانے۔

اور فرمایا۔ ”لا يعل لرجل ان يهجر اخاه فوق ثلاث (شبخان) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ کسی مسلمان سے روٹھا رہے۔

اور فرمایا ملعون من ضار مومنا او مكر به (ترمذی) اللہ کی اس پر پھٹکار جس نے مسلمان کو نقصان پہنچایا یا اس کو دھوکا دیا۔

ایک حدیث میں یہاں تک زور دیا کہ ”من كان يومن بالله واليوم الآخر فلا يحد النظر الى اخيه، (رواه الحاكم وصححه) جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو نہیں چاہیے کہ اپنے بھائی مسلمان کی طرف جین نظروروں سے گھورے۔ یعنی جب مسلمان بھائی کو دیکھے تو محبت اور پیار کی نظروروں سے دیکھے۔

پس جب اللہ کی شریعت حقہ نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی باہمی محبت و برادری پر رکھی، اسی کو ایمان کی جز قرار دیا۔ وہی اسلام کی اصلی پہچان ہوئی، اسی پر ایمان کی تکمیل موقوف ٹھہری تو ظاہر ہے کہ جو مسلمان خدا کے اس جوڑے ہوئے رشتے کو توڑ دے اور اپنے انہی ہاتھوں سے جو مسلمان کی دستگیری و مددگاری کے لیے بنائے گئے تھے، مسلمانوں کی گردنیں کاٹے، اس سے بڑھ کر خدا کی زمین پر اس کی شریعت کا کون مجرم ہو سکتا ہے؟ اور اگر انسان کی برائیاں اور بد عملیاں اللہ کی لعنت کی مستحق ہو سکتی ہیں، تو اس فعل سے بڑھ کر اور کونسا فعل ہے جو اللہ کے عرش جلال و غیرت کو ہلا دے اور اس کی لعنتیں ہارش کی بوندوں کی طرح آسمانوں سے زمین پر برسنے لگیں۔

جس مومن کا وجود اللہ کو اس قدر محبوب و محترم ہو کہ تمام دنیا کا زوال اس کی ہلاکت کے مقابلے میں بیچ بتلائے، اسی کا خون اور خود ایک مسلمان کے ہاتھوں سے! اس سے بڑھ کر شریعت الہی کی

کیا تو بین ہو سکتی ہے؟ اور ان سارے گناہوں میں جو انسان کے ہاتھ پاؤں کر سکتے ہیں۔ کونسا گناہ ہے جو اس سے زیادہ ملعون و مردود ہو سکتا ہے؟

دنیا کی کوئی بڑائی اور عظمت ہے جو کلمہ لا الہ الا اللہ سے بڑھ کر خدا کی نظروں میں عزت رکھتی ہو؟ اور کوئی محبوبیت ہے جو اس کلمہ عزیز کے اقرار کرنے والے کو اللہ کے حضور نہیں مل جاتی! پس جس بد بخت کا احساس ایمانی یہاں تک مسخ ہو جائے کہ باوجود دعویٰ اسلام مسلمانوں کا خون بہانے لگے، وہ بھی مسلمانوں کا خون نہیں بہاتا بلکہ اللہ کے کلمہ توحید کو ذلیل و خوار کرنا اور اس کی عزت و جلال کو بھل لگانا چاہتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت اسامہ کی روایت ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو النضیر کی طرف ایک فوجی مہم دے کر بھیجا تھا۔ لڑائی میں اسامہ نے ایک آدمی پر حملہ کیا ساتھ ہی ایک انصاری بھی حملہ آور ہوا۔ اسامہ کہتے ہیں کہ جب میری تلوار اس کے سر پر چمکی تو وہ پکار اٹھا "لا الہ الا اللہ" میں نے کچھ پرواہ نہ کی اور قتل کر ڈالا۔ لیکن کلمہ کی صدا سن کر انصاری نے تلوار روک لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو نہایت ناراض و غمگین ہو گئے اور فرمایا "اقتلته بعلمہ قال لا الہ الا اللہ" تو نے اسے قتل کر دیا باوجودیکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا؟ میں نے عرض کیا انما کان مصودا وہ تو اس نے محض میری تلوار سے بچنے کے لیے کہہ دیا تھا فی الحقیقت مسلمان نہیں ہوا تھا۔ "فما زال یحکروہا علی حتیٰ سمعت النبی لم اکن اسلمت قبل ذالک الیوم" لیکن آنحضرت برابر یہی جملہ دہراتے رہے تو نے قتل کر ڈالا باوجودیکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا۔ یہاں تک کہ آنحضرت کا حزن و ملال اور اس واقعہ کا تاثر دیکھ کر مجھے اس قدر مات ہوئی کہ دل نے کہا، کاش آج کے دن سے پہلے میں مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا۔ ایک روایت میں ہے: "الا شققت عن قلبہ حتیٰ تعلم" تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ واقعی دل سے اقرار کیا ہے یا نہیں۔ یعنی جب زبان سے یہ کلمہ نکلا تو اس کا احترام واجب ہو گیا۔ خواہ تلوار کے ڈر سے کہا ہو یا بچ بچ دل سے اقرار کیا ہو۔ دل کا حال تو صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔

یہی واقعہ صحیح مسلم میں جناب ابن عبد اللہ کی روایت سے بھی مروی ہے اور اس میں بعض زیادات ہیں۔ ولہ ان النبی صلعم قال له "لکیف تصنع ہلا الہ الا اللہ اذا اتک یوم القیامہ؟ قال یا رسول اللہ استغفر لی۔" قال فکیف تصنع ہلا الہ الا اللہ؟ فجعل لا یمزیدہ علی ذلک یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ سے کہا "قیامت کے دن جب لا الہ الا اللہ کے ساتھ وہ تیرے سامنے آئے گا تو اس وقت تو کیا کرے گا؟ یعنی اللہ کو کیا جواب دے گا؟ اسامہ نے

عرض کیا یا رسول اللہ! اب تو مجھ سے یہ تصور ہو گیا۔ میری بخشش کے لیے دعا کیجئے۔ لیکن آنحضرتؐ یہی کہتے رہے کہ قیامت کے دن لا الہ الا اللہ کا جب دعویٰ ہوگا تو تم کیا جواب دو گے؟ اور اس جملہ کے سوا کوئی بات نہ فرمائی۔

بخاری میں ہے کہ آپ سے مقداد بن عمرو الکندی نے پوچھا۔ ”ان لقبیت کالراً فالقتلہ، لضرب یدی بالسيف لقطعہا، ثم لاذ بشجرة وقال اسلمت الله اقله بعد ان قالہا؟“ اگر ایسا ہو کہ ایک کافر سے مقابلہ ہو اور وہ تلوار میرے ہاتھ پر اس طرح مارے کہ ہاتھ کٹ جائے۔ پھر الگ ہو کر کہے، میں اللہ پر ایمان لایا، تو یہ کہنے کے بعد اسے قتل کروں یا نہ کروں؟ فرمایا ”لا تقتلہ“ مت قتل کر۔ ”قال فانه طرح احدی یدی ثم قال ذلک بعد ما قطعہا“ مقداد نے عرض کیا اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ ڈالا اور اس کے بعد اسلام لانے کا اقرار کیا پھر کیوں نہ میں اس سے اپنا بدلہ لوں۔ فرمایا۔ ”لا تقتلہ، فان قتلہ، فانه بمنزلةک قبل ان تقتلہ، وانت بمنزلة قبل ان يقول كلمة التی قال“۔ جو کچھ بھی ہوا ہوا، لیکن جب کلمہ توحید کا اقرار کر لیا تو پھر قتل نہ کر اقرار کرنے سے پہلے وہ کافر تھا اور تو مسلمان لیکن اگر تو نے اقرار کے بعد اسے قتل کر دیا تو وہ تیری جگہ ہو جائے گا اور تو اس کی جگہ۔

یہ دو روایتیں اس بارے میں نہایت ہی عبرت انگیز ہیں۔ جب اللہ کے رسول کا یہ حال تھا کہ ایک مشرک دشمن کا جنگ کی حالت میں بھی قتل ہو جانا گوارا نہ ہوا کیونکہ اس نے خوف جان سے ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ کہہ دیا تھا اور اس پر اس قدر رنج و آسوس فرمایا کہ عرصہ تک صدائے الم زبان مبارک سے نکلتی رہی، تو پھر غور کرو کہ جو مسلمان ان مسلمانوں کو قتل کرے جن کی ساری زندگیاں اسلام و ایمان میں بسر ہوئی ہیں اور جنہوں نے محض خوف جان سے ایک مرتبہ ہی نہیں بلکہ دل کے یقین و ایمان سے لاکھوں مرتبہ کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار اور ورد کیا ہے اس کی شقاوت و خسران کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ اور شریعت کے نزدیک اس فعل سے بڑھ کر اور کونسا فعل ہے جو ایک مسلمان کے لیے عذاب الیم کا مستوجب ہو؟

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس فعل کے لیے وہ وعید فرمائی جو کسی معصیت کے لیے نہیں فرمائی۔ یعنی لَعْنَةُ آوَةَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَةُ (۴: ۹۳) اس میں غلوئی النار غضب، لعنت، تین چیزوں کا ذکر کیا ہے اور تمام قرآن و سنت میں یہ تینوں کلمات وعید کفار کے لیے مخصوص ہیں۔ مسلمانوں کی نسبت کہیں استعمال نہیں کیے گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام معاصی و فسوق سے اس فعل کی برائی کہیں زیادہ ہے۔ کفر مرتج و قطعی کے بعد اور عام معاصی سے اشد کوئی فعل ہو سکتا ہے تو وہ بھی ہے اور اسی لیے تمام احادیث میں اس فعل کو کفر فرمایا کہ ”وقتلہ کفر“ اور لا یرجعوا بعدی

کفاراً“ معصیت فسوق کا لفظ اس کی ناپاکی و ملعونیت ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا جب مسلمان کو صرف دشنام دینا فسق ہوا کہ سبب المسلم فسوق“ تو پھر اس کو قتل کر دینا صرف فسق ہی کیوں ہو؟

ثانیاً جس طرح ایمان و اسلام کی ستر سے کچھ ادر شاخیں ہیں اور ان میں سے ہر شاخ ایمان و اسلام ہے۔ ”الایمان بضع وسبعون شعبۃ اعلاھا لا الہ الا اللہ وادناھا اطاعۃ الا ذی عن الطریق“۔ (رواہ مسلم واصحاب السنن الفلالہ ورواہ البخاری ”بضع وستون“) اسی طرح کفر کی بھی شاخیں ہیں اور اعلیٰ و ادنیٰ مراتب ہیں جیسا کہ اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے اور اسی لیے صحابہ و سلف سے مروی ہے و کفر دون کفر ”و ظلم دون ظلم“۔ اور پھر جس طرح ایمان و اسلام اعتقادی بھی ہے اور عملی بھی۔ یعنی اعتقادات و معنویات میں بھی ہے اور عملیات و ظوہر میں بھی۔ فکرمیں بھی ہے اور فعل میں بھی، ایمان باللہ و الرسل بھی اسلام ہے اور نماز بھی اسلام ہے۔ ٹھیک اسی طرح کفر اور نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اعتقادی اور عملی۔ ایک کفر و نفاق اعتقادات و اذکار کا ہے۔ ایک اعمال و افعال کا۔ شرک کفر اعتقادی ہے اور ترک صلوٰۃ عمداً کفر عملی۔ پس یہ جو فرمایا کہ ”سبب المسلم فسوق و قتالہ کفر اور فحجرت آوہ جہنم خالداً فیہا (۹۳:۴) اور ”لا یرجعوا بعدی کفاراً“ اور کلیس منا“

تو ان میں اور عموم احکام کفر و اسلام میں کوئی تضاد نہیں۔ نہ لفظ ”کفر“ کی یہاں کوئی تاویل کرنی چاہیے اور نہ ہی اسلام کو کوئی کمال پر محمول کرنے کی ضرورت ہے۔ شارح نے جس فعل کو کفر کہا، وہ کفر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر ہی ہے اور کفر ہی رہے گا۔ البتہ یہ کفر بھی مثل و غیر اعمال کفریہ کے عملی کفر ہے، نہ کہ کفر اعتقادی و مخرج عن المسلمت۔ اس کا کرنے والا وہ ایسا فعل کفر کا مرتکب ہوگا جیسے نماز چھوڑ دینے والا مسلمان جس کے کفر پر صحابہ کرام کو اتفاق تھا۔ ”وکان اصحاب رسول اللہ صلعم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ“ (ترمذی) ”من الاعمال“ کی قید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عمل کی باتوں میں جو بات کفر ہو سکتی ہے وہ بات ترک صلوٰۃ سمجھی جاتی تھی لیکن بلاشبہ یہ وہ کفر نہیں ہے جو مخرج عن المسلمت ہے۔ جب تک ایک شخص اعتقاد کے اس دروازے سے پلٹ نہ جائے جس دروازے سے اسلام میں داخل ہوا تھا اس وقت تک اس معنی میں کافر نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا ذُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴:۴۸) اور حدیث ابو سعید خدریؓ کہ اخرجوا من کان فی قلبہ مثقال حبة من خردل من الایمان (رواہ البخاری)

پس اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں پر ہتھیار اٹھانا شریعت کے نزدیک ان انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملی کفریات کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لیے اس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً

کافر و مرتد کر دیتا ہے اس کفر سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی برائی نہیں اور قریب ہے کہ اس کا مرتکب اس کفر کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ کتاب و سنت میں جن جن لفظوں اور وعیدوں کو اہتمام کے جیسے جیسے پیرایوں میں اس فعل کا ذکر کیا ہے وہ عام معاصی و فسوق کے لیے کبھی اختیار نہیں کیے گئے اور وہ ایسے سخت و شدید ہیں کہ جس دل میں رائی برابر بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو اس کو لرزادینے اور خوف الہی سے بدحال کر دینے کے لیے بس کرتے ہیں۔ اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مُردہ نہیں ہو گیا ہے تو سارے گناہ جو زمین پر کیے جاسکتے ہیں اس سے سرزد ہو جاسکتے ہیں مگر اس کفر کے ارتکاب کا کبھی وہ ایمان نہیں کر سکتا۔

قرآن میں ”لَعْنَتٌ“ اور ”غَضَبٌ“ کا لفظ کفار و منافقین کے لیے مخصوص ہے۔ لعنت کے معنی یہ ہیں کہ رحمت الہی سے مجبوری اور ہر طرح کی کامیابیوں سے اور فلاح سے محرومی۔ یہودی ملعون و غضوب ہوئے اور عزت و حکومت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ سورہ احزاب میں منافقین پر لعنت وارو ہوئی۔

”إِنَّ الدِّينَ يُؤَدُّونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ لَعْنَتُهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ (۵۷:۳۳) چنانچہ وہ سب نابود و مخدول ہو گئے چونکہ ایمان و اسلام کے خصائص بالکل اس سے متضاد ہیں۔ وہ رحمت الہی کا مورد اور فلاح و مراد کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا جہاں ایمان ہو وہاں لعنت الہی کا بھی درد ہو سکے۔ احادیث میں جا بجا ایسے واقعات ملیں گے کہ سخت سے سخت معاصی و فسوق کا جن لوگوں سے ارتکاب ہو گیا تھا ان پر بھی لعنت کرنے سے آنحضرتؐ نے روکا۔

امام بخاری نے باب باعنا ہے۔ ”ما يَكْرَهُ مِنْ لَعْنِ شَارِبِ الْخَمْرِ“ یعنی جو مسلمان شراب پینے کی معصیت میں مبتلا ہو جائے اس پر لعنت کی ممانعت۔ اس میں عبد اللہ مطلق۔ ”بہ الحمار“ کا واقعہ یہ روایت حضرت عمرؓ لائے۔ یہ شخص بار بار شراب نوشی کے جرم میں ماخوذ ہو چکا تھا۔ سزائیں پاتا تھا، توبہ کرتا تھا، پھر مبتلا ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب ماخوذ ہوا تو بعض مسلمان بول اٹھے۔ ”اللهم العنه ما اكلت ما يوتى به“ اس پر خدا کی لعنت ہو۔ لیکن آنحضرتؐ نے نہایت سختی سے روکا۔ ”لا تلعنوه“ (وفی لفظ لا تلعنہ) فوالله ما علمت انه يحب الله ورسوله (وفی روايته) لانه يحب الله ورسوله) اس پر لعنت نہ بھیجو۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے۔ حافظ عسقلانی نے حافظ ابن عبد البر کا قول نقل کیا ہے۔ ”انه اتى به اكثر من خمسين مرة“ فاعامل!

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت مندرجہ کتاب الديات بخاری ہے کہ ایک شخص اسی جرم میں ماخوذ ہوا اور اس کو پیٹنے کا حکم دیا گیا۔ کسی نے کہا ”اخزاک الله“ خدا تجھے رسوا کرے فرمایا لا تلعنوا ہکذا۔ لا تعينوا عليه الشيطان“ اور سنن ابوداؤد میں ابن دہب کے طریق سے ہے ولکن

قولوا للہم اغفر لہ۔ اللہم ارحمہ“ بددعا نہ دو بلکہ یوں کہو خدا یا اس پر رحم کر، خدا یا اسے بخش دے۔ قلت وما صلح فی ہذا المقام قول الشاعر العارف۔

فدائے شیوہ رحمت، کہ در لباس بہار  
بخذر خوائی زندان ہادہ نوش آمد

لیکن صرف قتل مسلم ہی ایک ایسی معصیت ہے جس کے لیے قرآن نے ”لعنت“ اور ”غضب“ کے الفاظ استعمال کیے اور احادیث میں بھی جا بجا لعنت و طہون کا لفظ وارد ہوا۔ صرف اسی ایک بات سے فیصلہ کر لو۔ خواہ یہ فعل کفر قطعی و مخرج عن الملک ہو یا نہ ہو، لیکن اللہ کی شریعت کے نزدیک اس کا ارتکاب کس درجہ مہنوز و طہون ہے؟ اور جو مسلمان اس کا ارتکاب کرتا ہے، وہ اللہ کے حضور کس طرح اپنے اسلام و ایمان کی ساری رحمتیں اور برکتیں کھودیتا ہے۔

چنانچہ اس باب میں فیصلہ کن حدیث وہ ہے جس کو ہم نے یہ اجاب جو یوب بخاری، اس فصل کا عنوان قرار دیا ہے اور جس کو امام موصوف اور امام مسلم نے مختلف طریقوں سے روایت کیا یعنی ”من حمل علینا السلاح فلیس منا“ (رواہ ابن عمر، و ابویوسفی الأشعری، و فی روایت سلمہ من صل علینا السیف) جس مسلمان نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھایا یعنی حملہ کیا یا لڑائی کی، وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ ومعنی الحدیث حمل السلاح علی المسلمین لقتالہم بہ بغیر حق“ (فتح ۲۰۱۳)

یہ حدیث نہایت اہم ہے اور من جملہ قواعد و کلیات شریعت کے ہے۔ اسی لیے امام بخاری نے کتاب المغنن میں ایک خاص عنوان کا باب قرار دیا اور امام مسلم کتاب الایمان میں لائے تاکہ حقیقت ایمان و کفر کی تحقیق میں اس سے مدد لیں اور حافظ نووی نے ایک مستقل عنوان قرار دے کر باب باندھا۔

”لیس منا“ کے معنی ہیں ”ہم میں سے نہیں ہے۔ یعنی ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ تکلم و خطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”لیس منا“ وعید کا ایک ایسا جملہ تھا جو ان موقعوں پر آپ استعمال فرماتے۔ یہ جہاں صریح و قطعی کفر کی جگہ کفر سے بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کسی ایسی حالت کا متناہ مقصود ہوتا تھا۔ عام محاصی و فسوق سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے حالت کم ہوتی تھی۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے ان سب پر غور کیا جائے اور ایمان و کفر کے عملی مراتب کی حقیقت بھی پیش نظر ہو جو اوپر گزر چکی، تو یہ بات واضح ہو جائے گی۔ پس کچھ ضروری نہیں ہے کہ ”لیس منا“ کے یہ معنی کیے جائیں کہ ”لیس علی ہدینا“ یا ظاہر منطوق کو چھوڑ کر کوئی اور تاویل کی جائے یا لٹنی کو لٹنی کمال پر محمول کیا جائے۔

صاحب شریعت نے جن کاموں کے لیے جو جو احکام دیئے اور جو الفاظ استعمال کیے ہیں

ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور و اثر گھٹانے کی کوشش کریں۔ ایسی کوششیں جن لوگوں نے کیں انہوں نے مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا۔ یہ جو آج تمام عالم اسلام میں تقریباً دو تہائی مسلمان عملاً ایک قلم مرجمی و جہمی زندگی بسر کر رہے ہیں اگرچہ اعتقاداً اہل سنت ہونے کا دعوے کرتے ہیں اور اسلام کی تعریف میں ”عمل ہالارکان“ کا لفظ صرف درسی کتب عقائد کے صفحات پر رہ گیا ہے، عمل میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، تو اس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی بدعت تاویل ہے۔ اسی بدعت کی وجہ سے اعمال کی اہمیت و مطلوبیت بالکل جاتی رہی اور اداء اسلام کا سارا دار و مدار صرف چند جزئیات عقائد کے تحفظ و نزاع پر رہ گیا۔ یہ کیا بات ہے کہ ایک شخص کتنا ہی فاسق و فاجر ہو، لیکن اگر چند نزاری عقاید میں ہمارا ہم داستان ہوتا ہے تو ہم اس کو دنیا کی سب سے بہتر مخلوق یقین کرتے ہیں؟ اور ایک شخص کتنا ہی صاحب عمل و صلاح ہو، لیکن اگر چند اختلافی جزئیات عقائد میں ہم سے متفق نہیں تو پھر اس سے زیادہ شر البریہ ہماری نظروں میں اور کوئی نہیں ہوتا؟ وہی عملی مرجعیت و جمہیت اگرچہ زبان سے اداء اجاب سنت و سلف!

یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے ہمیشہ ایسی تاویلوں سے انکار کیا اور ان تمام راہوں سے بچتے رہے جو رائے اور تعق کی بدعتوں تک لے جانے والی تھیں۔ اسی حدیث کی نسبت امام نووی اور حافظ عسقلانی وغیرہما لکھتے ہیں ”وکان سفیان بن عیینہ یکرہ قول من یفسرہ لیس منابلیس علی ہدینا، ویقول ہنس ہذا القول۔ یعنی ہل یمسک عن تاویلہ“ (شرح مسلم مطبوعہ احمدی، ۶۹ وفتح الباری ۱۳۰۱۳۰) یعنی سفیان بن عیینہ اس بات کو کمر وہ کھتے تھے کہ لیس مناک تفسیروں کی جائے کہ ”لیس علی حدیث“ اور اس تفسیر کی نسبت کہا کرتے کہ کیا ہی بر اقول ہے۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ ان نصوص کی تاویل نہ کرنی چاہیے۔

اسی طرح شیخ عبدالوہاب شمرانی نے میزان میں امام سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے۔

”ومن الادب اجزاء الاحادیث التي خرجت فنخرج الزجر والتفہیر علی ظاہرها من غیر تاویل، فانہا اذا اولت، خرجت من مراد الشارع، کحدیث: من غشا لیس منا، ولس منا من لطم الخدود وشق الجيوب ودعی بدعوة الجاہلہ فان العالم اذا اولہا بان المراد لیس منافی تلک الخصلة فقط، ای وهو منا غیرہا، ہان علی الفاسق الوقوع فیہا وقال مثل المخالفة فی خصلة واحدة امر سهل.“

”لیس منا“ کے صاف معنی یہ ہیں کہ ”وہ ہم میں سے نہیں۔“ یعنی مسلمانوں میں سے نہیں اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی کسی جماعت پر بطور جنگ و قتال کے ہتھیار اٹھانا ایک ایسا فعل ہے جس کے کرنے کے



بعد انسان مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتا۔



## حواشی

۱۔ یہاں یہ شبہ وارد نہ ہو کہ یہ حدیث محاسبہ صلوٰۃ مشہور حدیث سے معارض ہے کیونکہ نماز کی نسبت قضا کا لفظ نہیں آیا۔ حساب کا آیا ہے بخاری کی روایت میں ہے اول ما یحاسب بہ المرء صلاۃ قیامت میں سب سے پہلے آدمی سے جس عمل کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں محاسبہ ہوگا ان میں سب سے پہلا کام نماز ہے۔ لیکن جن کاموں میں فیصلہ چکایا جائے گا۔ ان میں سب سے پہلا معاملہ خون کا ہوگا۔ پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ چنانچہ نسائی نے یہ دونوں کھڑے ایک ہی متن و اسناد سے روایت کیے ہیں:

”اول ما یحاسب بہ العبد الصلوٰۃ واول ما یقضى بہن الناس فی الدعاء“

امام بخاری نے مندرجہ متن حدیث ابن مسعود سے بطریق امش عن ابی وائل روایت کی ہے اور منجملہ ملائحات بخاری کے ہے۔ نسائی بھی یہ روایت ابو وائل کے طریق سے لائے ہیں۔ پس سنداً و متناً روایت ایک ہی ہوئی۔ باقی رہا محاسبہ و قضاء کا فرق تو وہ بالکل ظاہر ہے بعض اعمال انسان کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں بعض دوسروں کے حقوق سے۔ شریعت نے اسی فرق کو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے تعبیر کیا ہے۔ پہلی قسم کے کاموں میں قضا اور فیصلہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر شخص کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی دوسرا نفس مدعی نہیں ہوتا البتہ پرش ہو سکتی ہے کہ وہ فرائض انجام دیے گئے یا نہیں؟ لیکن دوسری قسم کے لیے پرش کافی نہیں۔ فیصلہ چکانے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ ایسے کام ہیں جن میں دوسروں کے حقوق تلف ہوئے ہیں اور وہ بحیثیت مدعی کے کھڑے ہوں گے۔ نماز پہلی قسم کے اعمال میں سب سے زیادہ اہم ہے اور نقل نفس کا معاملہ دوسری قسم میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ پس جب حساب ہوگا تو سب سے پہلے نماز کی نسبت پوچھا جائے گا اور جب فیصلہ چکایا جائے گا تو سب سے پہلے نقل نفس کا معاملہ پیش ہوگا۔

۲۔ امام بخاری نے کتاب الایمان میں باب باندھا۔ ”کفر ان العشیۃ و کفر دون کفر“ لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرام کے آثار سے ماخوذ ہے جیسا کہ امام احمد نے کتاب الایمان میں عطاء بن ابی رباح وغیرہ کے طرق سے روایت کیا ہے اور امام ابوالحسن اشعری نے بھی مقالات طوائف اسلامیہ میں لکھا ہے کہ یہ قول متعدد صحابہ سے منقول ہے اور سلف میں عام طور پر زبان زد تھا۔ کما نقل عنہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فی کتاب

## الایمان

سے احادیث میں بعض اعمال کی نسبت ”لیس منا“ آیا ہے اور بعض کی نسبت ”لیس منی“ جیسے ”النکاح من منی لمن رغب عنها فلیس منی“ دونوں میں فرق ہے۔ لیس منا میں جمع کا صیغہ ہے جس سے مقصود امت ہے۔ اور لیس منی میں اپنی ذات خاص کا ذکر ہے جس سے مقصود ترک سقہ ہے۔ پس جن احادیث میں لیس منا کی وعید آئی ہے ان سے مقصود ہی ہوگا جو متن میں لکھا ہے اور جن میں لیس منی ہے ان سے مقصود صرف ترک اجراع سقہ واسوہ نبوت ہوگا۔

KITABOSUNNAT.COM

## اقسام ثلاثہ قتل مسلم و حمل سلاح

البتہ واضح رہے کہ قتل مسلم حمل سلاح کی متحدہ صورتیں ہیں اور ہر صورت کا حکم شرعی دوسرے

سے مختلف ہے۔

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان مسلمان کو قتل کرے، لیکن اس فعل کو جائز نہ سمجھے۔ اس کی حرمت کا معترف ہو اور اس کے ارتکاب پر شرمندہ و متاسف تو اس کا حکم وہی ہے جو گزشتہ فصل میں گزر چکا۔ یعنی وہ عملی کفر ہے مگر اس کا کرنے والا ملت سے خارج نہیں ہو جائے گا۔ دنیا میں اسلام کے قومی احکام و معاملات اس پر جاری ہوں گے۔ عاقبت کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ قاتل مسلم کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں خود صحابہ و سلف سے اختلاف منقول ہے۔ ایک جماعت اس طرف گئی کہ سورہ فرقان میں ہے: **وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (۶۸:۲۵)** الخ پھر فرمایا **إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (۷۰:۲۵)**

پس اس سے معلوم ہوا کہ تمام معاصی کی طرح قتل نفس کے مرتکب کی توبہ بھی مقبول ہو سکتی ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بخاری و مسلم وغیرہا میں مروی ہے جو مسلمان مسلمان کو قتل کرے، اس کی توبہ مقبول نہیں۔ وہ **فَجَزَّ آوَهٗ جَهَنَّمَ مَخَالِدًا فِيهَا** کے یہی معنی کرتے ہیں کہ ”لاہو بہ لہ“ اور صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ابن عباسؓ سے ”الا من تاب“ کی نسبت پوچھا گیا تو کہا ”ہذہ مکیہ لسخہا ایۃ مدنیۃ التی فی النساء“ یعنی اس آیت کو سورہ نسا کی آیت من یقتل مومنًا نے منسوخ کر دیا۔ پس قبولیت توبہ پر اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔ مسلم کی روایت زیادہ مفصل ہے۔ **”لما نزلت التی فی الفرقان قال مشرکوا مکة قد قتلنا النفس ودعونا مع الله الہ اخر وانا الفواحش. فنزلت الا من تاب وامن. الخ. قال فهذه لا ولنتک واما التی فی النساء فهو الذی قد عرف الاسلام ثم قتل مومنًا متعمدا، فجزاه جہنم لا توبہ لہ یعنی جب سورہ فرقان کی آیت **وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ (۶۸:۲۵)** اتری تو مشرکین مکہ نے کہا ہم توبہ سب کام کر چکے ہیں اب مسلمان ہوئے بھی تو نجات کب**

طے گی؟ اس پر آیت اتری کہ **إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ** (۷۰:۲۵) یعنی ہاں لیکن جس شخص نے توبہ کی، ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو اللہ اس کی برائیوں کو بخیر کر دے گا۔ لیکن ”من یقتل مومنًا“ والی آیت مشرکین کے لیے نہیں مسلمانوں کے لیے اتری ہے یعنی جو شخص مسلمان ہونے کے بعد مسلمان کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے اور اس کے لیے توبہ نہیں۔ اٹھی۔

اور امام احمد و طبرانی نے سالم بن ابی الجعد سے بطریق یحییٰ الجاہری اور نسائی و ابن ماجہ نے بطریق عمار زہبی روایت کی ہے۔ ایک شخص نے ابن عباس سے اس بارے میں سوال کیا تو جواب دیا ”لقد نزلت فی آخر منازل ومانسختها شیئاً حتی قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومانزل وحی بعد رسول اللہ“ اس پر سائل نے کہا ”الفرأیت ان تاب وامن و عمل عملاً صالحاً ثم اھتدی؟“ کہا ”وان له التوبة والھدی؟“ یہ لفظ یحییٰ الجاہری کا ہے۔ نسائی و ابن ماجہ کے الفاظ بھی قریب قریب ایسے ہی ہیں۔ حاصل ان تمام روایات کا یہ ہوا کہ ابن عباس سورہ فرقان کی آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں اور اس بارے میں آخر تنزیل سورہ نساء کی آیت **فَجَزَّ آوَةٌ مِنْ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا** (۹۳:۴) ہے اور اس لیے وہ کہتے ہیں کہ مسلمان قاتل مسلم کے لیے توبہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابن عباس کا مذہب کئی پہلوؤں سے قوی نظر آتا ہے۔

اول تو اس بنا پر کہ سورہ نساء کی آیت کا منطوق عدم قبولیت کے لیے ظاہر نص ہے، حالاً فیہا و غضب اللہ علیہ ولعنة کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور منطوق مطہوم پر مقدم ہے جب تک اس کے خلاف کوئی سبب قوی موجود نہ ہو۔ کما تقررنی الاصول۔

ثانیاً یہ کہنا کہ سورہ فرقان کی آیت نے اس کو منسوخ کر دیا صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آیت فرقان کئی ہے اور آیت نساء مدنی۔ خود ترجمان القرآن اور خیر الامت یعنی ابن عباس شہادت دے رہے ہیں کہ نزلت فی آخر منازل ومانسختها شیئاً“ اور معلوم ہے کہ تاریخ کے لیے تقدم زمانی ہونا ضروری ہے۔ حالاً دونوں آجوں میں حکم مشترک نہیں ہے کہ متاخرین کا معطلہ شیخ مانا جاسکے۔ دونوں کا مورد الگ الگ ہے۔ پس اگر شیخ ہو سکتا ہے تو سلف کی اصطلاح میں ہو سکتا ہے جیسا کہ ابن عباس نے کہا۔ یعنی عام و خاص کا شیخ۔ سورہ فرقان کی آیت میں ذکر کفار کا ہے اور حکم بھی جو دیا گیا ہے وہ انہی کفار کی نسبت ہے جو کفر سے توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور چونکہ الایمان یهدم ما قبلہ ہے۔

یعنی اسلام تمام پچھلی برائیوں کو نابود کر دیتا ہے اس لیے جب شرک سے توبہ ہو سکتی ہے تو کل نفس سے کیوں نہ ہو؟ قریش میں جو لوگ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے، ان میں کون تھا جس نے خود مسلمانوں سے قتال نہیں کیا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ ”الا من تاب“ کے بعد ”وامن“ کا لفظ بھی موجود ہے،

یعنی توبہ کی اور ایمان لایا۔ جس سے واضح ہو گیا کہ یہ توبہ اسلام لانے والے کافر کی توبہ ہے، نہ کہ ایک مومن کی توبہ معصیت بعد از اسلام۔ سورہ فرقان کا آخری رکوع ”وعدا الرحمن“ سے پڑھو تو تمام آیات کا ٹھیک ٹھیک محل و مورد واضح ہو جائے گا۔ وہاں ذکر خدا کے نیک بندوں کے اسلامی و ایمانی اوصاف کا ہے۔ انہی میں ان اوصاف کو بھی داخل کیا ہے کہ ”نہ شرک کرتے ہیں نہ کسی نفس کو قتل کرتے ہیں۔ نہ زنا کا ان سے ارتکاب ہوتا ہے“ پھر بتلایا ہے کہ مسلمان جن برائیوں سے بچتے ہیں؟ یہ وہ برائیاں ہیں جن کا نتیجہ عذاب جہنم ہے اس کے بعد فرمایا ”الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ (۲۵:۷۰)

ہاں لیکن جو لوگ مسلمان ہو جائیں تو انہوں نے کفر کی حالت میں اس طرح کے جس قدر افعال کیے ہوں ان کا مواخذہ نہ ہوگا۔ اسلام ان کی برائیوں سے آلودہ زندگی کو نئیوں اور خوبیوں سے بھر دے گا۔

پس اس آیت میں توبہ کفر کی قبولیت کا ویسا ہی ایک حکم ہے جیسا صد ہا مقامات میں وارد ہے۔ اس کو مسلمان قائل مسلم اور مرتکب حمل سلاح علی المسلم کے معاملہ سے کیا تعلق؟ اور اگر اس کا ذکر کسی دوسری آیت میں آیا ہے تو کیوں ناخ و منسوخ ہونے کی ضرورت پیش آئے؟ دونوں صورتیں بالکل مختلف ہیں۔

لیکن سورہ نساء میں قتل نفس کی ایک خاص حالت کا ذکر ہے یعنی اگر ایک مسلمان باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کو قتل کر ڈالے تو اس کا کیا حکم؟ فرمایا فَجَزَاءُ لَهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا (۹۳:۴) چنانچہ اس آیت سے پہلے ہے وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَاً (۹۳:۴) اس سے زیادہ سے زیادہ دونوں آیتوں میں عام و خاص کا تعلق ہے یعنی اس آیت نے آیت فرقان کی تخصیص کر دی اسی لیے حضرت ابن عباسؓ نے کہا۔ ”نسختها اية مدينة في النساء“ کیونکہ سلف کی اصطلاح میں ”تسخ“ کا اطلاق ہر طرح کی تخصیص و تقلید پر ہوتا تھا وہ معنی نہ تھے جو بعد کو اصولیوں نے قرار دیے اور اسی اختلاف حالت و حکم کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے کہا۔ فلهذه لا ولفك“ یعنی آیت فرقان میں حکم کفار کے لیے ہے اور امام بخاری کی روایت ابن جبیر بطریق شعبہ مندرجہ کتاب التفسیر میں کہا ”كانت هذه لمى الجاهلية“ یہ حکم مشرکین جاہلیت کے لیے تھا نہ کہ مسلمانوں کے لیے۔

اور یہ جو انہوں نے کہا کہ ”وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ“ (۲۵:۲۸) اس کے نزول پر مشرکین مایوس ہو گئے تھے۔ اس لیے الا من تاب اترى، تو اس کی تائید مفسرین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ”نزلت في قوم يمسرون من التوبة یعنی ان لوگوں کے حق میں اترى جو زمانہ کفر کی بد عملیوں کی بخشش سے مایوس ہو گئے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ

آیت اور سورہ نساء کی إِنَّ اللَّهَ لَا يُغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (۴:۴۸) اور سورہ زمر کی ایہ رحمت: يَلْبِغُوا عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ (۵۳:۳۹) اٹخ وحشی قائل جزوہ کے بارے میں اتریں۔ وہ کہتا تھا کہ شرک میں ساری عمر کی، وغیرہ کے چچا کو قتل کیا۔ فواہش میں ہمیشہ جتلا رہا۔ انہی تین برائیوں سے احتساب کا خاص طور پر آیت فرقان میں ذکر ہے اب اگر میں مسلمان بھی ہو گیا تو کیا فائدہ؟ مجھے تو نجات مل ہی نہیں سکتی۔ اس پر ”الامن تاب“ اتری اور پھر حرید بشارت امید کے لیے سورہ نساء اور سورہ زمر کی آیات نازل ہوئیں۔ تعجب ہے کہ بعض شارحین کو مذہب ابن عباس کی شرح و تفسیر میں مشکلات کیوں پیش آئیں؟ ان کا بیان تو بالکل صاف اور واضح ہے۔

رباعاً احادیث سے بھی اس مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً امام احمد و نسائی کی روایت معادیہ بطریق اور یس خولانی مرفوعاً ”کل ذنب عسی الله ان يغفره الا الرجل يمتوت كافراً او لرجل يقتل مؤمناً معصداً“ یعنی تمام گناہ اللہ بخش دے سکتا ہے لیکن وہ شخص جو حالت کفر میں مرے یا وہ جس نے جان بوجھ کر مومن کو قتل کر ڈالا۔

باقی رہیں وہ احادیث جن میں وسعت رحمت و عموم غنود بخشش، و عدم جواز یاس و قنوط وغیرہ کا ذکر ہے، تو اس مذہب کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی مثل تمام عومات قرآن کے ہیں، جن کی تخصیص آیہ نساء اور اس کی مویذات فی الاستغفار نے کر دی۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ قبل از اسلام معاصی کی بخشش تو مسلم ہی ہے۔ بحث بعد از اسلام ارکاب قتل میں ہے۔ اسی طرح اگر حدیث اسرائیلی ”الذی فعل تسعة وتسعين نفساً ثم اتى تمام المائة ثم تاب“ پیش کی جائے تو جواب یہ ہوگا کہ اس کا عمل بھی تو یہ اسلام ہے نہ کہ تو یہ مسلم اور وہ بھی مثل عومات بشارات رحمت و بخشش کے ہے۔ خصوصاً پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرضیکہ اس مذہب کی قوت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن عام طور پر علماء نے دوسرے مذہب کو اختیار کیا۔ یعنی قبولیت تو یہ کہ اور خوارج و معتزلہ کے غلو کی وجہ سے اہل سنت کا رجحان اسی کی طرف بڑھتا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کا معاملہ بڑا ہی سخت ہے لیکن تو یہ قبول ہو سکتی ہے۔ اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے بخش دے چاہے نہ بخشے۔ اس میں شک نہیں کہ احتیاط حکم امید ہی میں ہے، نہ کہ پیام یاس و قنوط میں۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (۴:۴۸) کے حکم کا عموم بڑا ہی امید افزا ہے اور اگر اس پر نظر ڈالی جائے تو کچھ شک نہیں کہ دوسرا مذہب ہی محتاط معلوم ہوتا ہے۔

(۲) قتل مسلم کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس قتل کو حلال سمجھے اور اس پر نادم و متاسف نہ ہو۔

مثلاً کوئی مسلمان فوجی ہو وہ یہ سمجھے کہ لڑائی لڑنا تو ہمارا کام ہی ہے مسلمان سامنے ہوں گے تو انہی سے لڑیں گے۔ یعنی مسلمانوں پر تلوار اٹھانا کوئی گناہ کی بات نہیں، یا یوں سمجھیں کہ ہمارے مالکوں کا بھی حکم ہے ہم نے ان کا نمک کھایا ہے، اس لیے ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے یعنی اگر کوئی اپنا نمک کھلا کر حکم دے کہ مسلمانوں کو قتل کر دو تو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تو اس صورت میں تمام امت کا اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص قطعاً و حتماً کافر ہے یعنی اس کفر کا مرتکب ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ اس کا حکم شرعاً وہی ہوگا جو تمام کفار و مشرکین کا ہے، دنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اس کو مسلمان سمجھے اور اس سلوک کا حقدار کہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ یہ حکم خاص اس مسئلہ ہی پر موقوف نہیں ہے ہر محلل حرام غیر ماؤل کے لیے بھی حکم ہے۔

(۳) تیسری صورت قتل مسلم کی یہ ہے کہ کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہو کر ان کی فتح و نصرت کے لیے مسلمانوں سے لڑے یا لڑائی میں ان کی اعانت کرے اور جب مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے یہ صورت اس جرم کے کفر و عدوان کی انتہائی صورت ہے اور ایمان کی موت اور اسلام کے نابود ہو جانے کی ایک ایسی اشد حالت ہے جس سے زیادہ کفر و کافر کی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کے وہ سارے گناہ، ساری مصیبتیں، ساری ناپائیاں، ہر طرح اور ہر قسم کی نافرمانیاں جو ایک مسلمان اس دنیا میں کر سکتا ہے یا ان کا وقوع دھیان میں آسکتا ہے، سب اس کے آگے بچھ ہیں۔ جو مسلمان ایسے فعل کا مرتکب ہو وہ قطعاً کافر ہے اور بدترین قسم کا کافر ہے۔ اس کی حالت کو قتل مسلم کی پہلی صورت پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا۔ اس نے صرف قتل مسلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا ہے بلکہ اسلام کے برخلاف دشمنان حق کی اعانت و نصرت کی ہے اور یہ بالاتفاق و بالاجماع کفر صریح و قطعی مخرج عن الملئۃ ہے۔ جب شریعت ایسی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقہ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتی تو پھر صریح اعانت فی الحرب اور حمل سلاح علی المسلم کے بعد کیونکر ایمان و اسلام باقی رہ سکتا ہے؟



## واقعہ امام حسین علیہ السلام

بعض لوگوں کو یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ اگر سلطان اسلام کو خلیفہ مان لیا جائے، تو پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید بن معاویہ کی حکومت کے خلاف کیوں خروج کیا؟ اور کیوں ان کو بدرحق اور شہید ظلم و جور تسلیم کیا جاتا ہے؟

پس گویا اس کے اس حصے کا طول بقیہ مطالب کی تشریح میں نکل ہو گا لیکن چونکہ اس معاملہ میں عام طور پر ایک سخت فلفلی پھیلی ہوئی ہے، اس لیے صاف کر دینا ضروری ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت امام حسینؑ اس حالت میں لڑے، جبکہ وہ یزید کی حکومت کے مقابلے میں خود مدعی امامت اور طالب خلافت تھے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں انہوں نے واقعہ کربلا کا دقیقہ نظر کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا۔ حالات میں اچانک ایسی تبدیلیاں ہوئیں ہیں کہ اس فلفلی کا پیدا ہو جانا عجیب نہیں۔ حضرت امام جب مدینہ سے چلے، تو ان کی حیثیت دوسری تھی۔ جب کربلا میں حق پرستانہ لڑکر شہید ہوئے، تو ان کی حیثیت دوسری تھی۔ دونوں حالتیں مختلف ہیں اس لیے دونوں کا حکم بھی شرعاً مختلف ہے۔

جب وہ مدینہ سے چلے ہیں تو حالت یہ تھی کہ نہ تو ابھی یزید کی حکومت قائم ہوئی تھی، نہ اہم

مقامات و مراکز نے اس کو خلیفہ تسلیم کیا تھا، نہ اہل حل و عقد کا اس پر اجماع ہوا تھا۔ ابتداء سے معاملہ خلافت میں سب سے پہلی آواز اہل مدینہ کی رہی ہے پھر حضرت علیؑ کے زمانہ میں مدینہ کی جگہ کوفہ دار الخلافہ بنا۔ اہل مدینہ اس وقت تک متفق نہیں ہوئے تھے۔ کوفہ کا یہ حال تھا کہ تمام آبادی ایک قلم مخالف تھی اور حضرت امام حسینؑ سے بیعت کرنے کے لیے ہی ہم اصرار و الجاح کر رہی تھی۔ انہوں نے خود خلافت کی حرص نہ کی بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب تخت حکومت سابق حکمران سے خالی ہو چکا تھا اور نئے حکمران کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، ایک بہت بڑی مرکزی و موثر آبادی (یعنی کوفہ و عراق) کے طلب و سوال کو منظور کر لیا۔ البتہ اس منظورگی میں مصلحت ضرور پیش نظر تھی کہ یزید جیسے نااہل کی حکومت سے امت کو بچایا جائے۔

اگر کہا جائے کہ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً اولاد کی ولی عہدی کوئی شے نہیں ہے۔ اصلی شرط خلافت کی انتفاخ حکومت ہے۔ یزید کو گویا عہد مقرر کر دیا ہو، لیکن جب تک اس کی خلافت بالفضل قائم نہ ہو جاتی صرف یہ بات کوئی حجت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب یزید کو ولی عہدی کے لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بیعت طلب کی گئی تو انہوں نے صاف



انکار کر دیا اور کہا ”لا ابا یح لامیرین“ میں دو امیروں سے بیک وقت بیعت نہ کروں گا۔ یعنی خلیفہ کا اپنی زندگی میں ولی عہدی کے لیے بیعت لینا ایک وقت میں دو امیروں کی بیعت ہے جس کی شرعا کوئی اصل نہیں۔ (رواہ ابن حبان و تھعلہ فی التّح)

لیکن جب وہ کوفہ پہنچے تو یکا یک نظر آیا کہ حالت بالکل بدل چکی ہے۔ تمام اہل کوفہ ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت کر چکے ہیں اور سر زمین عراق کی وہ بے وقافی و عذاری جو حضرت امیر کے عہد میں بارہا ظاہر ہو چکی تھی، بدستور کام کر رہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر وہ معاملہ خلافت سے دست بردار ہو گئے اور فیصلہ کر لیا کہ مدینہ واپس چلے جائیں۔ لیکن ابن سعد کی فوج نے ظالمانہ محاصرہ کر لیا اور مع اہل و عیال کے قید کرنا چاہا۔ وہ اس پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ مدینہ کی جگہ دمشق چلے جائیں اور براہ راست یزید سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔ مگر ظالموں نے یہ بھی منظور نہ کیا۔

اب امام کے سامنے صرف دو راہیں تھیں یا اپنے تئیں مع اہل و عیال قید کرادیں یا مروانہ وار لڑ کر شہید ہوں۔ شریعت نے کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ ناحق ظالموں کے ہاتھ اپنے تئیں قید کرادے۔ پس انہوں نے دوسری راہ کمال عزیمت و دعوت کی اختیار کی اور خود فرشانہ لڑ کر حالت مظلومی و مجبوری میں شہید ہوئے۔

پس جس وقت کربلا میں میدان کارزار گرم ہوا ہے اس وقت حضرت امام حسین مدعی خلافت و امامت نہ تھے، نہ اس حیثیت سے لڑ رہے تھے ان کی حیثیت محض ایک مقدس اور پاک مظلوم کی تھی جس کو ظالموں کی فوج ناحق گرفتار کرنا چاہتی ہے اور وہ اپنے آپ کو زعمہ گرفتار کرنا دینا پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ طاقتور ظلم کے مقابلے میں بے سرو سامان حق کی استقامت کا ایک یادگار منظر دنیا کو دکھلا دے۔ تعجب ہے کہ یہ غلط فہمی صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے جس کو مفصل اور محققانہ بحث دیکھنی ہو، وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی منہاج السنہ جلد ۲ کا مطالعہ کرے۔



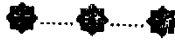
## شرط قرشیت

مندرجہ بالا فصول سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انتخاب خلیفہ و امام کے لیے متعدد شرطیں ہیں۔ از انجملہ ایک عرصہ تک علماء کی رائے رہی کہ خلیفہ کو خاندان قریش میں سے ہونا چاہیے۔ لیکن اگر امت کے لیے انتخاب کا موقعہ باقی نہ رہا ہو تو خلیفہ تسلیم کر لینے کے لیے بجز اسلام اور انعقاد حکومت (یعنی حکومت کے جماؤ اور جگہ پکڑ لینے) کے اور کوئی شرط نہیں ہے۔ خلفائے راشدینؓ کے بعد جامع الشروط سلسلہ خلافت کوئی بھی قائم نہ ہوا۔ بنو امیہ و عباسیہ میں اگر ایک شرط قرشیت کی پائی جاتی تھی تو اور بہت سی اہم شرطیں منقوڈ تھیں۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت تلوار کے زور سے نہ منوائی جائے بلکہ امت کے انتخاب و اجماع سے ہو۔ سو یہ شرط کسی کی خلافت میں بھی نہ تھی۔ پھر خلیفہ کو عادل و منصف ہونا چاہیے۔ حکومت نظام شوری کے ساتھ کرنی چاہیے، سنت رسول اور سنت خلفاء راشدینؓ پر عامل ہونا چاہیے۔ بجز عمر بن عبدالعزیز کے کوئی بھی ان سب کا جامع نہ تھا۔ عباسیہ کے بعد حکومت عجمیوں کے ہاتھ آئی۔ پھر مصر کے عباسی خلفاء کے بعد ترکوں کا خاندان عثمانیہ خلافت پر قابض ہوا۔ آخری مصری خلیفہ نے خود سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ خلافت بلا نزاع آج تک قائم اور تمام عالم اسلامی کے لیے شرع و امت کا مرکزی اقتدار ہے اگر بنو امیہ و عباسیہ میں پانچ شرطیں نہیں پائی جاتی تھیں تو ان میں سات نہ سہی۔ یعنی یہ عرب بھی نہیں اور قرشی بھی نہیں لیکن چونکہ سوال خلیفہ کے انتخاب کا نہیں ہے بلکہ ایک قائم و نافذ خلافت کے ماننے کا ہے اس لیے شرائط کی بحث کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

مجملہ شروط خلافت کے ایک شتق علیہ شرط حریت کی ہے۔ یعنی خلیفہ آزاد ہو غلام نہ ہو۔ مصلحت و ضرورت بھی اس کی ظاہر ہے۔ مگر معلوم ہے کہ تمام دنیا کی تاریخ میں صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے کہ غلاموں نے امامت کی ہے یا وراثت کی ہے اور تمام سادات و قریش اور شرفاء عرب و عجم نے ان کے آگے اطاعت کا سر جھکایا۔ خود حدیث میں وارد ہے ”اسمعوا و اطیعوا وان استعمل علیکم عند حبشی کان راسہ زہبہ“ اور روایت ابو ذر عند مسلم کہ ”وان کان عبد امجدع الاطراف“ اور روایت ابن حصین کہ ”ولو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ، اسمعوا لہ و اطیعوا یعنی اگر ایک ذلیل سے ذلیل حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہو جائے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔ حافظ نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔ ”والمراد الخمس العبد، ای اسمع و اطیع

وان كان دنى النسب حتى لو كان عبداً سود مقطوع الاطراف، فطاعته واجبة،  
 ويتصور امارة العبد اذا ولاه بعض الائمة اويغلب على البلاد بشوكة وابعاه،  
 ولا يجوز ابتداء عقد الولاية له مع الاختيار، بل شرطها الحرية“ (جلد ۲، ۱۲۵) یعنی یہ  
 جو فرمایا کہ اگرچہ حبشی غلام ہو تو مقصود اس کا یہ ہے کہ اگرچہ امیر نہایت ذلیل نسب و خاندان کا ہو، لیکن  
 اگر خلیفہ ہو گیا ہے تو اطاعت کرو اور اسی بنا پر غلام امیر ہو سکتا ہے اگر کسی امام نے مقرر کر دیا ہو یا خود وہ  
 شہروں پر غالب آ کر مسلط ہو۔ البتہ جائز نہیں کہ ابتدا میں کسی غلام کو امیر منتخب کیا جائے کیونکہ آزاد ہونا  
 شرائط امامت میں سے ہے اور فتح الباری میں ہے ”لو تغلب حقیقته بطریق الشوكة، فان طاعته  
 تجب اعتماداً للفتنة (۱۰۹: ۱۳)“

جب غلبہ و تسلط کی صورت میں خود حافظ نووی (جو شرط قرشیت کے سب سے بڑے حامیوں  
 میں سے ہیں) نص حدیث کی بنا پر تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دنی النسب خیس المال حبشی غلام امیر  
 ہو سکتا ہے۔ اگرچہ آزاد ہونا شرط ابتدائی ہے..... تو پھر ظاہر ہے کہ ایک غالب و مسلط خلیفہ کی خلافت کے  
 لیے شرط قرشیت کا موجود نہ ہونا کیوں قائل ہو۔ اگرچہ قرشیت ایک شرط ابتدائی مان لی جائے؟  
 پس یہ مان لینے کے بعد بھی کہ قرشی ہونا شرائط شرعیہ میں سے ہے ترکان عثمانی کی خلافت  
 مسلمہ و معتقدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور شرائط کی پوری بحث موجودہ مسئلہ سے یک قلم غیر متعلق ہے۔ تاہم  
 تحقیق مقام کے خیال سے بہتر ہوگا کہ اس شرط کی حقیقت پر بھی ایک فیصلہ کن نظر ڈالی جائے۔



## الائمة من قریش تحقیق امارت قریش و شرط قرشیت

جہاں تک قرآن و سنت آثار صحابہ اور تمام دلائلی شریعہ و عقلیہ کا تعلق ہے، کوئی نص قطعی موجود نہیں، جس سے ثابت ہو کہ اسلام نے معاملہ خلافت و امامت صرف خاندان قریش کے لیے شرعاً مخصوص کر دیا ہے۔ احادیث اس بارے میں جس قدر موجود ہیں، سب صحیح ہیں یہ بھی مروی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے مجمع صحابہ میں اس کو پیش کیا اور کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ صحابہ میں ہمیشہ اس بات کی شہرت رہی اور یہ بھی غلط نہیں کہ جب تک خاندان عباسیہ باقی رہا، لوگ اس کو بطور ایک شرط کے سمجھتے رہے۔ بایں ہمہ ان ساری باتوں کی حقیقت وہ نہیں ہے جو اب بھی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے صحیح ہونے کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اسلام نے خلافت کو نہ کسی قوم میں مخصوص کیا ہے، نہ کسی خاندان میں۔ اسلام جو اس طرح کی تمام قومی و نسل امتیازات مٹانے اور ہمیشہ کے لیے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کو قائم کر دینے اور ”عمل“ کے قانون الہی کے آخری اعلان کے لیے آیا تھا اس کے نام سے ساری باتیں مان لی جاسکتی ہیں لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے خاندان و نسل کا کوئی امتیاز تسلیم کیا ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ امتیاز و نسب کے جس بت کو خود اس نے توڑا ہو، انہی نگلوں کو پھر جوڑ کر از سر نو ایک نیا بت خانہ قائم کر جائے؟

تفصیل و دلائل کی ضرورت نہیں۔ یہ بات ہر اس شخص پر جو اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، روشن ہے کہ ہر طرح کے نسلی و خاندانی امتیازات کے مٹانے میں اسلامی احکام و اعمال کا یہ حال رہا ہے؟ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا جہاں کے غرور و قوم و نسب کا یہ حال تھا کہ وہاں کا ایک جہودا اپنے نسبی و خاندانی شرف کے سامنے قیصر و کسریٰ کو بھی ذلیل و حقیر سمجھتا تھا۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا بھی طرح طرح کے قومی و نسل امتیازات کی پرستش کر رہی تھی۔ اسلام نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرور و نسل و قوم کے بت پر لگائی اور اللہ کے اس قانون فطرت کی عام منادی بلند کی: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْوَمُ“ (۱۳.۳۹) یعنی بنیاد ہر طرح کی بزرگی و فضیلت کی صرف عمل ہے، اور کوئی شے نہیں، قوموں اور

خاندانوں کی تفریق صرف اس لیے ہے کہ باہدگر پہچان اور تمیز کا ذریعہ ہو اس لیے نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلائے۔ سب سے بڑا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو اور فرمایا۔ اَلَا تَنْزُرُ وَازِرَةً وَّرَزَّ اُنْحَرَى • وَاَنْ لِّمَنْ لِّلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعَى • وَ اَنْ سَعْيَهُ سَوْفَ يُؤْتَى (۴۰:۳۸:۵۳)

ہر انسان اپنے کاموں کا خود ذمہ دار ہے اور انسان کی تمام کامیابیوں اور سعادتوں کی بنیاد صرف اس کی کوشش اور اس کا عمل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی بھر قول فعل یہ رہا کہ ”لیس منا من دعى الى عصبية“ اور ”لیس منا من قاتل على عصبية“ اور ”لیس منا من مات على عصبية“ یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو نسل و قوم کی خصوصیت کے تعصب کی طرف لوگوں کو بلائے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی حالت میں دنیا سے جائے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو تعصب کی بنا پر لوگوں سے جگ کرے۔ دنیا کو چھوڑنے سے پہلے جیہ الوداع میں جو آخری پیام امت کو آپ نے دیا، اس میں بھی سب سے پہلی چیز یہی تھی یعنی نوع انسانی کی عام مساوات کا اعلان: ”لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی کلکم ابناء آدم“۔ (شہبختان) اور فرمایا ”لیس لاحد فضل علی احد الابدین وتقوی۔ الناس کلہم بنو آدم، وادم من تراب“ (رواہ الجماعة)

یعنی اسلام کا ظہور و قیام نوع انسانی کی مساوات اور باہدگر برابری کا اعلان ہے۔ اب نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عرب پر ملک و قوم کی وجہ سے فضیلت مل سکتی ہے۔ سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں اور وہی سب سے بڑا ہے جو عمل میں بڑا ہو۔

معمورہ دے اگر ت ہمسف، باز گوئے

کین جاخن بہ ملک فریدوں نی رود

عملا یہ حال تھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں سب سے آخری فوجی مہم جو بھیجی اس کی سرداری اسامہ غودی جن کے والد زید آپ کے غلام تھے۔ بعض ظاہر بینوں پر یہ بات گراں گزری تو فرمایا۔ ”لقد طعتم فی امارۃ ابیہ وقد کان لہا اہل، وان اسامۃ لہا اہل“ تم لوگ پہلے زید کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو، حالانکہ وہ اس کام کا اہل تھا اور اب اسامہ سردار بنایا گیا ہے اور وہ اس کام کا اہل ہے ”اہل“ کے لفظ پر زور دیا یعنی طعن بیکار ہے کیونکہ بنیاد معاملہ امارت و سرداری کی صرف اہلیت و قابلیت ہے اور کچھ نہیں۔ حضرت عائشہ کا قول مشہور ہے۔ ”لو کان زہد حیا ما ستخلف رسول اللہ غیرہ“ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام زید زندہ رہتے تو آپ ان کے سوا اور کسی کو اپنا جانشین نہ بناتے۔ اسامہ کو جس لشکر کی سرداری دی گئی تھی جانتے ہو اس میں کیسے کیسے لوگ شریک تھے؟ بڑے بڑے

مہاجرین و قریش اور سادات عرب جن میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق کا نام نظر آتا ہے، وہی ابوبکر جو چند دنوں کے بعد رسول اللہ کے جانشین اور تمام امت کے امیر ہونے والے ہیں!

بندہ عشق شدی، ترک نسب کن جاہی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

بذال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی کا جو حال تھا، معلوم ہے بلال کو عمر فاروق جیسے قرشی نے ”ہمارا آقا و سردار“ کہا اور صہیب کو دیکھتے تو کہتے ”نعم العبد صہیب لو لم یخف اللہ لم یعضہ“ صہیب اللہ کا کیا نیک بندہ ہے! اگر خوف عذاب نہ ہوتا جب بھی اس کی فطرت بدی پر مائل نہ ہوتی۔ مرنے کے وقت وصیت کی کہ نماز جنازہ وہی پڑھائیں۔ سلمان کا یہ حال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ”سلمان منا اہل البیت“ سلمان تو ہم اہل بیت نبوت میں سے ہے۔ اسی چیز کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندر عرب کی نسل عصبیت کا نام و نشان تک باقی نہ رہا اور وہ زمانہ آ گیا جب بزرگی و فضیلت کے ہر میدان میں سرداری و ریاست عجمیوں اور غلام زادوں کے ہاتھ میں تھی۔ عرب ان کے علم و عمل کے آگے اسی طرح جھک گئے تھے جس طرح ایک قرشی وہابی کے آگے جھک سکتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو امام زہری سے کہنا پڑا۔ ”واللہ لیسودن الموالی العرب ویخطب لہم علی المنابر، و العرب تحتہم۔“ (عقد الفرید)

پھر کیا ایسی حالت میں ایک لمحہ کے لیے بھی باور کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کا داعی تمام دنیا کو تو قومی و نسلی امتیازات کی غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہو اور سادات عامہ کی طرف بلا رہا ہو۔ لیکن (نعوذ باللہ) خود اس درجہ خود غرض ہو کہ قیامت تک کے لیے پادشاہی و خلافت صرف اپنے ہی خاندان کے لیے مخصوص کر دے؟ وہ تمام نوع انسانی سے تو کہے کہ تمہارے سارے بنائے ہوئے حق جھوٹے ہیں۔ سچا حق صرف عمل اور اہلیت کا ہے لیکن خود اپنے لیے یہ کر جائے کہ نہ تو عمل اور نہ اہلیت بلکہ صرف ملک صرف قوم، صرف نسل اور صرف خاندان؟

کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی عجیب بات ہو سکتی ہے؟

خیر یہ بات کتنی ہی عجیب ہوتی لیکن ہم بلا تامل باور کر لیتے اگر فی الحقیقت قرآن و سنت سے ٹھیک ٹھیک ثابت ہوتی۔ ہمارے نزدیک کسی اسلامی اعتقاد کی صحت و عدم صحت کا معیار صرف یہ ہے کہ کتاب و سنت سے بطریق صحیح ثابت ہو۔ کچھ ضروری نہیں کہ ہماری نارسا سمجھ اس کا احاطہ و ادراک بھی کر سکے۔ لیکن استعجاب کی ساری بنیاد ہمارا عقلی و قیاسی استعجاب نہیں ہے۔ یہی ہے کہ کسی نص سے ایسا ثابت نہیں اور چونکہ ثابت نہیں، اس لیے ہم کو یقین ہے کہ اسلام کے لیے کوئی ایسی بات ثابت بھی نہیں ہونی

چاہیے۔

شارع کے بیانات، انسان کی عام بول چال کی طرح مختلف قسموں کے واقع ہوئے ہیں۔ ازواجہ ایک صورت احکام وادامہ اور تشریح کی ہے۔ یعنی بحیثیت شرع و دین کے کوئی حکم دینا اور قانون منظر ادینا۔ دوسری صورت اخبار واطلاعات کی ہے۔ یہ دوسری صورت مجرد بیان واقعہ و حال ہے اور اگر آئندہ کی نسبت سے ہے تو پیشین گوئی ہے۔ حکم اور تشریح نہیں ہے۔ یعنی صرف ایک خبر ہے کہ ایسا ہوگا یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا چاہیے۔

قریش کی خلافت کی نسبت جس قدر روایات موجود ہیں، سب دوسری قسم میں داخل ہیں نہ کہ پہلی قسم میں۔ اور جب اس حدیث کے تمام طریقوں اور لفظوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو بلا کسی اضطراب کے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔

(۱) یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ، ابو ہریرہؓ، ابو ہریرہؓ، کثیر بن مرہؓ، جابر بن عبد اللہؓ، جابر بن سمرہؓ، معاویہ بن صفیانؓ، وغیرہم مختلف صحابہ سے مروی ہے اور عمدہ طریق وہ ہیں جو بخاری و مسلم نے اختیار کیے ہیں۔ لیکن کسی طریق و روایت میں بھی کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ثابت ہو کہ مقصود پیشین گوئی نہ تھا۔ تشریح و امر تھا۔

”عن ابی ہریرۃ الناس تبع لقریش فی ہذا الشان مسلمہم ولمسلمہم وکافرہم وکافرہم“ (مسلم) دوسرے طریق میں زیادہ وضاحت ہے۔ مسلمہم تبع لمسلمہم، وکافرہم تبع لکافرہم“ (مسلم) جابر کی روایت میں ”الناس تبع لقریش فی الخیر والشر“ ہے۔ امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ”معناہ فی الاسلام والجاهلیۃ لانہم کانوا فی الجاہلیۃ رواساء العرب واصحاب حرم اللہ واهل الحج، وکانت العرب تنتظر اسلامہم، فلما اسلموا وفتحت مکہ تبعہم الناس، وجاءت وفود العرب من کل جہۃ ودخل الناس فی دین اللہ الفوجا (جلد ۲-۱۱۹) پس معلوم ہوا کہ اس حدیث کو مسئلہ خلافت کے اختتام، شرائط سے کوئی تعلق نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ عرب میں خاندان قریش حج کے اہتمام اور بیت اللہ کی ہمسائیگی کی وجہ سے تمام قبائل کی سرداری رکھتا تھا اور ہر کام میں سب کی نظریں اسی پر اٹھتی تھیں۔ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اور قریش مسلمان نہ ہوئے، تمام عرب کے قدم رکھے۔ جو نئی قریش مسلمان ہوئے، سب نے ان کی بیروی کی اور اپنے اپنے وفد بھیجنا شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ تمام عرب مسلمان ہو گیا۔ پس فرمایا ”الناس تبع لقریش“ لوگ جاہلیت اور اسلام، دونوں حالتوں میں قریش کے تابع ہوئے۔ وہ بگڑے رہے تو سارا عرب بگڑا، وہ سنورے تو سب سنور گئے اور یہ بالکل حق و معلوم ہے۔

ہمیشہ اور ہر ملک میں سردار جماعتوں اور بڑے لوگوں کا ایسا ہی اثر ملک و قوم پر ہوتا ہے۔ اچھی بری ہر طرح کی باتوں میں لوگ انہی کی پیروی کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے یہی حدیث مستدام احمد میں یوں مروی ہے۔ ”برالناس تبع لبرہم و فاجرہم تبع لفاجرہم“ اور بیہقی نے حضرت علیؓ سے روایت کیا۔ ”کان هذا الامر فی حمیر فنزعه الله منهم وجعله فی قریش“ لیکن اس سے یہ بات کیونکر ثابت ہوئی کہ مسلمانوں کا خلیفہ بجز ان کے کوئی دوسرا ہونی نہیں سکتا؟ اسلام صرف عرب ہی کا اسلام نہ تھا جس کے سردار قریش تھے اسلام تمام عالم کے لیے اسلام ہے جس کی ریاست و سرداری صرف علم و عمل حق ہی کو مل سکتی ہے اور یہ سرداری اسلام ہی نے دلائی ہے!

(۲) امام بخاری نے جابر بن سبرہ سے ایک اور حدیث روایت کی ہے ”سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان یكون انا عشر امیراً. فقال کلمة لم اسمعها فقال ابی انه قال کلہم من قریش“ یہ حدیث مختلف طریقوں اور لفظوں سے تمام اصحاب سنن و مسانید نے روایت کی ہے۔ صحیح مسلم میں صفیان بن عیینہ کے طریق ”لا یزال امر الناس ما ضیا ما ولیہم انا عشر اجلا. ثم تکلم النبی بکلمة خفیت علی. فسئلت ابی ماذا قال؟ فقال کلہم من قریش“ اور حصین بن عمران کے طریق سے ”ان هذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیہم انا عشرة خلیفة“ اور سماک بن حرب سے ”لا یزال الاسلام عزیزاً منیحا الی النبی عشر خلیفة“ مروی ہے۔ فحسی کے طریق عند ابی داؤد میں ہے ”فکبر الناس وضحوا“ اور اسامیل بن ابی خالد عن ابیہ سے اسی میں ہے ”لا یزال هذا الدین قائماً حتی ینقضی علیکم انا عشر خلیفة کلہم تجتمع الامنة علیہ“ طبرانی نے اسود بن سعید کے طریق سے اس پر زیادت کی ”لا تضرہم عداوة من عادہم“ بعض طریق میں ہے ”لا یزال هذا الامر صالحاً“ او ماضیاً (رواہما احمد) اور بزار و طبرانی نے ابو حنیفہ سے روایت کیا ہے ”لا یزال امر امتی قائماً حتی یمضی انا عشر خلیفة کلہم من قریش.“ بھی روایت ابو داؤد میں اس اضافہ کے ساتھ ہے۔ فلما رجع الی منزله اتته قریش فقالوا لم یكون ماذا؟ فقال لم یكون الھرج“ حاصل تمام روایتوں کا یہ ہے کہ آپ آئندہ کی نسبت خبر دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بارہ خلیفہ ہوں سب قریش سے ہوں گے۔ کسی دشمن کی دشمنی ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ جب تک یہ بارہ خلیفہ حکمران رہیں گے اسلام باعزت رہے گا اور لوگ خوشحال۔

اس طرز بیان کی وضاحت نے ظاہر کر دیا کہ اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس سے صرف آئندہ کی نسبت اطلاع دینا مقصود ہے حکم و شریع نہیں ہے۔ ہم نے تمام روایات و طریق نقل کر دیئے ہیں۔



کسی روایت اور طریق سے بھی ایسا لفظ ثابت نہیں جس سے حکم و تشریح نکل سکے۔

(۳) ان سب کے بعد وہ حدیث آتی ہے جس کو امام بخاری نے ”باب الامراء من قریش“ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ تمام روایات کے ساتھ یہ حدیث سامنے رکھی جائے تو پوری طرح اصلیت روشن ہو جائے گی۔ امیر معاویہؓ کی مجلس میں ایک مرتبہ ذکر آیا کہ عبد اللہ بن عمروؓ کہا کرتے ہیں۔

”سیدکون ملک من قحطان“ قحطان میں سے ایک بادشاہ ہوگا۔ امیر معاویہؓ یہ سن کر غضبناک ہوئے اور خطاب دیا بلغنی ان رجالاً منکم یحدثون احادیث لیست فی کتاب اللہ ولا توفروا عن رسول اللہ (الخ) مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں کچھ لوگ ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں کہ نہ تو قرآن میں ہیں نہ رسول سے ثابت ہیں۔ ”الی سمعت رسول اللہ یقول ان هذا الامر فی قریش، لا یعدیہم احد الا کبه الله علی وجهه ما قاموا الدین“ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ یہ بات (یعنی حکومت) قریش ہی میں رہے گی جب تک وہ دین کو قائم رکھیں گے، جو ان کی مخالفت کرے گا اللہ رسوا ہوگا یعنی کامیاب نہ ہوگا۔

اس روایت نے سارا معاملہ حل کر دیا۔ مطوم ہو گیا کہ ایک خاص وقت تک کے لیے یہ پیشین گوئی تھی اور حرف بحرف پوری ہوئی۔ یعنی آپ نے بتلادیا تھا، کہ قریش میں جب تک دین قائم رکھنے کی قابلیت رہے گی۔ حکومت انہی کے قبضے میں رہے گی جو ان کے خلاف اٹھے گا ناکام رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہی اسلامی خلافت کے وہی مالک رہے جب اس کے اہل نہ رہے، عجم و ترک نے یہ بار اٹھالیا۔ یہ حکم ان بَشَا یُنْهَبُکُمْ وَیَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِیدٍ • وَمَا ذَٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیزٍ (۱۶:۳۵) اور یَسْتَعِیْدُ قَوْمًا غَیْرَکُمْ (۳۸:۳۷) (الخ) باقی رہا امیر معاویہؓ کا ابن عمرؓ پر انکار، تو یہ بھی صحیح نہ تھا، وہ صرف یہ بات سن کر گھبرا اٹھے کہ دوسری پادشاہت بننے والی ہے، اصلیت پر غور نہیں کیا۔ قحطانی والی حدیث بطریق رفع ثابت ہے اور قریش والی حدیث میں ما قاموا الدین“ کی قید موجود ہے۔ پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اسی بنا پر ائمہ حدیث نے حدیث قحطانی اور حدیث قریش میں تعلق دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ امارت قریش والی روایت تشریح نہیں ہے محض خبر ہے اور وہ بھی ”ما قاموا الدین“ کے ساتھ مقید۔ شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ ”هذا انکار من معاویة بلا تامل، والا، فقد جاء حدیث القحطانی مرفوعاً، وما ذکر فی المعارضة، فهو حجة لما فیہ من الظہن بقوله ما قاموا الدین“ اور حافظ عسقلانی نے فتح میں ابن امین کا قول نقل کیا ہے۔ ”الذی انکرہ معاویة فی حدیث ما یقولہ بقوله ما قاموا الدین لربما کان فیہم من لا یقیمہ فیسلط القحطانی علیہ وهو کلامہ مستقیم“ (۱۳-۱۰۲) یعنی امیر معاویہؓ کا انکار کر دینا ان کی

بے غوری کا نتیجہ تھا۔ ورنہ خطائی والی بات ثابت ہے۔ امیر معاویہؓ نے جو حدیث معارضہ میں پیش کی، اس کا آخری ٹکڑا خود انہی پر حجت ہے اور ابن عمرو کی تصدیق کر رہا ہے یعنی اس میں ”ما الا ما والذین“ کی قید موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب قریش میں ایسے لوگ نہ رہیں گے جو دین قائم رکھ سکیں تو پھر کوئی غیر قرشی مسلط ہو جائے گا۔

(۴) صحیح بخاری کے ترجمہ باب سے واضح ہوتا ہے کہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے انہوں نے باب ہائے ماہی ہے۔ ”الامراء من قریش“ قریش میں امارت اور امراء اس مضمون کا باب نہیں ہائے ماہی کہ امارت ہمیشہ قریش میں ہونی چاہیے۔

(۵) امام بخاری نے ایک دوسری روایت ابن عمرؓ کی درج کی ہے جو مسلم وغیرہ میں بھی ہے: ”لا یزال هذا الامر فی قریش ما بقی منهم“۔ یعنی یہ چیز قریش ہی میں رہے گی جب تک دو آدمی ان میں باقی رہیں گے۔

اس روایت سے ہمارے بیان کی اور مزید تصدیق ہوگئی۔ حدیث کا منطوق صریح پیشین گوئی کا ہے اگر اس کا یہ مطلب قرار دیا جائے کہ جب تک دو انسان بھی خاندان قریش میں باقی رہیں گے، خلافت انہی کے قبضہ میں رہے گی تو یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ دو کی جگہ ہزاروں قرشی انسان موجود رہے اور خلافت قریش سے نکل گئی۔ پس ضرور ہے کہ ”ما بقی منهم الثمان“ کے منطوق پر مفہوم کو ترجیح دی جائے اور وہ یہی ہے کہ اگر قریش میں دو آدمی بھی ایسے باقی رہیں گے جو خلافت کے اہل ہوں گے تو کبھی خلافت کے شرف سے یہ خاندان محروم نہ ہوگا۔ مگر جب انقلاب حال سے ایسا وقت آ جائے کہ دو آدمی بھی اہل نہ رہیں تو مشیت الہی اپنے قانون انتخاب اصلاح کے مطابق دوسروں کو اس کام پر مامور فرما دے گی اور قریش خلافت سے محروم ہو جائیں گے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا یعنی مقسم کے بعد سے عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ آخر میں یہاں تک پہنچ گیا کہ حکومت دوسروں کی تھی، عباسی خلیفہ صرف اپنے عشرت کدوں کے لیے رہ گیا تھا۔ تاہم اقتدار خلافت انہی کا رہا۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ خلافت کا دھڑے کر کے کسی کسی کسی طاقتور اور باجبروت، عجمی و سلجوقی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن سب اپنا بڑے سے بڑا شرف یہی سمجھتے رہے کہ مقام خلافت سے انہیں خدمت و برآری و کارگزاری خلافت کا کوئی لقب مل جائے اور بس اگر ایک قرشی، فاطمی، عباسی، بنی تمیم کسی ہنگامہ و مقال سے بچ کر نکل جاتا تو جس گوشہ عالم میں پہنچ جاتا، ایک عالم اس کے ساتھ ہو جاتا اور اپنی حکومت قائم کر لیتا۔ گویا ہر قرشی کے وجود میں ایک خلافت پنہاں تھی۔ ایک اموی شہزادہ شام کے قتل عام سے بچ کر نکلا اور افریقہ ہو کر یورپ جا پہنچا۔ وہاں پانچ صدیوں تک کے لیے اسپین کی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہوگئی۔ لیکن جب عرب و قریش کے

حزول اور ادبار کا وہ آخری وقت آ گیا کہ دو قرشی بھی دنیا میں حکمرانی کے اہل و لائق باقی نہ رہے، تو تاریخ خلافت نے محاصرہ الٹ دیا، اور یک قلم غیر عربی و غیر قرشی خلافت کا دور شروع ہو گیا۔ وکان وعداً ملعولاً۔

(۶) اشتباہ و اضطراب کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں جب ترمذی کی وہ روایت سامنے آ جاتی ہے جس میں امارت قریش کے ساتھ دو اور باتوں کا بھی ذکر ایک ہی سلسلے اور ایک ہی اسلوب میں کیا گیا ہے اور گویا روایت امارت کے متن کا وہ ایک متم و مکمل نکلا ہے جو بقیہ طرق میں رہ گیا تھا اس طریق میں مل جاتا ہے تاکہ اس کو جوڑ کر مضمون حدیث کامل کر لیا جائے۔ قریش والی حدیث اگرچہ مختلف راویوں سے مروی ہے لیکن سب سے زیادہ اور مشہور طرق ابو ہریرہ، جابر بن سمرہ، اور ابن عمر پر جا کر ختم ہوتے ہیں اور امام مسلم، احمد، ابوداؤد طیالسی بزار، طبرانی کے تمام طریق تو حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے نکلے ہیں۔ انہی ابو ہریرہ سے بطریق ابو مریم انصاری ترمذی نے روایت کیا ہے۔ "الملك فی قریش والقضاء فی الانصار والاذان فی الحبشة" (اسناد صحیح اور امام احمد کثیر بن مرہ سے یوں روایت کرتے ہیں۔ "الخلافة فی قریش والحکم فی الانصار والدعوة فی الحبشة" (رجالہ موثقون وایضاً رواہ الطبرانی والبزار من وجہ اخر)

اس روایت میں ایک ساتھ تین باتوں کا ذکر ہے۔ خلافت قریش میں قضاء حکم انصار میں اور اذان و دعوة اہل حبش میں۔ پس جو معنی ایک بات کے ہوں گے وہی بقیہ دو کے ہوں گے اور جو مطلب دو باتوں کا ہوگا وہی پہلی بات کا بھی ہوگا۔ اگر پہلی بات (یعنی قریش کی حکومت) بیان حال اور پیشین گوئی نہیں ہے امر و تشریح ہے تو بقیہ دو جملوں کو بھی امر و تشریح قرار دینا پڑے گا یعنی ماننا پڑے گا کہ قاضی ہمیشہ انصاری ہی ہونا چاہیے اور مؤذن بجز حبشی کے دوسرا ہو نہیں سکتا لیکن معلوم ہے کہ آج تک نہ کسی نے ایسا کہا، نہ یہ مطلب سمجھا، نہ قضاء و اذان کے لیے کوئی شرعی اشتراط ملک و نسل کا تسلیم کیا گیا ہے۔

پس جو مطلب ان دو باتوں کا ہے وہی خلافت قریش کا بھی ہے۔ یا تو یہ بیان حال ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسا ہوا آپ خود قرشی تھے اور مسلمانوں کے امیر و رئیس کل قضاء پر اکثر انصار مامور ہوئے اور اذان حضرت بلال دیتے تھے۔ پس "الملك فی قریش، والقضاء فی الانصار والاذان فی الحبشة" کی تقسیم ہوگئی تھی یا آئندہ کی نسبت خبر ہے کہ حکومت قرشیوں کے ہاتھ میں رہے گی۔ قضاء پر انصاری مامور ہوں گے اور اکثر ایسا ہوگا کہ مؤذن حبشی ہوں، کوئی خاص آنے والا عہد پیش نظر ہوگا۔ اسی کی نسبت یہ خبر آپ کی زبان مبارک پر طاری ہوگئی۔

(۷) اس حدیث کے جو متون و اسناد صحیحین نے اختیار کیے ہیں۔ ان کے بعد سب سے زیادہ

مشہور روایت وہ ہے جس کو ابو داؤد طیالسی، امام احمد ابو یعلیٰ، طبرانی وغیرہم نے حضرت ابو بکرؓ اور انس سے روایت کیا ہے۔ "الائمة من قریش ما حکموا فعدلوا و وعدوا، فوفوا، واسترحموا" اور طبرانی نے حضرت علی سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ "الا ان الامراء من قریش ما قاموا لئلا" (الخ) اسی متن کو امام بخاری نے تاریخ میں اور طیالسی و بزار نے مسند میں حضرت انس سے یوں بھی روایت کیا ہے "الائمة من قریش ما اذا حکموا فعدلوا"، نسائی و حاکم نے بھی ایک دوسرے طریق سے یہ روایت لی ہے حاصل ان سب کا یہ ہے کہ فرمایا امراء اور ائمہ قریش میں سے ہیں جب تک ان میں عدل گستری، ایفاء عہد اور رحم و شفقت کے اوصاف باقی رہیں گے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہو گیا کہ قریش کی خلافت اہلیت و صلاحیت کے ساتھ مشروط تھی یعنی پہلے ہی سے کہ دیا گیا تھا کہ جب تک صفات حسنہ ان میں باقی رہیں گے، خلافت انہی کے قبضہ میں رہے گی۔ یہ بات نہ تھی کہ تشریحاً ہر حال میں خلافت کو انہی کا حق بتلایا ہو۔

(۸) اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بعض روایات میں قریش کی نسبت بصورت ظلم و جور عدم اجراع شریعت، سخت کلمات و عید بھی آئے ہیں۔ حتیٰ کہ کلمہ "لعن" بھی آیا ہے یہ بھی صاف صاف موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سعت عادلہ کے مطابق ایسے لوگوں کو ان پر مسلط کر دے گا جن کا تسلط ان کے لیے سخت اذیت و عقوبت کا موجب ہوگا۔ چنانچہ طبرانی کی سابق الذکر روایت "ما القاموا لئلا" (الخ) میں یہ بھی ہے "لعن لم يفعل ذلك فعليه لعنة الله" یعنی تمیں وصف عدالت، ایفاء عہد اور رحم و شفقت کا بیان کر کے فرمایا اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس پر اللہ کی پھینکا اور احمد ابو یعلیٰ نے حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً روایت کیا "یا معشر قریش! انکم اهل هذا الامر ما لم تعدلوا، فاذا غیرتم، بعث الله علیکم من یلحاکم كما یلحی القضیب" (وجاله لقات الا اله من رواہ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود، عن عم ابیہ عبد اللہ بن مسعود، ولم یدرک و ایضاً اخرجه احمد عن ابی مسعود الانصاری من طریق عبید اللہ ولی سماعہ نظر، وله شاهد من مرسل عطاء بن یسار۔ اخرجه الشافعی والبیہقی بسند صحیح) یعنی اے جماعت قریش! جب تک تم کوئی نئی روش اختیار نہ کرو تم ہی اس بات کے اہل ہو لیکن اگر تم نے اپنی حالت بدل دی تو یاد رکھو اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم کو چھری کی طرح موڑ دیں گے۔

پس ان روایات سے دونوں باتوں کی حرید تصدیق ہو گئی۔ اول یہ کہ خلافت قریش کے تمام ایامات محض خیر ہیں۔ تخریب و امر نہیں۔ ثانیاً، پہلے سے خبر دے دی گئی ہے کہ ہمیشہ خلافت انہی میں نہیں رہے گی۔ چنانچہ حرف بحرف یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور قریش پر یکے بعد دیگرے ایسے لوگ مسلط ہوئے

جنہوں نے ان کا سارا زور توڑ دیا حتیٰ کہ حکومت قریش کا دنیا میں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ فصلی اللہ علی الصادق المصدوق الذی لا یغیر عن شئی الا و جاء مثل فلق الصبح

(۹) چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے خلافت کو قریش میں مخصوص ثابت کرنا چاہا ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ان تمام روایات کا منطوق خبر کا ہے نہ کہ امر کا اور کوئی حدیث ایسی قوی ظاہر الدلالت موجود نہیں جس سے ان کا مدعا ثابت ہو سکے۔ وہ مجبور ہوئے ہیں کہ انہی احادیث کو تاویل و توجیہ کر کے اس امر پر محمول کریں۔ حافظ ابن حجر نے قرطبی کی نسبت لکھا ہے۔ "کانه جنح الی انه خبر بمعنی الامر" (۱۰۳: ۱۰۵) اور ابن نمیر نے کہا والحدیث وان کان بلفظ الخبر فهو بمعنی الامر کانه قال انتموا بقریش خاصة" (ایضاً)

پس اس پر سب متفق ہیں کہ الفاظ حدیث میں صورت خبر کی ہے امر کی نہیں اور جب دلیل قوی و ظاہر موجود نہیں۔ نہ قرآن میں، نہ سنت میں، نہ اقوال صحابہ میں تو پھر کیا مجبوری پیش آئی ہے کہ تاویلات اختیار کی جائیں اور نص کو بلاوجہ ظاہر و منطوق سے معروف کیا جائے۔

(۱۰) اس حدیث کی تمام روایات و طرق پر ہم نے نظر ڈال لی۔ اب صرف دو روایتیں اور رہ گئیں جو مناقب قریش میں آئی ہیں اور جن سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے۔ بیہقی اور طبرانی نے جبیر بن مطعم اور ابن سائب سے روایت کیا۔ "قدموا قریشا ولا تعدواھا"، یعنی قریش کو مقدم رکھو یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ قریش کو ہر بات میں آگے رکھو۔ خود پیچھے رہو۔

لیکن قطع نظر قوت و ضعف روایت کے، اس سے بھی یہ بات نہیں نکلتی کہ قریش کے سوا دوسرے کی خلافت جائز نہیں۔ قریش کو عرب میں ہر طرح تقدیم و ریاست حاصل تھی۔ لوگ ان کی ریاست سے متاثر تھے پس فرمایا کہ اس بات کا لحاظ رکھا کرو۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ امامت و خلافت کے حقدار ہمیشہ قریش ہی رہیں!

دوسری روایت امام احمد نے عمرو بن العاص سے روایت کی ہے آنحضرت نے فرمایا "قریش لاداة الناس" قریش لوگوں کے سردار ہیں۔ لیکن اس کو بھی اختصاص خلافت کے سوال سے کوئی تعلق نہیں یہ تو معلوم ہے کہ سردار قوم تھے لیکن اس کا حکم کہاں ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ صرف انہی میں سے ہو سکتا ہے! کیا ایک ایسے اہم مسئلہ کے لیے اس طرح کی باتیں یقین کا کام دے سکتی ہیں؟

(۱۱) باقی رہی حدیث "الائمة من قریش" اور یہ استدلال کہ حضرت ابو بکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے مجمع میں بخلاف انصار قریش کی اور سب نے تسلیم کر لیا تو اس سے بھی شرعاً اختصاص قریش کے دعوے کو کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

اولاً تو یہ الفاظ اور حضرت ابوبکر والی روایت بطریق اتصال ثابت ہی نہیں۔ فتح الباری میں

ہے:

”الائمة من قریش (رجالہ ورجال الصحیح لکن فی سندہ القطاع)“ (۱۰۱:۱۳)

ہائیا اس سے بھی یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا شرعاً حق بجز قریش کے اور کسی مسلمان کو نہیں؟ یہ بھی آئندہ کی نسبت خبر ہے اور انہی حدیثوں کا ایک ٹکڑا ہے جو دوسری طریقوں سے صریحاً پیشین گوئی کے لفظوں میں پڑھ چکے ہو۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات اس لیے پیش کی تھی کہ پیشتر سے ہونے والے واقعات کی خبر دے دی گئی ہے۔ پس ایسا ہی ہونا ضروری ہے اس کے خلاف بات نہ اٹھاؤ۔ یہ سن کر انصار مایوس ہو گئے اور تسلیم کر لیا۔

ثالثاً۔ ”الناس تبع لقریش“ والی روایت سے مدد لی جائے تو بالکل کھل جاتا ہے کہ سقیفہ میں حضرت ابوبکر کا استدلال صرف قریش کی بزرگی و عظمت اور عرب میں ان کی ریاست و سرداری سے تھا نہ کہ شرعاً شرائط امامت سے۔ وہ بتلانا چاہتے تھے کہ خود آنحضرتؐ نے فرما دیا ہے جاہلیت اور اسلام، دونوں میں لوگ قدرتی طور پر قریش کی سرداری سے متاثر ہیں اور رہیں گے اس لیے یہ معاملہ بھی انہی کے قبضہ میں رہے گا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا یہ مشہور جملہ اس مطلب کو پوری طرح کھول دیتا ہے جو سقیفہ میں کہا تھا ”ان العرب لا تعرف هذا الامر لغور هذا الحي“ یعنی اہل عرب قریش کے سوا اور کسی قبیلہ کی سرداری سے آشنا نہیں۔ پس یہاں سرے سے شرائط شرعیہ کا سوال ہی نہ تھا۔ صرف ملکی و قومی مصالح کی بنا پر استدلال تھا کہ کس قبیلہ و خاندان سے امام ہونا چاہیے۔ جس کی سرداری عرب کے تمام قبائل بلا چون و چرا تسلیم کر لیں!

رابعاً یہی روایت بعض دیگر طریق سے صاف صاف خبر کی صورت میں آئی ہے۔ امر و تشریح کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ ابن اسحاق نے کتاب الکبیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابر بکرؓ نے سقیفہ کے مجمع میں فرمایا۔ ”ان هذا الامر فی قریش ما اطاعوا الله واستقاموا علی امره“ (فتح ۱۰۳:۱۳)

یعنی یہ بات قریش میں رہے گی جب تک وہ اللہ کی اطاعت کریں گے اور اس میں مستقیم رہیں گے پس معلوم ہوا کہ امام احمد والی روایت میں راوی نے بقیہ ٹکڑا چھوڑ دیا ہے۔ صرف ”الائمة من قریش“ لے لیا ورنہ حضرت ابوبکرؓ نے وہی بات فرمائی تھی جو دیگر احادیث مرفوعہ میں بطور خبر کے ثابت ہو چکی ہے۔ علی الخصوص بخاری کی روایت معاویہ میں۔



## حواشی

۱۔ اللہ اللہ، اس ہارے میں اسلام وہی روان اسلام کے معاملات کیسے عجیب و غریب رہ چکے ہیں؟ آج مسلمانوں کو جو طرح طرح کے خاندانی امتیازات و تفریقات کی بت پرستانہ پرستش کر رہے ہیں، کیونکر یاد دلایا جائے کہ کسی زمانے میں اللہ اور اس کے رسول کے رشتہ کے سوانہ کوئی رشتہ مقبول تھا، نہ عمل کی بزرگی کے سوا بزرگی تسلیم کی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ انہی اسامہؓ کی نسبت ناقابل فراموش ہے ان کے لڑکے عبداللہؓ نے ایک بار شکایت کی کہ تقسیم اموال میں اسامہؓ بن زیدؓ سے مجھے کم درجہ پر کیوں رکھا جاتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا۔ ”کان ابوہ احب الی رسول اللہ من ابیک وکان احب الی رسولی اللہ منک۔ اس لیے کہ تیرے باپ سے زیادہ اس کا باپ اللہ کے رسول کو پیارا تھا اور اس لیے کہ وہ خود بھی تجھ سے زیادہ رسول اللہ کے نزدیک محبوب تھا۔ یعنی بنائے استحقاق ہماری آپس کی رشتہ داریاں نہیں ہو سکتیں اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک جو محبوب ہو وہی سب سے زیادہ حقدار ہے اور اسی کو ہر طرح کی برائی پہنچتی ہے۔ ایسے صد ہا واقعات ان عہدوں میں گزر چکے ہیں۔ اسلام نے یہ انقلاب اس ملک میں پیدا کر دیا تھا جہاں کا بچہ بچہ غرور و نسل و خاندان کے نشہ میں بدست رہتا تھا۔ جو مغرور و قریش کل تک قبائل یثرب کے شرفا کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے تھے کہ جنگ بدر میں ان سے مقابل ہوں وہ اب غلاموں اور غلام زادوں کی سرداری بھی مان لینے کے لیے بلا چون و چرا تیار ہیں۔ سلطان اسلام کے لڑکے کے استحقاق پر ایک غلام زادہ کو ترجیح دی جا رہی ہے وہ گردن جھکا دیتا ہے اور تسلیم کر لیتا ہے۔

## دعویٰ اجماع

اب صرف ایک بات رہ گئی یعنی علماء اسلام کا شرط قرشیت پر زور دینا اور قاضی عیاض وغیرہ کا دعویٰ اجماع، تو اس بارے میں چند امور قابل غور و نظر ہیں۔

اولاً اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ صحابہ خلافت کا شرعاً مستحق صرف قریش ہی کو یقین کرتے تھے بلکہ اس کے خلاف شواہد موجود ہیں۔ امام احمد نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے۔ اگر معاذ بن جبلؓ میری وفات تک زندہ رہے تو اپنے بعد انہی کو خلیفہ بناؤں گا۔ یہ ظاہر ہے کہ معاذ قرشی نہ تھے انصار مدینہ سے تھے۔ اگر خلافت کے لیے قرشیت شرط ہوتی تو حضرت عمرؓ جیسا محرم اسرار خلافت کیونکر ان کی خلافت کا تصور بھی کر سکتا تھا؟ مسند امام احمد میں حضرت عمرؓ کا ایک اور قول بھی ابورافع کی روایت سے موجود ہے۔ ”لو ادرکنی احد رجلین ثم جعلت هذا الامر الیہ، اولفت بہ. سالم مولیٰ حدیفہ و ابو عبیدہ الجراح“ اگر سالم مولیٰ حدیفہ اور ابو عبیدہ الجراح میں سے کوئی ایک میری وفات تک زندہ رہتا اور خلافت اس کے سپرد کر دیتا تو مجھے اس بارے میں پورا اطمینان و اعتماد ہوتا۔ اگر حضرت عمرؓ صدہا صحابہ و مہاجرین قریش کی موجودگی میں سالم مولیٰ حدیفہ کو خلافت سپرد کر دینے کا ارادہ کر سکتے ہیں تو پھر کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ شرعاً خلافت غیر قرشی کو نہیں مل سکتی اور صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا تھا!

چنانچہ اس بات کا خود ائمہ متاخرین کو اعتراف کرنا پڑا۔ حافظ ابن حجر قاضی عیاض کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔ ”قلت ویحتاج من نقل الاجماع الی تاویل ماجاء عن عمر من ذالک. فقد اخرج امام احمد عن عمر بسند رجالہ، لقات ان ادرکنی اجلی (الخ)“ الی ان قال ”فیحمل ان یقال لعل الاجماع انعقد بعد عمر علی اشتراط ان یکون الخلیفہ قرشیاً، او لغير اجتهاد عمر فی ذلک واللہ اعلم (۱۰۶:۱۳) یعنی یہ جو قاضی عیاض نے کہا کہ خلافت کے مخصوص پر قریش ہونے پر اجماع ہو چکا ہے تو اجماع ماننے کی صورت میں حضرت عمرؓ کے قول کی تاویل کرنی پڑے گی جو امام احمد نے بسند صحیح معاذ بن جبلؓ کے استحکام کی نسبت روایت کیا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اس کی یوں تاویل کی جاسکتی ہے کہ شاید یہ اجماع حضرت عمرؓ کے بعد ہوا ہے یا یوں کہا جائے کہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد اس بارے میں بدل گیا۔

لیکن یہ تاویلیں جس قدر ناقابل التفات ہیں، اہل نظر سے مخفی نہیں۔ اول تو جب اختصاص



قرشیت کے لیے کوئی نص شرعی موجود نہیں تو تاویل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ طائفا کہاں تو یہ دعوے کیا جاتا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے وقت سقیفہ کے مجمع ہی میں اس مسئلہ کا فیصلہ ہو گیا اور تمام صحابہ نے اجماع کر لیا کہ خلافت کے حقدار صرف قریش ہی ہیں اور کہاں اب یہ تاویل کی جاتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا پورا زمانہ خلافت گزر گیا اور اجماع نہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کی زمانہ خلافت کے دس برس گزر گئے اور صحابہ اس حکم سے بے خبر رہے لیکن اس کے بعد کیا ایک اس پر اجماع ہو گیا! پھر اگر اجماع ہوا تو کب؟ اور کوئی دلیل اس بارے میں موجود ہے؟

اگر سقیفہ نبی ساعدہ میں اجماع نہیں ہوا نہ خلافت صدیقی کے ڈھائی سال میں یہ مسئلہ چھڑا اور نہ عہد فاروقی کے بہترین دس سالوں میں صاف ہوا جو فقہ و علم کی تنظیم و تحقیق کا اصلی عہد تھا تو پھر کیا یہ اجماع اس وقت منعقد ہوا جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ہنگامہ ہوا تھا یا اس وقت جب جمل و صفین کے میدان کا رزار گرم ہوئے تھے!

اصل یہ ہے کہ واقعات کے تسلسل و تواتر سے خود بخود ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ لوگوں کو اجماع کا خیال پیدا ہو گیا۔ یعنی چونکہ ابتداء سے خلافت پر قریش ہی کا قبضہ ہوا اور یکے بعد دیگرے تمام سلاسل حکومت قرشی ہی ہوئے اس لیے لوگوں نے سمجھ لیا کہ شرعی فیصلہ بھی یہی ہے اور اس پر اجماع ہو گیا ہے ورنہ اجماع صحابہ کا کوئی ثبوت موجود نہیں اور نہ عرصہ تک کسی خاص خاندان میں حکومت کا رہ جانا دلیل تشریح و انعقاد اجماع ہو سکتا ہے۔ خود خلفاء عباسیہ کے عہد میں متعدد غیر قرشی مدعی اٹھے اور بعضوں کا ساتھ ہزاروں مسلمانوں نے دیا۔ وہ نہ خوارج میں سے تھے۔ نہ معتزلہ میں مگر یقین کرتے تھے کہ غیر قرشی خلیفہ ہو سکتا ہے۔ حجاج کے زمانہ میں ابن الاصفہ نے خروج کیا اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ حالانکہ قرشی نہ تھا۔ اندلس اور افریقہ میں عبدالمومن صاحب ابن توئمرت نے خلافت کے دعوے کے ساتھ حکومت قائم کی اور اس کی نسل میں عرصہ تک قائم رہی۔ ابن توئمرت کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ معتزلی تھا؟ وہ امام غزالی کا شاگرد اور پکا اشعری تھا۔ عقائد اشاعرہ میں اس کا ایک رسالہ موجود ہے۔ مراکشی نے تاریخ مراکش میں تصریح کی ہے کہ بلا مغرب میں اشعریت اسی کے ذریعہ پہنچی اور اسی لیے خاندان عبدالمومن کا سرکاری مذہب ہمیشہ اشعری رہا لیکن یہ لوگ بھی قرشی نہ تھے۔ علاوہ برس خودائمه اشاعرہ میں سے بعض نے اس شرط سے انکار کیا ہے۔ جیسا کہ امام ابوبکر باقلانی کی نسبت ابن خلدون نے تصریح کی ہے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ جس اجماع کی نسبت دعوے کیا جا رہا ہے اور جو کبھی حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے مجلس سقیفہ میں رونما ہوتا ہے۔ کبھی وہاں سے ردپوش ہو کر ساڑھے گیارہ برس تک مفقود ہو جاتا ہے اور حضرت عمرؓ قرشی کے استخلاف کا ارادہ کرنے لگتے ہیں پھر ان کے بعد کیا ایک نمایاں ہونا چاہتا ہے لیکن

پھر بھی اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ حتیٰ کہ غیر قریشیوں کو ہزاروں مسلمان خلیفہ مان لیتے ہیں اور ائمہ عقائد و کلام مختلف فیہ نظر آتے ہیں۔ فی الحقیقت اس کا کوئی وجود ہے بھی نہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ نہیں ہے۔

ثانیاً یہ ظاہر ہے کہ قریش میں خلافت ہونے کی نسبت جو کچھ فرمایا گیا وہ محض آئندہ کی پیشتر سے اطلاع تھی۔ یعنی پیشین گوئی تھی اور پیشین گوئیوں کا یہ حال ہے کہ جب تک ان کا ظہور کامل طور پر نہ ہو جائے، ان کے معانی و مطالب کی نسبت کسی قطعی بات کا اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اجتہاد و قیاس کے لیے کسی چیز میں اتنی وسعت نہیں جس قدر پیشین گوئیوں میں ہوتی ہے علی الخصوص جبکہ عموماً پیشین گوئیوں کا ایک خاص بہم انداز بیان ہوتا ہے اور نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ محض اشارات کیے جاتے ہیں۔ جب تک ان کا ظہور نہ ہو جائے اشارات کی تفصیل اور اوصاف کے انطباق میں طرح طرح کی لغزشیں پیش آ جاسکتی ہیں۔

ظہور و جمال کی پیشین گوئی اس معاملہ کے لیے ایک واضح مثال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے تمام غیر معمولی اوصاف بیان کر دیے تھے۔ ہاں اس ہر خود صحابہ کرام میں اختلاف ہوا اور اپنے عہد کے مختلف اشخاص کو بعض اوصاف کے اشتراک کی وجہ سے دجال سمجھتے رہے۔ آنحضرت کے زمانے ہی میں ابن صیاد کی نسبت حضرت عمر کو خیال ہوا تھا حتیٰ کہ اس کو قتل کرنا چاہا جیسا کہ امام بخاری کی روایت ابن عمر مندرجہ کتاب الجنازہ میں موجود ہے اور ایک دوسری روایت مندرجہ کتاب الاعتصام ہالسنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو اس پر اس درجہ یقین تھا کہ قسم کھا کر کہتے تھے۔ یعنی دجال ہے اور اسی لیے ابن جابر کو بھی اس پر پورا یقین تھا۔ "راہت جابر بن عبد اللہ یحلف باللہ ان ابن الصیاد الدجال اسی طرح الوداد کی روایت نافع میں حضرت عبد اللہ بن عمر کی نسبت مروی ہے کہ قسم کھا کر کہتے تھے۔ واللہ ما اشدک ان المسیح الدجال هو ابن صیاد، لیکن دیگر صحابہ کو اس سے اختلاف تھا۔ ابو سعید خدری سے جب ابن صیاد کی صحبت ہوئی تو ان کا شک دور ہو گیا۔ حتیٰ کہ حضرت کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے (کمانی المسلم) اور مسلم میں قصہ حیم واری موجود ہے جس کی بنا پر لوگوں کو ابن صیاد کے دجال ہونے سے انکار تھا۔

پس چونکہ یہ پیشین گوئی تھی اس لیے مشکل تھا کہ جب تک تمام واقعات پوری طرح ظاہر نہ ہو جائیں، ان کا ٹھیک ٹھیک مطلب متعین کیا جاسکے۔ خلافت کا یہ حال رہا کہ گو ابتداء سے بہت مدتی اٹھے مگر فی الجملہ نویں صدی ہجری تک قریش ہی میں رہی اور اسی بات کی احادیث میں بھی خبر دی گئی تھی، جن علماء کی رائے پیش کی جاتی ہے، وہ سب وہی ہیں جن کا ظہور ساتویں صدی اور اس سے پیشتر یعنی

عہد خلافت قریش میں ہوا۔ پس ضرور تھا کہ معاملہ خلافت کو ابتداء سے قریش ہی میں محدود رکھ کر یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ خلافت اسی خاندان سے شرعاً بھی مخصوص ہے اور یہی مطلب تمام احادیث کا ہے۔ اگر وہ بعد کا حال دیکھتے تو معلوم کر لیتے کہ مقصود تشریح و حکم نہ تھا محض خبر دی گئی تھی۔ وہ ان حدیثوں کا مطلب صرف اپنے وقت تک کے حالات کی روشنی ہی میں دیکھ رہے تھے اور اس کے لیے مجبور و معذور تھے۔

حافظ نوادی شرح مسلم میں لکھتے ہیں۔ "وقد ظهر ما قاله صلعم لمن زمنه الى الان الخلفاء في قریش من غير مزاحمة لهم فيها، وبقی كذلك ما بقی منهم اثنان" (جلد ۲-۱۲۹) یعنی جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اب تک خلافت بغیر کسی رکاوٹ کے قریش ہی میں رہی اور آئندہ بھی ہمیشہ انہی میں رہے گی۔ جب تک دو قرشی بھی دنیا میں باقی رہیں گے۔

حافظ نوادی کا سال وفات ۶۷۶ھ ہے اور سال پیدائش ۶۳۱ھ یا اس سے بھی پہلے۔ آخری خلیفہ بغداد المستعصم کو ہلاک کرنے ۶۵۶ھ میں قتل کیا۔ پس گویا ان کی وفات قنہ تا مار کے بعد ہوئی۔ لیکن تصنیف و تالیف کا زمانہ المستعصم کی خلافت ہی کا زمانہ ہے۔ اگر شرح مسلم وغیرہ بالکل آخری عمر کی تصنیف ثابت ہو جائے تو پھر خلفاء عباسیہ مصر کا زمانہ ہوگا کہ فی الجملہ قریش کی خلافت قائم تھی۔ پس وہ اپنے زمانے تک خلافت کو صرف قریش ہی میں قائم دیکھ کر احادیث باب کے اسی مطلب پر قانع اور حے ہوئے ہیں اور اسی لیے "ما بقی منهم اثنان" کا بھی یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ جب تک خاندان قریش کے دو انسان بھی دنیا میں باقی رہیں گے، خلافت انہی میں رہے گی۔

لیکن اگر ان کو اپنے بعد کا حال معلوم ہوتا تو کیا ایسا دعوے کر سکتے تھے؟ کیا اس صورت میں اپنی تمام رائے پر نظر ثانی نہ کرتے؟ کیا وہ جانتے تھے کہ عنقریب صفحہ اٹنے والا ہے اور خلافت نہ صرف قریش سے بلکہ عرب ہی سے رخصت ہو جانے والی ہے۔

اس سے بھی زیادہ بہتر مثال حافظ سیوطی کی ہے۔ حافظ موصوف عباسیہ مصر کے آخری عہد میں تاریخ الخلفاء اور حسن الحاضرہ لکھ رہے ہیں یعنی ہزارویں صدی کے اوائل میں۔ چونکہ اس وقت تک مصر میں عباسی خاندان منصب خلافت پر ممتاز تھا اور گو عالم اسلامی بہت سی نئی گجی حکومتوں میں بٹ چکا تھا۔ تاہم لقب خلافت بجز عباسیہ مصر کے اور کسی کے قبضہ میں نہ تھا اس لیے انہوں نے تاریخ الخلفاء کے ابتداء میں ایک باب باعہا ہے۔ احادیث المبشرۃ بالخلافت بنی عباس۔ اس میں وہ تمام روایتیں جمع کی ہیں جن میں عباسیہ کو خلافت پانے کی بشارت دی ہے اور کہا ہے کہ تمہاری خلافت حضرت عیسیٰ کے نزول تک رہے گی۔ چنانچہ ابو نعیم کی روایت میں ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن عباس پیدا ہوئے تو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہو ابو الخلفاء حتی یکون منهم السفاح حتی یکون منهم المہدی، حتی یکون منهم من یصلی بعیسیٰ بن مریم“ یعنی آپ نے فرمایا عبد اللہ بن عباس خلفاء کا پاپ ہے یہاں تک کہ انہی خلفاء میں سے سفاح ہوگا اور انہی میں سے مہدی ہوگا اور انہیں میں وہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ کے ساتھ نماز پڑھے گا۔

اگرچہ یہ تمام روایتیں قطعاً جمعوتی ہیں۔ ابو مسلم خراسانی وغیرہ عباسی داعیوں کی بنائی ہوئی ہیں، اور تمام ائمہ حدیث و نظر نے ان کے خرافات و وضعی ہونے پر اتفاق کیا۔ لیکن چونکہ اس وقت تک عباسیوں میں خلافت کا انتساب باقی تھا اور واقعات کی بنا پر اس پیشین گوئی کی تکذیب نہیں ہو سکتی تھی۔ نیز عباسی خلافت کا حاکمانہ اثر ان روایات کی مقبولیت کا باعث ہو رہا تھا۔ اس لیے حافظ سیوطی ان کے لیے ایک خاص باب قائم کرتے ہیں اور اگر کسی روایت کو سنبھالنے کا ذرا سا بھی موقع مل جاتا ہے تو نہیں چھوکتے۔ چنانچہ ابو نعیم اور دیلمی کی روایات سے کچھ تعرض نہیں کیا ہے، حالانکہ حافظ مزنی، ابن دقل العید، ابن کثیر وغیرہم نے سخت انکار کیا ہے اور ابن جوزی کتاب الموضوعات میں لائے ہیں اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دیا چڑھیں، بنو عبید کی خلافت پر بحث کرتے ہوئے ان احادیث سے یقین کے لہجہ میں استدلال کرتے ہیں ”ان الحدیث ورد بان هذا الامر اذا وصل الی بنی العباس لا ینخرج عنہم حتی یسلمون الی عیسیٰ بن مریم او المہدی“ (تاریخ الخلفاء ۸۰) یعنی یہ بات حدیث میں آچکی ہے کہ جب خلافت آل عباس تک پہنچے گی تو پھر انہی کے قبضہ میں رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ حضرت عیسیٰ یا امام مہدی کے سپرد کر دیں گے۔

لیکن اگر حافظ سیوطی پچیس برس اور زائد رہے اور دیکھ لیتے کہ خلافت و حکومت کا نام و نشان تک عباسیہ میں باقی نہ رہا تو پھر ان کو پورا پورا یقین ہو جاتا کہ عباسیہ کو آخر عہد تک خلافت و پادشاہت کی کوئی بشارت نہیں دی گئی ہے اور یقیناً یہ تمام حدیثیں وضعی ہیں جیسا کہ ائمہ اثر فیصلہ کر چکے ہیں۔

چنانچہ یہ بات صاف صاف تتبع و نظر سے واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت عباسیہ، بغداد کے تنزل اور عجمی حکومت کے ظہور و عروج کے ساتھ ہی علماء کی آراء میں بھی تدریجی تغیر شروع ہو گیا تھا اور اشتراط قرشیت میں وہ زور باقی نہ رہا تھا جو قاضی عیاض وغیرہ کی مصنفات میں پایا جاتا ہے۔ اکثر علماء نے جب دیکھا کہ ”مالا ماوالدین“ کی شرط کا ظہور شروع ہو گیا ہے اور حکومت قریش کے قبضہ سے نکل گئی ہے تو ان کی رائے بدل گئی اور قاضی عیاض والے اجماع کے دعوے میں تامل کرنے لگے۔ علامہ ابن خلدون (التولد سنہ ۷۳۲) مقدمہ تاریخ میں شرط قرشیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لما ضعف امر قریش، وتلاشت عصبیتهم بما نالهم من الترف والنعم وبما انفقتهم الدولت فی

سائر اقطار الارض عجزوا عن حمل الخلافة وتغلبت عليهم الا عجم و صار الحعل  
والعقد لهم فاشعبه ذلك على كثير من المحققين، حتى ذهبوا الى نفى اشتراط  
القرشية و عولوا على ظواهر في ذلك مثل قوله صلعم : اسمعوا و اطيعوا وان امر  
عليكم عبد حبشي ما اقام فيكم كتاب الله“ یعنی جب قریش کی قوت کمزور ہوگئی۔ عیش پرستیوں  
میں پڑ کر اپنی عصبيت مٹا دی۔ خلافت کا بوجھ اٹھانے سے عاجز ہو گئے تو عجمیوں نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا  
اور خلافت کا فیصلہ انہی کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہ انقلاب دیکھ کر بہت سے محققین کے نزدیک قریشیت کی  
شرط مشتبہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس شرط سے انکار کر دیا۔ انتہا

اشاعرہ کے امام الامام القاضی ابوبکر باقلائی نے بھی یہی مذہب اختیار کیا تھا کہ قریشیت کی شرط  
ضروری نہیں۔ یہی ابن خلدون لکھتے ہیں۔ ”ومن القائلين بنفى اشتراط القرشية القاضى  
ابوبكر الباقلائي“

عماسیہ بغداد کے انقراض کے بعد مصر میں عباسی خلافت کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس لیے اس  
عہد کے علماء مصر نے (مثلاً حافظ ابن حجر، قاضی عینی، جلال الدین سیوطی وغیر ہم) قرشی خلافت کو فی الجملہ  
قائم پایا۔ لیکن جب یہ نقش بھی مٹ گیا اور وہ زمانہ آیا جس کی خبر دے دی گئی تھی کہ ”بعث الله عليكم  
من يلهاكم كما يلهى القضيف“۔ تو جو اہل نظر اس انقلاب کے بعد پیدا ہوئے، انہوں نے  
صاف صاف لکھ دیا کہ اشتراط قریشیت کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ خلافت قریش کا وہ مطلب ہے جو اب تک  
سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ تیرہویں صدی کے مشہور مجدد و فقہ وحدیث امام شوکانی یعنی ”وہل العمام“ میں شرط  
قریشیت کے دلائل نقل کر کے لکھتے ہیں۔ ”لاریب ان فی بعض هذه الالفاظ ما يدل على الحصر  
ولكن قد خصص مفهوم الحصر احاديث وجوب الطاعة لغير القرشي“۔ ”الے ان قال“  
والاخبار منه صلعم بان الائمة من قریش هو كالاخبار منه بان الاذان فی الحبشة  
والقضاء فی الازد، وما هو الجواب عن هذا، فهو الجواب عن ذلك وتخصيص كون  
الائمة من قریش ببعض بطونهم لا يتم الا بدليل والاخذ بما وقع عليه الاجماع لا  
شك انه احوط واما انه يتحتم المصير اليه، فليس بواضح، ولو صح ذلك، لزم  
بطلان اكثر مادونوه من المسائل والمقام والمراکز، و ما حقه بان لا يكون كذلك“  
یعنی اگرچہ امامت قریش کی روایت میں ایسے الفاظ ہیں جن سے قریش کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے لیکن  
دعوت طاعت امام کے جو عام احکام کتاب وسنت میں موجود ہیں وہ دلالت کرتے ہیں کہ غیر قرشی کی بھی  
اطاعت امت پر قرشی ہی کی طرح واجب ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ آنحضرت نے قریش میں امامت کی

خبردی، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے سوا کوئی دوسرا امام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ویسی ہی خبر ہے جیسی اس بارے میں خبردی کہ اذان کا کام اہل جیش میں ہے اور قضا از دیوں میں۔ جس طرح ان ردائوں سے یہ بات نہیں نکلتی کہ سوذن اور قاضی صرف جیشی اور ازدی ہی ہونے چاہئیں، اسی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ امام صرف قرشی ہی ہو سکتا ہے، جو جواب ان کا دیا جائے گا وہی اس کا ہوگا۔

یہ واضح رہے کہ جن جن علماء حدیث و کلام کے اقوال سے یہ اجماع ثابت کیا جاتا ہے، وہ سب کے سب اسی عہد کے ہیں جبکہ خلافت عباسی قائم تھی بعد والوں نے جو کچھ لیا ہے انہی سے لیا ہے۔ سب سے زیادہ اعتماد اس بارے میں قاضی عیاض کے بیان پر کیا جاتا ہے جن کا قول نوادی نے شرح مسلم اور منہاج میں نقل کیا ہے ان کا سال وفات ۵۴۳ھ ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ اجماع کے دعوے نے عام طور پر جو وسعت اختیار کر لی ہے اور جس طرح بتدریج اس لفظ کا استعمال اپنے لغوی و اصولی معنی سے ہٹ کر مختلف معطلہ معنوں میں ہونے لگا ہے، اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے علی الخصوص فقہاء مذاہب کے استعمالات <sup>بتکلیف</sup> اور ارباب اصول کے معطلہ اجماع سے بالکل مختلف ہیں۔ ہر مذہب کے فقہاء بلا تامل اپنے مسلک کو ”جمہور“ اور ”اجماع“ کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اس میں کسی کا مطلب کچھ ہوتا ہے کسی کا کچھ۔ صاحب ہدایہ وغیرہ کے نزدیک عدم وجوب قرأت فاتحہ خلف امام اور افضلیت اسفار جمہور کا قول ہے بعضوں نے اجماع تک کہہ دیا لیکن شوافع و محدثین کہتے ہیں کہ قرأت فاتحہ ہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی پر جمہیر علماء کا اتفاق ہے۔ انہی حافظ نوادی کی (جو شرائط قریشیت کو جمہور کا مذہب بتلاتے ہیں) شرح مسلم دیکھ لی جائے کہ کس طرح شافعیہ کا ہر مذہب ان کے نزدیک ”جمہور“ کا مذہب ہے اور مخالف کا ہر قول شاذ۔ شافعیہ اور حنفیہ کی خلافت میں تقریباً دو تہائی مسائل تو ضرور ایسے ہوں گے جن کی نسبت ہر جگہ شرح مسلم میں پاؤ گے۔ ”ہذا مذہب الشافعی والجماعیہ، ومخالف فیہ ابوحنیفہ“ یعنی امام شافعی اور جمہور کا مذہب یہی ہے مگر امام ابوحنیفہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اگر ہمارے علماء احناف حافظ نوادی کی ان تمام جمہوریات و اجماعیات کو تسلیم کر لینے کے لیے تیار ہیں تو خیر شرائط قریشیت کا ایک اجماع اور سبکی لیکن یاد رہے کہ یہ وہی بات ہوگی کہ:

گوشت خاک ماہم بر باد رفت باشد

تائید ہمارا خیال ہے کہ یہ بات بھی اور بے شمار باتوں کی طرح وقت کے سیاسی اثرات کا نتیجہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ معاملہ خلافت ابتداء سے سخت کش کش و تزاحم میں رہا۔ جو خاندان قابض ہوا اس کو رقیبوں اور دعوے داروں کی طرف سے ہمیشہ کھٹکا لگا رہا۔ بس جبکہ خلافت اہل عرب کے ہاتھ میں تھی تو وہ

کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ جمیوں کے دلولوں کی اس بارے میں جرات افزائی کی جائے اور عرب میں سے بھی جب خاص خاندان قریش میں تھی جو ہر طرح سیادت و بزرگی رکھتا تھا تو وہ کیونکر پسند کر سکتے تھے کہ غیر قرشی خلافت کا وجود تسلیم کر کے غیر قرشیوں کو ہمتیں دلائی جائیں اور مادی طاقت کے ساتھ شریعت کی حمایت کا سہارا بھی انہیں حاصل ہو جائے۔ بخاری کی روایت میں پڑھ چکے ہو کہ امیر معاویہ نے قحطانی پادشاہ کے ظہور کی روایت سنی تو کس وجہ مضطرب اور غضب ناک ہوئے اور کس طرح فوراً قریش والی روایت کا اعلان کر دیا تاکہ پہلے ہی سے سدباب ہو جائے۔ جن علماء کے اقوال پر متاخرین فقہاء و متکلمین کا اعتماد ہے وہ سب کے سب وہی ہیں جن کا ظہور آخر عہد عباسیہ میں ہوا ہے جب قرشی خلافت قائم تھی۔ مثلاً قاضی عیاض و امام نووی وغیرہم۔ بس وقت کی حکومت کا جو پلٹیکل اثر سب پر پڑا تھا وہ بھی یہی تھا کہ خلافت کو حکمران خاندان کی قوم اور خاندان سے مخصوص سمجھا جائے اور تمام ایسی باتوں میں جس میں اجتہاد رائے کو دخل ہو، فکر و قیاس کا میلان قدرتی طور پر اسی جانب ہو جائے علی الخصوص جبکہ اس کے لیے کسی فلفلی بیانی یا تحریف احکام کی بھی ضرورت نہ تھی۔ واقعی احادیث موجود تھیں صرف مفہوم کے تعین میں اجتہاد کو کام کرنا تھا اس مسئلہ پر موقوف نہیں، وقت کے پلٹیکل اثرات بے شمار چیزوں میں اندر ہی اندر کام کر چکے ہیں اور آج ان کا پتہ لگانا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب خلافت بغداد کا خاتمہ ہو گیا تو آہستہ آہستہ اس اثر سے انکار خالی ہونے لگے اور بتدریج بحث و نظر کی صورت دوسری ہو گئی حافظ عسقلانی اور قاضی عینی جو آٹھویں صدی یا نویں کے اوائل میں بخاری کی شرح لکھ رہے ہیں ان کے مباحث پڑھو تو قاضی عیاض اور نووی سے ان کا رنگ مختلف نظر آئے گا۔

قاضی عینی بخاری کی حدیث معاویہ ”ما قالوا للدين“ کی شرح میں لکھتے ہیں: ”ای مدت القامتہ امور الدین۔ قبل یتحمل ان یکون مفہومہ فاذا لم یقیموہ لایسمع لہم“ یعنی یہ جو حدیث میں ہے کہ ”جب تک دین قائم رکھیں گے“ تو اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ وقت آجائے کہ قریش اقامت دین نہ کریں تو ان کی بات نہیں سنی جائے گی۔ حافظ عسقلانی کو اشتراط شریعت سے صاف صاف انکار نہیں کرتے لیکن طرز بحث و نظر کے اضطراب و ضعف نے خود بخود مسئلہ کا مخالف پہلو قوی کر دیا ہے اور یہ ایک نظر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس بارے میں کوئی مضبوط رائے نہیں رکھتے اور اگر مائل ہیں تو انکار کی طرف۔ اشتراط شریعت کے مریدین کے جس قدر دلائل ہیں ان میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں جس پر انہوں نے متکین اعتراضات نہ کیے ہوں اور وہ مجروح ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ جو صاحب عزید بعیرت حاصل کرنی چاہیں، فتح الباری جلد ۳ کتاب الاحکام کے ابواب ”الاسراء من قریش“ اور السمع والطاعة للامام“ ملاحظہ فرمائیں۔

غرضیکہ جہاں تک تمام احادیث و دلائل پر نظر ڈالی جاتی ہے اشتراط قرشیت کے لیے کوئی نص موجود نہیں اگرچہ بصورت اشتراط بھی موجودہ مسئلہ خلافت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ موجودہ مسئلہ انتخاب امام کا نہیں ہے امام قائم و نافذ کی امامت و اطاعت کا ہے۔



KITABOSUNNAT.COM



## خلافت آل عثمان چند لمحات تاریخیہ

اب بہتر ہوگا کہ تھوڑی دیر کے لیے ہم آگے بڑھنے سے رک جائیں اور گزشتہ تیرہ صدیوں کی طرف مڑ کے دیکھیں کہ خلافت اسلامیہ کے مختلف دوروں کا کیا حال رہا ہے!

الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ“ میرے بعد خلافت خاصہ تیس (۳۰) برس تک رہے گی، کی خبر کے مطابق خلفاء راشدین کا دور ۳۰ برس تک رہا۔ اللہ سے شروع ہوا اور ٹھیک ۳۰ھ تک باقی رہا۔ اسی سنہ سے بنو امیہ کی خلافت کا دور شروع ہوتا ہے اور ۴۲ھ سے ۱۳۲ھ تک قائم رہتا ہے اس کے بعد خلافت نے ایک نیا ورق الٹا اور خاندان عباسیہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ خلافت کا سب سے بڑا سلسلہ یہی ہے جو ۱۳۲ھ سے ۶۵۲ھ تک قائم رہا۔ چونکہ کامل پانچ صدیوں تک حکمرانی ایک ہی گھرانے میں رہی اس لیے وہ تمام چینی و جسمانی اور اجتماعی و مدنی فسادات کمال درجہ تک پیدا ہو گئے جو ہمیشہ امتداد سلطنت اور عروج تمدن کے لازمی نتائج رہے ہیں۔ قریش کی نسبت فرمایا تھا۔ ”ما الامو المدین“ جب تک وہ دین قائم رکھیں گے حکومت انہی میں رہے گی۔ سواب ٹھیک ٹھیک وہ وقت آ گیا تھا، قریش و عرب میں دین قائم رکھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ قیام وین کا کام دوسری قومیں اور طاقتیں انجام دے رہی تھیں پس وہی ہوا جو تاریخ عالم کے ہر ایسے دور میں ہوتا آیا ہے۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکوخاں تاتاری نے بغداد پر حملہ کیا اور آخری خلیفہ عباسی المستعصم باللہ کے خون نے بہہ کر ہمیشہ کے لیے عربی و قرشی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ مستعصم کا قتل فی الحقیقت عربی خلافت کا قتل تھا۔

وما كان لبس هلكه هلك واحد

ولكنه بنیان قوم تہدما

یہ سب کچھ ہو چکا مگر ابھی پیشین گوئی کی ایک آخری سطر باقی تھی۔ یعنی بقی منهم الثمان“ قریش سے حکومت نکل جائے گی پر حکومت نکل جانے پر بھی ان کی عظمت رفتہ کا یہ اثر باقی رہے گا کہ اگر دو قریشی بھی کسی گوشہ میں نکل آئیں گے تو لوگ خلافت کا انہی کو مستحق مانیں گے۔ بغداد میں قرشی خلافت مٹی، لیکن مٹنے مٹنے بھی ایک آخری نقش چھوڑ گئی۔ وہ بغداد کی خون آلود خاک سے اکھڑا اور تین سو برس

تک کے لیے مصر میں جا کر جم گیا۔ البتہ یہ جماد قرشی حکومت کا جماد نہ تھا محض اس کے نقش قدم کا تھا۔

گوکہ ہم صفحہ ہستی پہ تھے اک حرف غلط

لیکن اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

عباسی خاندان کے دو چار آدمی بغداد کے قتل عام سے بچ کر کھل گئے تھے۔ ان ہی میں مستعصم کا چچا احمد بن ظاہر عباسی بھی تھا۔ وہ ۶۶۰ھ میں مصر پہنچا۔ وہاں ابوبی خاندان کے ممالک کی حکومت قائم تھی اور ملک ظاہر ہیرس حکمران تھا۔ اس کو احمد کے خاندان کا حال معلوم ہوا تو منصب خلافت کا حقدار تسلیم کر لیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

احمد بن ظاہر نے المستعصر باللہ کا لقب اختیار کیا اور ہیرس کی معیت و اعانت حاصل کرنے کی کوشش کی کہ دار الخلافت بغداد کو تاتاریوں کے تسلط سے نجات دلائے لیکن کامیابی نہ ہوئی اور لڑائی میں شہید ہوا۔

اب پھر وہ وقت آ گیا تھا کہ قریش سے خلافت کا انتساب بالکل معدوم ہو جائے لیکن ”ما بقی منهم الاثنان“ کی پیشین گوئی آخر تک اپنے عجائب دکھانے والی تھی۔ قتل عام بغداد سے ایک اور عباسی شہزادہ ابوالعہاس احمد بن علی بچ کر کھل گیا تھا اور حلب میں مخفی تھا۔ اس کا حال ہیرس کو معلوم ہوا تو بڑے اعزاز و اکرام سے مصر لایا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حاکم بامر اللہ کے لقب سے وہ مشہور ہوا۔ اور اسی کی نسل میں مصر کی عباسی خلافت ۲۹۱ برس تک قائم رہی۔ یعنی ۶۶۰ھ سے سنہ ۹۵۳ھ ہجری تک۔

اس عرصہ میں عالم اسلامی دو صدیوں تک طرح طرح کے انقلابات و حوادث سے دو بالا ہو کر پلا خرا یک نئے دور میں منتقل ہو چکا تھا۔ عثمانی ترکوں کی حکومت قسطنطنیہ میں قائم ہو کر یورپ اور ایشیا کے اندر ہر طرف پھیل رہی تھی۔ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء مسیحی) میں سلطان سلیم خاں اول نے مصر و شام پر قبضہ کیا اور آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے تمام حقوق و امتیازات خلافت اس کے سپرد کر دیے۔ حقوق خلافت کے علاوہ جو چیزیں اس سلسلہ میں سلطان سلیم کو دی گئیں، ان میں سب سے بڑی چیز مقامات مقدسہ حرمین کی کنجیاں تھیں اور بعض آغا رنویہ مثلاً آنحضرت کی تلوار، جھنڈا، ایک چادر یہ۔ آغا راس وقت تک قسطنطنیہ میں بطور سند خلافت کے موجود ہیں۔ اسی تاریخ سے عثمانی سلطانین نمایاں طور پر ”خلیفہ“ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے اور حجاز اور مصر و شام کے منبروں پر ان کا ذکر بہ حیثیت امیر المؤمنین کے ہونے لگا۔ حج کی امداد بھی انہی کے قبضہ میں آ گئی جو شرعاً خلافت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔

سلسلہ خلافت کی یہ ایک جھل تاریخی ہے۔ بالفرض خلیفہ متوکل عباسی نے سلطان سلیم کے ہاتھ

پر بیعت نہ کی ہوتی جب بھی آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قدرتی نتیجہ یہی تھا کہ تمام عالم اسلامی کی خلافت کا منصب عثمانی سلاطین ہی کے قبضہ میں آ جائے۔ وقت کی جو اسلامی سلطنت سب سے بڑی اور سب سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی ہو، وہی شرعاً خلافت کا منصب رکھ سکتی ہے گزشتہ چار صدیوں کے اندر اسلامی حکومتوں کے انقلابات کا جو حال رہا ہے ان کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حق بجز اس سلطنت کے اور کسی سلطنت کو مل سکتا تھا؟ خود ہندوستان میں سلاطین مظہر کی حکومت قائم تھی۔ وہ ہندوستان کے اندر اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے لیکن عالم اسلام کی خلافت عظمیٰ کا دعویٰ کبھی ان کے وہم و خیال میں بھی نہیں گزرا اور اگر گزرتا تو دنیا ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ ابتدا سے لے کر آخر تک مقام خلافت کی جو اہم و مشترک خصوصیات رہی ہیں اور جن کو تمام دنیا کے مسلمانوں نے عملاً بطور اسنادِ خلافت کے تسلیم کر لیا ہے، وہ خلفاء عباسیہ کے بعد صرف عثمانی سلاطین ہی کو حاصل ہوئی۔ کوئی دوسری اسلامی حکومت اس عام اقتدار و اختیارات کے ساتھ قائم نہ ہو سکی۔



## حواشی

۱۔ تاتار کا ظہور مسلمانوں کے لیے وہی معاملہ تھا جو بنی اسرائیل کے لیے بخت نصر کے ظہور میں بَعَثْنَا عَلَيْنِكُمْ عِبَادَةَ النَّارِ اُولٰٓئِیْ ہُنَّ سِدِّیْدٌ فَعَاوَزُوْا جِلْلَ الدِّیَارِ ط وَتَمَّانَ وَعَدَا مُفْعُولًا (۵: ۱) بہ حکم ہاتھی علی امعی ما اتی علی بنی اسرائیل حدو النعمل (صحیحین) اس امت پر بھی وہ سب کچھ گزرنے والا ہے جو بنی اسرائیل پر گزر چکا۔ بنی اسرائیل پر غفلت و ضلالت کے دو سب سے بڑے دور آئے۔ اس لیے دو ہی مرتبہ عام بربادی بھی چھائی اور ان کی تہذیب کے لیے دو جاہر و قاہر قومیں مسلط ہوئیں: وَقَضٰیْنَا اِلٰی نَبِیِّۡہِۡمُۡ اِسْرَآءِیْلَ لَیْلِۡ لَیْلِ الْکِنْتِ لِنَفْسِلُنَّہِۡمُۡ الْاَازْہٰضِ مَرَاتِبِہِۡمُۡ وَتَلْعَلُنَّ غُلُوْا کَیْبِیْرًا (۳: ۱۷) پہلی بربادی بخت نصر کے ہاتھوں ہوئی۔ عبادا اولیٰ ہاس شدید۔ اور دوسری ٹیلس قیصر روم کے ہاتھوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح اس امت پر بھی طغیان و عصیان کے دو بڑے وقت آنے والے تھے اور ان کے نتائج دو معذب قوموں کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ قوم تاتار اور اقوام یورپ، بنی اسرائیل کی پہلی بربادی خود ایشیا ہی کی ایک قوم کے ہاتھوں ہوئی۔ یعنی اہل بابل کے ہاتھوں اور دوسری کا ظہور یورپ سے ہوا۔ یعنی روم سے ٹھیک اسی طرح اس امت کے لیے بھی پہلا فتنہ ایشیا کا تھا۔ دوسرا یورپ کا۔ پہلا ہو چکا۔ دوسرا ہور ہا ہے۔

## خلافت و امامت سلاطین عثمانیہ

اس عارضی وقفہ کے بعد اب ہم پھر آگے بڑھتے ہیں۔ سلطان سلیم خاں اول کے عہد سے لے کر آج تک بلا نزاع سلاطین عثمانیہ ترک تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام ہیں۔ ان چار صدیوں کے اندر ایک مدعی خلافت بھی ان کے مقابلہ میں نہیں اٹھا۔ بنو امیہ اور بنو عباسیہ کے عہدوں میں بے شمار قیاموں اور دعویداروں کی کش مکش نظر آتی ہے۔ لیکن سلاطین عثمانیہ کی خلافت کی پوری تاریخ میں کسی ایک مدعی خلافت کا نام بھی ڈھونڈ کر نہیں نکالا جاسکتا حکومت کے دعویدار سیکڑوں اٹھے ہوں مگر اسلام کی مرکزی خلافت کا دعویٰ کوئی نہ کر سکا۔

صدیوں سے اسلام و بلاد اسلام کی حفاظت کی تلوار صرف انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ صدیوں سے صرف انہی کا سینہ اسلام کی راہ میں زخمی ہے اور صرف انہی کی لاشیں اسلام کے لیے خاک و خون میں تڑپتی ہیں۔ اور صرف انہی کی ذمہ داری پر تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں نے اسلام کی مرکزی حفاظت کا کاروبار سونپ رکھا ہے۔ دنیا کے خواہ کسی گوشہ میں کوئی مسلمان ہو اگر وہ بحیثیت ایک مسلمان کے اسلام کا چوتھا رکن حج ادا کرنے کے لیے لکھتا ہے تو عرفات کے میدان میں کھڑے ہو کر اس کو عثمانی امامت کی دینی ریاست قبول کرنی پڑتی ہے اور حج کا فریضہ عثمانی خلیفہ ہی کے بیچے ہوئے نائب کے ماتحت انجام دیتا ہے۔ شریف حسین نے غیر مسلم بحارین کا ساتھ دے کر اگر بغاوت کی اور حجاز کو قسطنطنیہ کے اقتدار حکومت سے الگ کر لیا تو یہ فساد و عدوان کی ایک عارضی حالت ہے جو شرعاً معتبر نہیں۔ حجاز حکماً اب بھی خلیفہ قسطنطنیہ کی حکومت ہی کا ایک جز ہے اور تمام مسلمانان عالم کا شرعاً فرض ہے کہ حرمین کو باغیوں کے تصرف سے نکالنے کی کوشش کریں اور اس وقت تک کرتے رہیں جب تک بغاوت اور باغیوں کا بالکل استیصال نہ ہو جائے اگر ایسا نہ کریں گے تو ہر مسلمان اس کے لیے عند اللہ جواب دہ ہوگا۔

تمام کرۂ ارضی کے مسلمان آرام و عیش کے دن بسر کرنے اور فارغ البالی کے ہنر پر سونے کے لیے ہیں۔ لیکن صرف وہی ایک ہیں جو سارے مسلمانوں کی عزت و ذمہ داری کے بچاؤ کے لیے صدیوں سے تلوار کے سائے تلے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں ہیں۔ کمال پانچ صدیوں سے یورپ اور ایشیا کا سب سے بڑا رقبہ ان کے خون سے رنگین ہو رہا ہے۔ ایک چوتھائی صدی بھی آج تک ایسی نہیں گزری کہ دشمنوں کی تلواروں نے انہیں سہلت دی ہو۔ ان کا جرم اس

کے سوا کچھ نہیں کہ جب اسلام کا محافظ دنیا میں کوئی نہ رہا۔ ساری کمواریں ٹوٹ گئیں سارے بازو شل ہو گئے تو پانچ صدیوں سے وہ کیوں اسلام کے بچاؤ کے لیے باقی ہیں؟ اور کیوں وہ وقت آنے نہیں دیتے جب اسلام کی پولیٹیکل طاقت کا بالکل خاتمہ ہو جائے؟

بددستی تو خصمند عالمے باسن

ہزار دشمن ویک دوست مشکل افتاد است

پس تیرہ سو برس کے متفقہ عقیدہ و عمل کے مطابق وہی آج تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام اور ”اولا الامر“ ہیں ان کی اطاعت و حمایت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و حمایت ہے۔ ان سے پھرنا اور ان کو اپنے جان و مال سے مدد نہ دینا اللہ اور اس کے رسول سے پھرنا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو اپنی جان و مال کی طرف سے صاف جواب دے دینا ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا اگرچہ صرف بالشت بھر باہر ہوا ہو، اور اسی حالت میں مر گیا اس کی موت اسلامی زندگی کی موت نہ ہوگی بلکہ جاہلیت کی موت ہوگی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو، اگرچہ روزہ رکھتا ہو، اگرچہ اپنے زعم باطل میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو جس نے ان کے مقابلہ میں کمواریں اٹھائی وہ مسلمانوں میں سے نہیں اگرچہ دنیا اس کو مسلمانوں میں سمجھتی ہو۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی شہادت، اس کی شریعت کی ان گنت اور بے شمار دلیلیں، ایک ہزار تین سو برس سے مانا ہوا اسلام کا حکم و عقیدہ، اسلام کی سینکڑوں نسلوں اور لاتعداد گھرانوں کا تعامل و اجماع اور سورج کی کرنوں کی طرح یقینی اور قطعی حقیقت یہی بتلا رہی ہے اور ہر مسلمان کے دل پر نقش ہے۔ ایک مسلمان کے لیے بشرطیکہ وہ ساری باتوں سے مقدم اپنے اسلامی تعلق کو سمجھتا ہو اور دنیا سے ایک مومن کا اعتقاد و عمل ساتھ لے کر جانا چاہتا ہو اس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جاہل سے لے کر عالم تک، مزدور سے لے کر نظام و کن تک کوئی نہیں جس کا دل اس اعتقاد سے خالی ہو۔ زندگی کا عشق اور نفس کی پرستش جس انسان سے چوری کراہتی ہے، ڈاکے ڈالواتی ہے، قتل کراتی ہے، اس انسان سے کیا عہد ہے کہ آج کسی طمع یا خوف سے عثمانی خلافت کا انکار کر دے یا عثمانی خلیفہ کی اطاعت و حمایت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے؟ دنیا کی پوری تاریخ انسانی کمزوریوں کی ورد انگیز مثالوں سے لبریز ہے۔ پس یہ کوئی عجیب واقعہ نہ ہوگا اگر آج چند نئی مثالوں کا مزید اضافہ ہو جائے۔ لیکن حقیقت ہر حال میں حقیقت ہے۔ اس سے انکار کیا جاسکتا ہے لیکن اس کو چھپایا نہیں جاسکتا اس سے انماض کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اس سے آنکھیں بند کر لی جاسکتی ہیں لیکن اس کی زبان بند نہیں کی جاسکتی۔

ہم یہاں قصداً ترکوں کی سیاسی و تمدنی کارگزاریوں کی بحث نہیں چھیڑیں گے۔ ہم کو معلوم

ہے کہ مسلمانوں کی تمام مکران جماعتوں میں ترکوں ہی کی جماعت وہ بد قسمت جماعت ہے جس کے لیے

کوئی یوروپین دماغ منصف نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا پچھلا مورخ ہو، خواہ موجودہ عہد کا مدبر، وہ گزشتہ عہد کے بدتر سے بدتر مسلمانوں کی مدح و توصیف کر سکتا ہے جو اب موجود نہیں ہیں لیکن ان ترکوں کی نہیں کر سکتا جن کی تلواریں پانچ صدیوں سے یورپ کے دل و جگر میں پیوست ہونے کے لیے چمکتی رہی ہیں۔ وہ خلافت بنو امیہ کی ایک بہتر تاریخ لکھ سکتا ہے، عباسیہ کے دور علم و تمدن کی مدحت سرائی کر سکتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی تک کو ایک بت کی طرح پوج سکتا ہے لیکن وہ ان ترکوں کے لیے کیونکر انصاف کر سکتا ہے جو نہ تو عرب پر قانع ہوئے، نہ ایران و عراق پر، نہ شام و فلسطین کی حکومت ان کو خوش کر سکی، نہ وسط ایشیا کی بلکہ تمام مشرق سے بے پروا ہو کر یورپ کی طرف بڑھے، اس کے سین قلب (تسطنظیہ) کو مسخر کر لیا اور اس کی اندرونی آبادیوں تک میں سمندر کی موجوں کی طرح در آئے۔ حتیٰ کہ دار الحکومت آسٹریا کی دیواریں ان کے جولان قدم کی ترک تازیوں سے بارہا گرتے گرتے بچ گئیں!

ترکوں کا یہ وہ جرم ہے جو یورپ کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کا ہر وہ حکمران اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا مگر ہر ترک وحشی و خونخوار ہے اس لیے کہ یورپ کا طلسم سلطوت اس کی شمشیر بے پناہ سے ٹوٹ گیا۔

ترکوں نے پانچ صدیوں تک جس آزادی و فیاضی کے ساتھ حکومت کی ہے، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ چار صدیوں کی متصل حکمرانی کے بعد بھی محکوم عیسائیوں کی مذہبی و قومی مصیبت ویسی ہی زندہ و توانا رہی جیسی کسی متعصب سے متعصب مسیحی حکومت کے ماتحت رہ سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ترکوں کی کمزوری کے ساتھ ہی آزادی و مختار ہو گئے اور آج ایک حریف و مقابل کی طرح لڑ رہے ہیں۔

ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے پورے تسلط کو ابھی پورے سو سال بھی نہیں ہوئے۔ اتنے ہی عرصہ کی حکومت نے قومی عظمت و مصیبت کے جذبات ان لوگوں کے دلوں سے بھی سمجھنے لیے ہیں جن کے آباؤ اجداد ساٹھ ستر برس پہلے اسی سرزمین میں حکمران تھے۔ صرف یہی ایک چیز یورپ کے طرز حکومت اور ترکوں کے طرز حکومت کا فرق واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

ترکوں کے وہم و خیال میں بھی ظلم و خونخواری کی وہ ہیبت ناک صورتیں اور قومی تعصب و نفرت کی وہ وحشت ناک ہلاکتیں نہیں آسکتیں جو یورپ کے تمدن و تہذیب کا مفروضہ بت عین انیسویں اور بیسویں صدی کے سورج کی روشنی میں ایشیا و افریقہ کے اندر کر چکا ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر جنگل کے درعے آرام کی نیند سوئے اور سانپوں کو ان کی غاروں سے باہر نہیں نکالا گیا، لیکن ایشیا و افریقہ میں یورپ کے ہاتھوں زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہ بچ سکا جس کو وہاں کی بد بخت مخلوق اپنی زمین کہہ سکے اور جہاں ایک مالک و مختار کی طرح امن و عزت کی زندگی بسر کر سکے۔

خود اسی آخری جنگ میں یورپ کے ہر درندے نے دوسرے درندے کو جس طرح حیرا، چھاڑا اور ہر سفید بھیڑیے نے دوسرے سفید بھیڑیے پر جس طرح بچہ مارا نہ صرف ترکوں کی تاریخ میں بلکہ تمام ایشیا کی خونریزیوں کی مجموعی تاریخ میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

ہاں ہمہ ترک خونخوار اور وحشی ہیں اور یورپ تہذیب و تمدن اور امن و رحم کا پیغمبر ہے۔ علی الخصوص برطانیہ کے مقدس جزیرہ میں تو جس قدر فرشتے بیٹے ہیں وہ صرف انسانی آزادی کی حفاظت اور چھوٹی قوموں کی حمایت ہی کے لیے آسمان سے اتارے گئے ہیں!

یہ کہہ ارض کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے۔ آج اس کی فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ زمین فوجوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ فضا ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ جو خدا کا دائمی قانون نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت کا اعلان کرے گا اور مورخ کا قلم لکھے گا کہ یہ طاقت اور گھمنڈ کا سب سے بڑا چیلنج تھا جو سچائی کو دیا جاسکتا ہے۔ تاہم سچائی ہی سب سے بڑی طاقت ہے اور بالآخر فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَقُوا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۶۲:۳۳)

بہر حال ہماری بحث سے یہ موضوع باہر ہے۔ ترکوں کی حکمرانی جیسی کچھ بھی رہی ہو ہر ترک سلطان حجاج بن یوسف اور خالد قسری جیسے اشرار بنو امیہ سے بھی بدتر کیوں نہ رہا ہو۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے مسلمان حاکموں کی اطاعت کا ہر حال میں حکم دیا گیا ہے اور ان کا از روئے شرع یہی عقیدہ ہے کہ وہ خلیفہ اسلام ہیں۔ اس میں کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق نہیں۔

نمی دانم زمنغ گر یہ مطلب چوست تا صبح را

دل از من دیدہ از من آستین از من کنار از من



## حواشی

۱۔ آج ترکوں کی وحشت و تمدن کا فیصلہ علم و تحقیق کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حریف حکومتوں کے ان مغرور وزراء کے قبضہ میں ہے جو میلہ ان جنگ سے واپس آ کر اپنے ایک جنگی دشمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔ پس امید نہیں کہ ڈرپر (Draper) جیسے زمانہ حال کے مورخوں کی شہادت اس بارے میں سنی جائے۔ امریکن

مصنف اپنی مشہور کتاب **History of the Conflict Between Religion and Science** میں لکھتا ہے کہ انصاف و عدالت اور مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کی تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو وہی فوقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو متزل یافتہ بیزنٹائن پر حاصل تھی۔ ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو تہذیب و تمدن اور علمی ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے پندرہویں اور سولہویں صدی کے تمام یورپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے انسا نکلو پیڈیا کی قسم کی کتابیں لکھنے کا ترکوں ہی کی تقلید سے یورپ میں رواج ہوا۔ یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلی انسا نکلو پیڈیا ڈی الیمبرٹ (Delembart) نے لکھی۔ لیکن اس کو ایک ترک مصنف کلیبی بے کی قاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے رہنمائی ملی تھی۔ کسریٹ، رسد رسائی اور فوجی شفا خانوں کا باقاعدہ انتظام ترکوں ہی سے یورپ نے سیکھا۔ قلعہ کی تعمیرات میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد ہے۔ فوجی باجا تمام یورپ نے ترکوں سے حاصل کیا۔ چچک کے ٹیکے کا اصلی موجد ایک ترک تھا۔ ڈریپر کریسی، کنکینڈم کلرڈ وغیرہ مورخوں کی تحقیق ہے۔ جنہوں نے اپنے کتب خانوں میں بیٹھ کر ترکوں کے اعمال پر نظر ڈالی تھی۔ قدرتی طور پر سٹرا لیکو۔ تھ اور مسٹر لائڈ جارج کی رائے اس سے مختلف ہونی چاہیے جو ابھی ابھی گیلی پولی اور عمارہ میں ترکوں کی تلوار کا کاری زخم کھا کر نکلے ہیں اور کتب خانوں کی جگہ نظارت خانوں کے اندر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔



## مسلمانان ہند اور خلافت سلاطین عثمانیہ

جب تک بغداد کی خلافت باقی رہی ہندوستان کے تمام حکمران خاندان اسی کے زیر اثر اور فرمانبردار رہے۔ عباسیہ بغداد کی خلافت جب مٹ گئی اور ۶۶۰ھ میں مصر کی عباسی خلافت کا سلسلہ شروع ہوا تو اگرچہ یہ عباسیہ کے کاروان رفتہ کا محض ایک نمود غبار تھا، تاہم تمام سلاطین ہند اس کی حلقہ بگوشی و غلامی کو اپنے لیے موجب فخر و امتیاز سمجھتے رہے اور مرکزی خلافت کی عظمت دینی نے انہیں مجبور کیا کہ اپنی حکومت کو شرعی طور پر منوانے کے لیے مقام خلافت سے پروا نہ نیابت حاصل کرتے رہے۔ سلطان محمد بن تغلق شاہ کے فرور حکومت کا یہ حال تھا کہ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی اس کو ”ہمت فرخونی و فرودی“ سے تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ فرور جو وہ کر سکا، یہی تھا کہ اپنے تئیں خلیفہ مصر کا سب سے بڑا فرمانبردار غلام اور چا کر ظاہر کرے اور رعایا کو یقین دلانے کہ بلا اس کے حکم میں تم پر حکومت نہیں کرتا۔ تاریخ برنی میں ہے۔

”امیر المومنین خلیفہ را بندہ ترین ہمہ بندگان بود، بے امر و بے فرمان اودست در امور اولوالا امری نزد“ (مطبوعہ ایشیا تک سوسائٹی صفحہ ۳۶۰)

برنی نے سلطان فیروز شاہ کے فضائل و سوانح کے لیے گیارہ مقدمہ میں ترتیب دیئے ہیں۔ ان میں نواں مقدمہ یہ ہے۔

”مقدمہ نهم در آنکہ دو کرت از حضرت امیر المومنین خلیفہ دلی الامری منشور اذن لوائے شاهی بر سلطان مصر فیروز شاہ رسیدہ، و بادشاهی و اولوالا امری خداوند عالم بدان استحکام گرفت۔“

پھر اسی مقدمہ میں لکھتا ہے۔

”در مدت شش سال دو کرت از امیر المومنین منشور اولوالا امری و خلیفہ شاهی و لوائے سلطنت بدو رسید، و حق جل و علی پادشاہ دین پرور مارا در عزت داشت منشور و خلیفہ و فرستادگان را توفیق بخشید و شرائط حرمت مرا امیر المومنین بالغایب بجا آورد و ہم چہیں دانست کہ منشور و خلیفہ امیر المومنین از آسمان منزل شدہ و از درگاہ مصطفیٰ صلعم رسیدہ عرض داشتے با تہجد و ہدایا در نہایت تواضع بندگی امیر المومنین رواں کردائخ (صفحہ ۵۹۸)

یعنی سلطان فیروز شاہ کے فضائل و معاثر میں سے ایک بڑی بات یہ بھی گئی کہ خلیفہ مصر نے اجازت حکومت کا پروانہ اور الوا و خلعت بھیجا اور بادشاہ کو اس کی اطاعت و حرمت کی توفیق ملی۔ فیروز شاہ نے اس بات کی اس درجہ قدر کی گویا آسمان سے یہ عزت نازل ہوئی اور خود بارگاہِ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو قبولیت کی سند مل گئی ہے!

شمس الدین سراج عقیق نے تاریخ فیروز شاہی میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ جب خلیفہ کے سزا شہر کے قریب پہنچے تو فیروز شاہ خود استقبال کے لیے پیدل نکلا۔ فرمان خلافت کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر بوسہ دے کر سر پر رکھا اور اسی طرح سر پر دھرے ہوئے دربار حکومت تک واپس آیا۔

غور کرو! مقام خلافت کی عظمت و جبروت کا اثر کس درجہ عالمگیر رہا ہے؟ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی خلافت کی صرف برائے نام نسبت اس درجہ ہیبت و جبروت رکھتی تھی کہ ہندوستان جیسے دور دراز گوشہ میں ایک عظیم الشان فرمانروائے الکیم، اذن و اجازت ہو جانے پر فخر کرتا ہے اور مٹنے پر بھی اس مقام کی عظمت تمام عالم اسلام پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ وہاں کا فرمان آسانی فرمان اور وہاں کا حکم بارگاہِ نبوت کا حکم سمجھا جاتا ہے۔

مظلیہ سلطنت خلفاء مصر کے آخری عہد میں قائم ہوئی۔ ہندوستان میں بابر شاہ کی قسمت آزمائیوں کا زمانہ تھا۔ جب سلطان سلیم خاں (ترکی) کے ہاتھ پر خلیفہ متوکل عباسی نے بیعت کی اور جازو شام میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعلان ہوا۔ شاہان مظلیہ اگرچہ ہندوستان میں خود اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے اور ہاتھ پر حکومت یہ حق انہیں حاصل بھی تھا، تاہم عام اسلامی خلافت کا انہوں نے کبھی دھڑے نہ کیا۔ ہمیشہ عرب و شام کے مسلمہ خلفاء ہی کو خلیفہ تسلیم کرتے رہے۔ شہنشاہ اکبر اور شاہ جہان بھی اگر حج کے لیے جاتے تو ان کو قسطنطنیہ کے خلیفہ ہی کی امارت میں حج ادا کرنا پڑتا۔ میدانِ عرفات میں وہ خود خطیب نہ ہوتے۔ قسطنطنیہ کا نائب السلطان خطبہ دیتا۔ وہ کھڑے ہو کر اسی طرح سنتے جس طرح ایک عام مسلمان ان کے بغل میں کھڑا رہا ہوتا۔ شرعاً و عقلاً تسلیم خلافت کے لیے اس سے زیادہ اور کون سی بات ہو سکتی ہے؟

بعض یورپین اخبارات کے مشرقی نامہ نگاروں نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ترکی حکومت سے باہر ترکی خلافت کا اعتقاد زیادہ تر سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کی سسی سے پیدا ہوا اور ان کا مقصود اس سے یہ تھا کہ نام نہاد ”پان اسلامزم“ تحریک کو تمام مسلمانان عالم میں پھیلا دیا جائے یہاں ہم یورپ کے مزومہ و متوہمہ ”پان اسلامزم“ کی حقیقت سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ ”پان

اسلام حرم“ سے اگر مقصود مسلمانوں کی بلا امتیاز وطن و قومیت باہمی برادری ہے تو اس کی تاریخ سلطان عبدالحمید کے زمانے سے نہیں بلکہ نزول قرآن و ظہور اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن عثمانی خلافت کے عالمگیر اسلامی اعتقاد کو سلطان عبدالحمید سے منسوب کرنا ایک ایسی بات ہے جو یا تو حد درجہ جہل کا نتیجہ ہے یا حد درجہ دروغ گوئی کا اور ہم نہیں جانتے کہ دونوں میں سے کس چیز کو محققین یورپ کے لیے استعمال کریں۔ ۹۲۳ھ میں جب بچہ سلطان سلیم خاں سلاطین عثمانیہ خلیفہ المسلمین تسلیم کیے گئے تو اس وقت عالم اسلامی کا یہ حال تھا کہ ایران میں سلاطین صفویہ کی حکومت تھی۔ ہندوستان میں مغلیہ کی، اندرون بحین میں ائمہ زیدیہ کی اور اندرون عرب میں خود مختار قبائل اور بعض شیوخ کی۔ پس جہاں جہاں اسلامی حکومتیں موجود تھیں، وہاں کے مسلمانوں کی اطاعت و انقیاد کا محل و مرکز خود مقامی اسلامی حکومت ہو گئی تھی اور احکام شریعہ کے نفاذ و اجراء کے لیے بھی وہ کسی بیرونی حکومت کے محتاج نہ تھے۔ اس بناء پر ظاہر ہے کہ ان ممالک میں مرکزی خلافت کا تعلق کسی نمایاں شکل میں یکا یک ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطنت کے رقبہ نہ جذبات بھی اپنی انتہائی حالت میں سب پر چمائے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے سے تفرقہ و انتشار کی عالمگیر مصیبت تمام عالم اسلامی کو کھلے کھلے کر چل چکی تھی۔ لیکن ان ممالک کے علاوہ جہاں کہیں بھی مسلمان آباد تھے اور اپنی مقامی اسلامی حکومت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ ترک حکومت سے کتنے ہی دور دور از گوشوں میں واقع ہوں لیکن عثمانی سلاطین ہی کو اسلام کی مرکزی خلافت عظمیٰ پر فائز و متصرف تسلیم کرتے تھے اور اسی لیے مجدد و عیدین کے خطبوں میں ان کے لیے خاص طور پر دعا مانگنا انہا فرض سمجھتے تھے۔ خود ہندوستان کے قرب و جوار اور بحر چین کے جزائر میں مسلمانوں کا ایک ایک فرد خلیفہ قسطنطنیہ کی حیثیت دینی کا پورا پورا اعتقاد رکھتا تھا۔

جزائر سیلون ہندوستان ہی کا ایک بحری گوشہ ہیں۔ ۱۷۷۵ھ مطابق ۱۱۶۱ء میں دکن کے مشہور عالم سید قمر الدین اورنگ آبادی حج سے واپسی میں کولمبو پہنچے اور وہاں کی سیر کی۔ میر غلام علی آزاد بنگلہ رامی ان کے معاصر ہیں۔ اپنی کتاب سبحة المرجان میں ان کی ربانی نقل کرتے ہیں کہ ساحلی مقامات میں ڈچوں کی حکومت ہے۔ اندرونی جزائر میں ہندو راجہ ہے۔ کولمبو میں مسلمانوں کے دو محلے ہیں۔ جسہ کی نماز تین مرتبہ سید مصوف نے وہاں پڑھی۔ خطبہ میں امام نے پادشاہ ہند اور سلطان قسطنطنیہ کے لیے دعا مانگی تھی۔ لکھوہ خادما للرحمن الشرفین“ یعنی اس لیے کہ وہ خادم حرمین ہیں (سبحة المرجان مطبوعہ ممبئی صفحہ ۲۳)

یہاں سے ڈیڑھ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ سیلون کے جزیروں میں اگر مسلمان ایک غیر مسلم حاکم کے ماتحت رہ کر شاہ ہند کا ذکر کرتے تھے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ہندوستان ان سے بالکل متصل تھا لیکن قسطنطنیہ کے سلطان کے لیے دعا مانگنا جو بحر ہند سے اس قدر دور دراز فاصلہ پر واقع ہے، کیا

معنی رکھتا ہے؟ کیا اس کے سوا کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمام عالم اسلام میں وہی خلیفہ المسلمین ہے اور اس لیے گو اور بھی بہت سی اسلامی حکومتیں موجود ہوں، مگر ہر گوشہ عالم کے مسلمانوں کے دلی تعلق و اطاعت کا اصلی مرکز صرف وہی ہو سکتا ہے؟

صاحب تحفۃ العالم چین کو چک کے ایک سیاح سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہیں جس نے عجیب عجیب جزیروں اور وہاں کے رسم و رواج کا مشاہدہ کیا تھا۔ ”چین کو چک“ سے مقصود بحر چین کے جزائر سائرا، ملایا جاوا وغیرہ ہیں۔ سیاح مذکور کہتا ہے کہ اکثر جزائر میں مسلمان آباد ہیں اور مسجدیں معمور ہیں۔ جمعہ کے خطبوں میں سلطان روم کے لیے دعا مانگتے ہیں اور وہاں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ یہ واقعہ بھی بارہویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے۔

باقی رہا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعتقاد حال کی پیداوار ہے، تو یہ بھی صحیح نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک خود ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی، کسی بیرونی اسلامی حکومت سے مسلمانوں کو بلا واسطہ تعلق رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ البتہ سلطنت مغلیہ کے انقراض کے بعد وہ مجبور ہو گئے کہ بلا واسطہ خلافت قسطنطنیہ سے اپنا رشتہ انقیاد و عقیدت قائم کر لیں۔ تاہم اسلام کی مرکزی خلافت پر سلاطین عثمانیہ کا قابض ہونا ایک ایسی مسلم و معروف بات ہے جو ہمیشہ علماء ہند کے علم و اعتقاد میں رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا سال وفات ۱۱۷۳ھ ہے۔ ان کا زمانہ احمد شاہ ابدالی کی آمد و رفت کا زمانہ تھا۔ اور ہندوستان میں اسلامی حکومت ابھی قائم تھی۔ انہوں نے گھمات الہیہ میں دو جگہ سلاطین روم کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”از زمان سلطان سلیم خاں کہ در اوائل سنہ اکل بود، اکثر بلاد عرب و مصر و شام تحت تصرف سلاطین توم اند، و خدمت الحرمین الشریفین زادھا اللہ شرفا کر لند، و امارت موسم دریاست حجاج، و اہتمام محامل و قوافل برایشان استقرار یافت و بہ ہمیں جہت بر منابر عرب و شام خصوصاً الحرمین الشریفین ہر یکے از ایشان بہ لقب امیر المؤمنین مذکورست“

یعنی میں اگرچہ آئمہ زید یہ سلاطین عثمانیہ کے رقیب و حریف تھے اور انہوں نے امدرون ملک میں کبھی ان کی حکومت جتنے نہ دی۔ ہاں اس ہمہ گیر حویں سے تیرہویں صدی تک علمائے یمن کی مصنفات کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، ان سے پوشیدہ نہیں کہ اکثروں نے سلاطین عثمانیہ کی مرکزی حیثیت تسلیم کی ہے۔ جس کے معنی بجز خلافت اسلامہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ علامہ صالح المعقبی صاحب العلم الشارح المتولد ۱۰۳۷ھ فلانی صاحب ایقاظ الہم، شیخ عبدالحق زبیدی صاحب صفوۃ الاخبار وغیرہم اپنی کتابوں میں جا بجا تری گورنروں کے جبر و ستم کی شکایتیں کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی سلاطین عثمانیہ کا ذکر ایسے

مگر ایہ میں کرتے ہیں جس سے ان کی اسلامی خلافت و امانت کا مسلم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سلطان کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ جو شخص آج روئے زمین پر تمام مسلمانوں کا خلیفہ و امام کہلائے اس کے گورنر اس طرح رعایا کے ساتھ سلوک کریں؟ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سلاطین عثمانیہ تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام تسلیم کیے جاتے تھے۔

یہ موقع مزید اقطاب و تفصیل کا نہیں ہے۔ سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا زمانہ دسویں صدی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پس اگر اس کا ذکر مل سکتا ہے تو پچھلی تین صدیوں کی مصنفات میں۔ چونکہ ان عہدوں کی تصنیفات عام طور پر علمائے ہند کے مطالعہ میں نہیں آئی ہیں اس لیے مسئلہ کے تاریخی شواہد سے عموماً لوگ بے خبر ہیں۔ تلاش کیا جائے تو ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو جاسکتا ہے۔

خود یورپین حکومتیں علی الخصوص برٹش گورنمنٹ سلطان عثمانی کی اس دینی حیثیت کا ہمیشہ سے اقرار کرتی آئی ہے اور جب کبھی ضرورت ہوتی ہے قسطنطنیہ کی طاقت سے یہ حیثیت خلیفہ اسلام کے کام لیا گیا ہے۔ غدر ۱۹۰۵ء کے موقع پر سلطان عبدالحمید سے جو فرمان مسلمانان ہند کے نام حاصل کیا گیا تھا اور جس میں ان کو انگریزی حکومت کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کی بناء بھی یہی تھی کہ سلطان قسطنطنیہ کو یہ حیثیت خلیفہ اسلام مسلمانان ہند کی ارشاد و ہدایت کا حق حاصل ہے۔ کونین و کنواریا کے عہد میں بارہا حج اور حاجیوں کی مشکلات کا سوال گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اٹھایا گیا اور پھر امپیریل گورنمنٹ نے جناب عالی کو اس احتجاج کے ساتھ توجہ دلائی کہ یہ حیثیت خلیفہ اسلام ہونے کے حجاج کی تکلیف دور کرنا ان کا مذہبی فرض ہے۔ فرانس اور روس کی جانب سے بھی سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں متعدد مرتبہ ایسے اظہارات و اعتراضات ہو چکے ہیں۔



## قرون متوسطہ و اخیرہ میں مرکزی حکمرانی

ہم نے جا بجا ”اسلام کی مرکزی حکمرانی“ اور ”خلافتِ عظمیٰ“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام کا محور و اساس مسئلہ ”توحید“ ہے۔ ”توحید“ کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہوتا۔ صرف اللہ کی ذات و صفات ہی میں یہ حقیقت محدود نہ تھی جیسا کہ بد قسمتی سے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ عقائد و اعمال کی ہر شاخ اور ہر شکل میں اسلام کا اصل الاصول توحید ہی ہے۔ وہ مسلمانوں کی تمام ان باتوں میں جو فرد و اجتماع سے تعلق رکھتی ہیں ایک کمال توحیدی حالت پیدا کر دینا چاہتا ہے۔ جس طرح خدا کی ذات کی طرح اس کی خلقت اور قوانین خلقت میں بھی ہر چیز اور ہر جگہ یکاگی و یک عملی اور وحدت و واحدیت کا فرما ہے۔ ”مَا تَوْحِيْدِيْ فِئِيْ خَلْقِيْ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفْوِيْطٍ ۗ فَاَرْجِعِ الْبَصُرَ لَا هَلْ تَرٰوْنِيْ مِنْ لَعَلُوْرٍ (۳:۶۷)

اس بناء پر اسلام نے جس طرح مسلمانوں کی ساری باتیں ایک قرار دی تھیں ان کی شریعت، ان کا قانون، ان کی کتاب، ان کا نام، ان کی زبان، ان کی قومیت، ان کا قبلہ، ان کا کعبہ، ان کا مرکز اجتماع، مرکز ارض، اسی طرح ان کی حکومت بھی ایک ہی قرار دی تھی۔ یعنی تمام روئے زمین پر مسلمانوں کا صرف ایک ہی فرمانروا و خلیفہ ہو۔ لیکن جہاں ساری باتوں میں انحراف اور تفرقہ و انتشار ہوا وہاں یہ بات بھی جاتی رہی۔ خلفاء راشدین کے بعد صرف بنو امیہ کے ابتدائی عہد تک وحدت حکومت نظر آتی ہے۔ اس کے بعد کوئی زمانہ ایسا نہ آیا جب تمام عالم اسلامی کی حکومت کسی ایک طاقت میں جمع رہی ہو۔ مختلف گوشوں میں مختلف دعویدار اٹھے اور جس کا قدم جہاں جم گیا، خود مختارانہ فرمانروائی کرنے لگا۔

ہاں ہمہ ایک خاص مرکزی اقتدار ہر زمانے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور مورخ کی بصیرت محسوس کر لیتی ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کی عام سطح میں ایک مرکزی قوت ابھری ہوئی ہے۔ اسلامی حکومتیں ہر گوشہ عالم میں قائم ہو گئی تھیں مگر ہمیشہ ایک خاص مقام ایسا ضرور رہا جہاں کی حکمرانی دنیا کی تمام اسلامی حکمرانیوں میں ایک مرکزی اقتدار کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے مقامات کے فرمانروا اپنے دائرہ حکومت سے باہر کوئی اثر نہیں رکھتے تھے لیکن وہاں کا حکمران تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک خاص کشش و دعوت اپنے اندر رکھتا تھا۔ یہ بلا و شام و عراق اور عرب و حجاز کی حکومت تھی۔ عرب اسلام کا اصلی

سرچشمہ و مبداء ہے۔ حجاز اسلامی قومیت کا دائمی مرکز اور اسلام کے زکن حج کی بارگاہ ہے۔ شریعت نے عرب ہی کو یہ شرعی خصوصیت دی ہے کہ ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے اثر سے محفوظ رکھی جائے۔ شریعت کے اس حکم کی تعمیل بغیر حکومت کے ممکن نہیں جو حکومت اس پر قابض ہوگی وہی اس شرعی حکم کی تعمیل و نفاذ کی ذمہ دار اور اقامت حج کی بھی کفیل ہوگی۔ پس قدرتی طور پر یہ بات ہوتی کہ یہاں کی حکومت کو تمام اسلامی حکومتوں میں مرکزی اقتدار اور تمام مسلمانان عالم کے قلوب کے لیے ایک انجیل الی اثر حاصل ہو جائے۔ اسلام کے ازمہ متوسطہ و اخیرہ میں یہی مرکزی اقتدار خلافت عظمیٰ کا قائم مقام تھا۔ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی ان مقامات کی حکومت خلفاء مصر کے قبضہ میں رہی۔

”مرکزی حکومت“ سے مقصود یہی مرکزی اقتدار ہے۔ خلفاء مصر کے بعد جب سلاطین عثمانیہ تمام بلاد عرب و حجاز اور مصر و شام پر قابض ہو گئے تو اسلامی خلافت عظمیٰ کا مرکزی اقتدار بلا نزاع انہی کو حاصل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دسویں صدی کے بعد سے تیرہویں صدی کے اوائل تک اگرچہ بڑی بڑی اسلامی حکومتیں دنیا میں قائم رہیں لیکن خلافت عظمیٰ کے اعتقاد کے ساتھ جب کبھی کسی مسلمان کی نظر اشقی تو وہ صرف قسطنطنیہ ہی کی طرف دیکھ سکتا تھا۔



## ترکان عثمانی اور عالم اسلامی

اب ہم چاہتے ہیں کہ اس پوری تاریخ سے قطع نظر کر لیں۔ صرف اس اعتبار سے مسئلہ پر ایک آخری نظر ڈالیں کہ احکام شریعی کی بنا پر مسلمانین عثمانیہ کے اعمال خلافت کا کیا حال رہا ہے۔ بحث کا یہ سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ اہل فیصلہ ہوگا۔

اسلام نے خلیفہ کے منصب و تقرر کے خاص مقاصد قرار دیئے ہیں۔ پچھلی پانچ صدیوں کے اندر متعدد اسلامی حکومتیں دنیا میں موجود تھیں اور اب تک موجود ہیں۔ قوم و جماعت کے اعتبار سے متعدد مسلمان قوموں میں حکومت رہی اور بعض حکمران قومیں اب بھی باقی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام حکمران جماعتوں میں کون سی حکومت ایسی ہے جس نے شریعت کے ٹھہرائے ہوئے مقاصد خلافت انجام دیئے؟ اور جو فرض شرعی خلیفہ کے قیام اور یہ حکم ”الذین ان مکننا ہم فی الارض“ تمکین فی الارض سے تھی، وہ ان کے ہاتھوں پوری ہوئی؟ جس حکومت اور جس حکمران قوم نے ایسا کیا ہو، صرف وہی حکومت اور قوم تمام مسلمان عالم کی خلافت و امامت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

اس اہم سوال کا فیصلہ چند سطروں میں ہو سکتا ہے۔ ”خلافت اسلامیہ“ کا مقصد شرعی پچھلی صحبتوں میں صاف ہو چکا ہے۔ سب سے پہلا مقصد اس کا یہ ہے کہ ایسی طاقتور حکومت قائم ہو جو دشمنوں کے حملوں سے اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔ اسلام و ملت کے دشمنوں کا استیصال و انسداد ہو۔ کلہ حق دنیا میں بلند اور دور دور تک جاری و نافذ ہو جائے۔ کلمہ کفر و فساد کو خیران و ناکامی نصیب ہو۔ یہی مقصد پہلا مقصد ہے باقی سب فروع و توابع ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تمام کتب عقائد و اصول میں خلافت کی تعریف کرتے ہوئے ”الامامة الذین بالامامة ارکان الاسلام، والقیام بالجهاد، و حفظ حدود الاسلام وما يتعلق به من ترتیب الجیوش والفرض للمقاتله“ کے جملے سب سے پہلے ملتے ہیں۔ یعنی وہ مسلمانوں کی ایسی حکومت ہے جو ارکان اسلام کو قائم رکھے، جہاد کا سلسلہ و نظام درست کرے، اسلامی ملکوں کو دشمنوں کے حملوں سے بچائے اور ان کاموں کے لیے فوجی قوت کی ترتیب اور لڑائی کا سامان وغیرہ جو کچھ مطلوب ہو، اس کا انتظام کرے مختصر یہ کہ اسلام کا خلیفہ وہ حکمران ہو سکتا ہے جو اسلام و ملت کے لیے دفاع و جہاد کی خدمت



انجام دے سکے۔ ساری باتیں ان دو نقطوں میں آئیں۔

اب فیصلہ کر لو کہ گزشتہ چار صدیوں کے اندر کس حکومت اور کس قوم نے دفاع و جہاد کی

خدمت انجام دی ہے؟

اسلام کا جب ظہور ہوا تو دشمنوں کی پہلی جماعت قریش مکہ کی جماعت تھی۔ ان کے مٹ

جانے کے بعد ان پوری تیرہ صدیوں میں صرف عیسائی قومیں ہی مسلمانوں کی دائمی حریف رہی ہیں۔

دوسری غیر مسلم قوموں میں سے کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا داعیہ

رکھتی ہو۔ ایران کی مجوسی قوت کا ابتدا ہی میں خاتمہ ہو گیا تھا۔ یہودیوں کی کوئی پولیٹیکل قوت نہ تھی۔

ہندوستان کے ہندوؤں اور بدھ مذہب کے پیروؤں نے ہندوستان سے نکل کر کبھی مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا

اور نہ ان میں کوئی داعیہ نہ تھی۔ چین کے تاتاری اٹھے اور بلاشبہ سب سے بڑی ہلاکت کا باعث

ہوئے لیکن بالآخر خود اسلام کے محکوم ہو گئے یعنی ایک صدی کے اندر ہی اندر مسلمان ہو گئے۔

پس تمام روئے زمین پر بجز مسیحی اقوام کے اور کوئی حملہ آور حریف اسلام کا نہ تھا۔ نہ ہے؟

مشرقی عیسائیوں کی قوت ابتدا ہی میں شکست کھا گئی تھی۔ صرف یورپ کی حکومتیں اور قومیں تھیں جن کو خواہ

مسیحیت کے نام سے موسوم کرو خواہ یورپ کے نام سے۔ یہی آخری چار صدیوں میں جن میں بتدریج

یورپ کی طاقت ترقی کرتی گئی اور اس کی ترقی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اسلام کی پولیٹیکل طاقت کو روز بروز

تجزیل ہوا۔

تمام کرہ ارض کے مسلمانوں میں سے کون سی قوم ہے جس نے ان چار صدیوں کے اندر

یورپ کا مقابلہ کیا ہے اور دفاع و جہاد جاری رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کی ان کے سب سے بڑے حریف

کے مقابلے میں حفاظت کی ہے؟ سو اسی صدی عیسوی میں یورپ کی ان تمام طاقتوں نے جو مشرقی

ممالک کے دروازوں سے قریب تھیں بتدریج قدم بڑھا نا شروع کر دیا تھا۔ اگر کوئی طاقت در اور متصادم

روک موجود نہ ہوتی تو اب سے دو صدی پیشتر ہی تمام وسط ایشیا شام، عرب اور اسلامی افریقہ یورپ کے

استیلاء سے پامال ہو چکا ہوتا۔

پھر وہ کونسی ناقابل تخییر فوجی قوت تھی جس نے پہلے تو اپنے پورے پورے حملوں سے تمام یورپ کو

اس طرح پامال کر دیا کہ پوری دو صدیوں تک سنبھلنے اور قدام اٹھانے کی مہلت ہی نہ دی اور پھر تمام ایشیاد

بلا و اسلامی کے عین دروازہ پر مشرقی مدافعت کی ایک آہنی دیوار قائم کر دی اور اس طرح حکم جہاد کے دونوں

فرض بہ یک وقت تنہا انجام دیئے۔ ہجوم بھی اور دفاع بھی؟

کیا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ نے جس نے اپنی پوری تاریخ میں ایک بار بھی ہندوستان سے

قدم باہر نہ نکالا؟ اور جس کی تلوار پانچ صدیوں کے اندر ایک مرتبہ بھی کسی حریف ملت کے خون سے رنگین نہ ہوئی؟ عین اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان کے حاجیوں کو پرنگالیوں اور ڈچوں کے جرگے ساحل ہند کے سامنے لوٹ رہے تھے اور وہ ان کے انسداد سے عاجز تھا۔

کیا ایران کے سلاطین نے، جن کے عقوبی حملوں نے ہمیشہ سلاطین عثمانیہ کو مجبور کیا کہ یورپ کا فتح مند انہ اقدام ترک کر کے ایشیا کی طرف متوجہ ہو جائیں جس کی وجہ سے یکا یک یورپ کو ترکی تلواروں سے مہلت مل گئی اور تمام وسط یورپ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔

کیا یمن کے خود مختار قبائل اور عرب کے ائمہ نے، جن کو اسلام کے اس سب سے بڑے حریف کا شاید حال بھی معلوم نہ تھا!

برہہ انسان جو دو اور دو کو صرف چار ہی کہنا چاہتا ہو اس کا اقرار کرے گا کہ بجز سلاطین عثمانیہ اور ترکوں کے مسلمانوں کی کوئی حکومت اور قوم نہیں ہے جس نے قرون اخیرہ میں حفظ اسلام و ملت کی یہ خدمت انجام دی ہو اور جو فرض تمام مسلمانان عالم کے ذمے عائد ہوتا تھا، اس کو سب کی طرف سے تنہا اٹھالیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی نظیر قرون اولے کے بعد مسلمانوں کی کسی حکمران قوم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ صرف صلاح الدین ایوبی کی دعوت اس سے مستثنیٰ ہے جس نے تمام یورپ کے متحدہ مسیحی جہاد کو شکست دی۔ تاہم وہ بھی ایک محدود زمانے کا دفاع تھا۔ مسلسل تین چار صدیوں تک صرف ترکوں ہی کی اسلامی مدافعت قائم رہی ہے۔ ان پوری چار صدیوں میں تمام رونے زمین کے مسلمان اپنے سب سے بڑے قومی فرض سے غافل رہے۔ کسی قوم نے ایک زخم بھی اس مقدس راہ میں نہیں کھایا۔ کسی پادشاہ نے ایک قدم بھی اس کے لیے نہیں اٹھایا۔ صرف تنہا ترک ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کی جانب سے یہ پورا کام انجام دیتے رہے۔ انہوں نے تمام مسلمانان عالم کو عیش و راحت کے بستروں پر چھوڑ دیا۔ خود اپنے لیے خاک و خون کی دائمی زندگی پسند کی۔ ان قرون اخیرہ میں اگر ترکوں کی جانفروشی و سرباز جماعت تنہا اس فرض کو نہ سنبھال لیتی تو نہیں معلوم آج جغرافیہ عالم میں مسلمانوں کی آبادیوں کا کیا حال ہوتا؟ اور جو مصیبت اس وقت درپیش ہے وہ کب کی آجکی اور مسلمانوں پر سے گزر چکی ہوتی؟ تمام دنیا کے مسلمانوں پر ترکوں کا یہ وہ احسان عظیم ہے کہ اگر اس کے معاوضہ میں مسلمانان عالم اپنا سب کچھ ان پر سے قربان کر دیں جب بھی ان کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اگر گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے پادشاہتیں کی ہیں تو صرف انہی کی بدولت اور آج پادشاہتیں کھو کر بھی کچھ نہ کچھ عزت کی پونجی اپنے ساتھ رکھتے ہیں تو صرف انہی کی بدولت۔ مسلمان خواہ

دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو۔ چین میں ہو یا افریقہ کے دور دراز گوشوں میں لیکن صدیوں سے اس کی قومی زندگی، قومی عزت، قومی عیش و آرام اور وہ سب کچھ جو ایک قوم کے لیے ہے اور ہو سکتا ہے۔ صرف ترکوں ہی کے طفیل ہے اور انہی کا بخشا ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا فرض ہوا کہ ترکوں کی مدد کریں لیکن ترکوں کے لیے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ ہندوستان یا افریقہ میں باٹنے کے لیے روپیہ بھیجے رہیں۔ وہ چار صدیوں سے وہ کام انجام دے رہے ہیں جس کے تصور سے بھی ہم مسلمانان ہند کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جس کے وہم ہی سے ہم پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ یعنی اپنی جانیں اسلام کی حفاظت کی راہ میں قربان کر رہے ہیں اس سے بڑھ کر اور کون سا کام ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے کیا جاسکتا ہے؟ اور اس کے بعد کیا رہ گیا جس کی طلب اور سوال ہو! بہت ممکن ہے کہ کسی دوسرے حصے کے مسلمانوں نے ترکوں سے زیادہ نمازیں پڑھی ہوں لیکن نماز کے قیام کی راہ میں ان سے زیادہ اپنا خون کسی نے نہیں بہایا۔ بہت ممکن ہے کہ عرب اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زبانوں نے اس سے زیادہ قرآن کی تلاوت کی ہو لیکن قرآن کی حفاظت کی راہ میں چار سو برس سے زخم صرف انہی کے سینے کھارے ہیں۔ اگر اللہ کی شریعت حق ہے، اگر قرآن و سقہ کا فیصلہ باطل نہیں تو ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ دوسرے ملکوں کے ہزاروں عابد و زاہد مسلمانوں سے جن کے دلوں میں کبھی جہاد فی سبیل اللہ کا خطرہ بھی نہیں گزرتا، ترکوں کا ایک گناہ گار معصیت آلود فرد بھی اللہ کے آگے کہیں زیادہ فضیلت و محبوبیت رکھتا ہے ہماری مدت العمر کی عبادتیں بھی ان کے سینے کے ایک خونچکاں زخم اور اس سے بہنے والے ایک قطرہ خون کی عظمت نہیں پاسکتیں۔ حدیث ہے کہ ”حورس لیلۃ فی سبیل اللہ افضل من الف لیلۃ بقام للیلھا و صیام نہارھا“۔ جہاد فی سبیل اللہ کی ایک رات ہزار دنوں کے روزوں اور ہزار راتوں کی عبادت سے بھی افضل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے حضرت فضیل بن عیاض کو ایک مرتبہ یہ اشعار لکھ کر بھیجے تھے۔

یا عابد الحرمین لوا بصورتنا لعلمت انک فی العبادۃ تلعب

من کان یغضب خلدہ بدموعہ نحورنا بلعائننا تعضب

ریح العیبر لکم و نحن عیبرنا و حج السنابک و العبار الا طیب ۲

جو مسلمان یورپ کے مسیخی و سیاسی اثر سے قتل ہو کر ترکوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں، ان کو

چاہیے کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ صدیوں سے ان کی منافقانہ غفلت و اعراض کا کیا

حال رہا ہے۔ علی الخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو (جو تعداد میں ہر جگہ کے مسلمانوں سے زیادہ ہیں)

خو کرنا چاہیے کہ جس اولین فرض دینی کے لیے ترک چار سو برس سے اپنا خون بہا رہے ہیں۔ انہوں نے

اس کے لیے کیا کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترک زمینوں کی مرہم پٹی کے لیے بیچ دینے جو ایک ترک بیوہ کی معیبت اور ایک ترک یتیم کے آنسوؤں کی قیمت بھی نہیں ہو سکتے؟ کیا ایسے لوگوں کو جو اپنی راتیں قارغ البالی کے بستروں پر اور دن آرام دے فکری کی چھتوں کے نیچے بسر کرتے ہوں، یہ حق پہنچتا ہے کہ ان لوگوں پر زبان طعن کھولیں جو چار سو برس سے اپنی لاشیں خاک و خون میں تڑپا رہے ہیں؟

بہر حال مصعب خلافت کا پہلا مقصد قیام و دفاع و جہاد ہے۔ وہ کھپلی چار صدیوں میں بجز ترکوں کے اور کسی اسلامی حکومت نے انجام نہیں دیا۔ پس اگر اور دلائل و شواہد نہ ہوتے، جب بھی صرف یہی ایک بات سلاطین عثمانیہ کی خلافت و امامت کے لیے کفایت کرتی تھی۔

اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ تمام بحث اس سوال سے تعلق رکھتا تھا کہ گزشتہ صدیوں میں متحد اسلامی حکومتوں کے درجے ہوئے سلاطین عثمانیہ ہی کیوں خلافت عظمیٰ کے حقدار تسلیم کیے گئے؟ لیکن موجود زمانے میں جبکہ تمام اسلامی حکومتیں مٹ چکی ہیں۔ مسلمانان عالم کے لیے بجز سلطان عثمانی کے کسی دوسری خلافت کا وجود نہیں رہا۔



## حواشی

۱۔ اخراج الامام احمد بن محمد بن زبیر

۱۔ حافظ ابن عساکر نے امام موصوف کے ترجمہ میں یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ امام موصوف ایک سال درس حدیث دیتے ایک سال تجارت کرتے۔ ایک سال جہاد میں شرکت فرماتے۔ حضرت فضیل اس عہد کے مشہور عباد و زہاد میں سے ہیں۔ حاصل ان اشعار کا یہ ہے ”اے حرمین کے گوشہ نشین عابد! اگر تو ہمارا حال دیکھتا ہوتا تو معلوم کر لیتا کہ جس زہد و عبادت میں مشغول رہتا ہے، وہ تو ایک طرح کا کھیل ہے۔ جو شخص اپنے ریشاڑ آنسوؤں سے (عبادت میں) ترکتا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری عبادت وہ ہے جس میں ریشاڑ آنسوؤں سے نہیں بلکہ گردنیں خون سے رنگین ہوا کرتی ہیں۔ حضرت فضیل نے جب یہ اشعار پڑھے تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا ”صدق ابو عبد الرحمن، عبد اللہ بن مبارک نے سچ کہا!

## فریضہ عظیمہ دفاع

### حقیقت حکم دفاع

اسلام کے شرعی واجبات و فرائض میں ایک نہایت اہم اور اکثر حالتوں میں ایمان و کفر تک کا فیصلہ کروینے والا فرض دفاع ہے۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان حکومت یا کسی مسلمان آبادی پر کوئی غیر مسلم گروہ حملہ کرے تو یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر شرعاً فرض ہو جاتا ہے کہ دفاع (ذیقض) کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اس حکومت اور آبادی کو غیر مسلم قبضہ سے لڑ کر بچائیں۔ اگر فوری قبضہ ہو گیا ہے تو اس سے نجات دلائیں اور اس کام کے لیے اپنی ساری قوتیں اور ہر طرح کی ممکن کوششیں وقف کریں۔ اس بارے میں قرآن وحدیث کے احکام اس کثرت سے موجود ہیں اور اسلامی فرائض میں یہ اس درجہ مشہور فرض ہے کہ شاید ہی دنیا میں کوئی مسلمان اس سے ناواقف نکلے۔ یہی باہمی مددگاری و یاداری اور دفاع اعداء کا قانون ہے جس پر اسلام نے شریعت و امت کی حفاظت کی ساری بنیادیں استوار کی ہیں۔ لڑائی لڑنے کی نسبت سب سے پہلی آیت جو نازل ہوئی، وہ سورۃ حج میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ • أُوذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ • الَّذِينَ أَخْرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَغْيٍ حَقًّا إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبَّنَا اللَّهُ (۲۴: ۲۸-۳۰)

اللہ تعالیٰ مومنوں پر سے ان کے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کا ساتھ نہیں جو سب سے بگڑتی ہوئی طاقت کے امانتدار نہیں ہیں، اور شکر گزاری کی جگہ کفرانِ نعمت میں مرشار ہیں۔ جن مسلمانوں سے کافر لڑ رہے ہیں، اب ان مسلمانوں کو بھی کافروں سے لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ مظلوموں کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ بلا کسی حق کے اپنی آبادیوں سے نکال دیئے گئے۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ صرف یہ کہ اپنے پروردگار کے ماننے والے ہیں!

لیکن بعض مفسرین نے سورہ بقرہ کی حسب ذیل آیت کو اذن قتال کا پہلا حکم قرار دیا ہے۔

وَ قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ

الْمُعْتَدِينَ • وَقَاتَلُوهُمْ حَيْثُ تَقَفْتُمُوهُمْ وَآخِرُ جُوهْمُ مَن حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ  
مِنَ الْقَتْلِ ۚ (۱۹۰:۲-۱۹۱)

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو مسلمانوں سے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو۔ اللہ  
حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ایسا کرو کہ جہاں کہیں بھی وہ جے ہوئے ملیں، قتل کر دو اور  
جہاں کہیں سے انہوں نے مسلمانوں کو نکالا ہے تم بھی نکال باہر کرو۔ ایسا کرنا اگرچہ خونریزی ہے مگر  
خونریزی کی برائی سے بھی بڑھ کر ظلم و ساد کی برائی ہے۔

امام ابن جریر نے ابوالعالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنگ کی نسبت یہی پہلی آیت ہے جو نازل  
ہوئی۔ انہا اول ایت نزلت فی القتال بالمدينة فلما نزلت كان رسول الله صلعم يقاتل  
من قاتله ويكف عن كفه عنه، حتى نزلت سورة براءة“ پس اذن قتال کی پہلی آیت سورہ حج  
کی ہے یا بقرہ کی۔

ان دونوں آیتوں اور ان کی ہم مطلب آیات میں قرآن حکیم نے حکم قتال کے اس حصہ کو  
صاف صاف مسلمانوں پر فرض کر دیا جس کا مقصد دفاع (ڈیفنس) ہے یعنی جب کبھی غیر مسلموں کی  
کوئی جماعت مسلمانوں کی کسی حکومت یا آبادی پر حملہ کرے یا اس پر خود قابض ہو جانا چاہے تو  
مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جس طرح حملہ آوروں نے حملہ  
کیا ہے، یہ بھی کریں، قتل و جنگ کی جو جو چال وہ چلے ہیں یہ بھی چلیں۔ البتہ یہ جائز نہیں کہ اس بارے میں  
عدل کے جو حدود شریعت نے باعہمے ہیں مثلاً ضعیفوں بوڑھوں، نہتوں، عورتوں، راہبوں مذہبی  
عبادتگاہوں وغیرہ سے تعارض نہ کرنا ان سے قدم باہر نہ نکالیں۔ پھر اس حکم کی علت بھی بتلا دی کہ ”الْفِتْنَةُ  
أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ“ (۱۹۱:۲) بلاشبہ یہ جنگ قتل ہے اور انسانی قتل بہت بڑی برائی ہے لیکن اس برائی  
سے بھی بڑھ کر برائی یہ ہے کہ لوگ اپنی آبادیوں اور حکومتوں پر قابض نہیں رہے، دوسروں کے حقوق  
آزادی و حکومت چھیننا چاہتے ہیں اور توحید کی جگہ کفر و شرک کے ماتحت مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں۔  
قوموں کا قدرتی حق حرمت پامال کر رہے ہیں۔ اگر اس کے دفاع کا انتظام نہ کیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی  
قوم زعمہ و باقی نہیں رہ سکتی۔ پس بڑی برائی کے دور کرنے کے لیے چھوٹی برائی اختیار کر لینی چاہیے یہ عند  
نیچر کا عالمگیر قانون اور کارخانہ حیات کا دائمی عمل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا۔

سورہ محمد میں قرآن نے حکم قتال اور جواز جنگ کی اصلی علت بھی بتلا دی ہے۔

”حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا“ (۴:۴۷) لڑتے رہو یہاں تک کہ لڑائی موقوف

ہو جائے۔

یعنی اسلام کا اصلی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں عالمگیر صلح و امن قائم ہو جائے۔ ساری دنیا ایک قوم، اور تمام نوع انسانی ایک گھرانے کی طرح زندگی بسر کریں لیکن جب تک جنگ کرنے والی ظالم و جریس قوتیں باقی ہیں، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس پہلے مفسد و جاہر قوتوں کا مقابلہ کرنا اور ان کو فنا کر دینا ضروری ہوا۔ مضبوط اور مستقل امن اسی وقت قائم ہوگا جب پہلے امن کی خاطر اچھی طرح جنگ کر لی جائے:

”عَسَىٰ اِذَا الْفَتْحُ مُوْتُمْ“ (۳:۴۷) یہاں تک لڑو کہ جنگ آزما دشمن چور چور ہو جائیں۔

قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائے گا، متھتولوں کا خون بہنا بند نہ ہوگا۔

”وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَاۤاُولِي الْاَلْبَابِ“ (۱۷۹:۲) تمہارے لیے قصاص کی

موت میں امن کی زندگی پوشیدہ ہے۔

لہذا حکم دیا کہ جب تک دنیا جنگ اور بواعث جنگ سے باز نہ آجائے جنگ کرتے رہو، کبھی

اس سے نہ جھکو۔ یہاں تک کہ دنیا میں جنگ کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے۔ ”تضع الحرب اوزارہ“

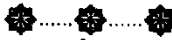
جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے یعنی جنگ بالکل موقوف ہو جائے۔ فساد و بطلان کی وہ قوتیں ہی باقی نہ رہیں

جو خدا کی زمین کو ہمیشہ انسانی خون سے رنگتی رہتی ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ عالمگیر امن کا یہ وقت دنیا پر

ضرور آئے گا، مگر اسی وقت آئے گا جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن و اخوت کے آگے جھک جائے

گی: ”هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهٰدِي وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلٰى الدِّيْنِ سَلْبِهٖ لَوَلُوْكَرَهٗ

الْمُشْرِكُوْنَ“ (۳۳:۹)۔



## حواشی

لا روى الحاكم من حديث الاعمش عن ابن عباس قال لما خرج رسول الله صلى الله عليه

وسلم من مكة قال ابو بكر اخرجوا بينهم انا لله وانا اليه راجعون ليهلكن الله اذن للدين

بقاتلون الخ وهي اول آية نزلت في القتال اساده على شرط الصحيحين

یعنی حکم جہاد کی مختلف قسموں اور صورتوں میں سے ایک قسم قتال ہے پھر قتال کی بھی دو قسمیں ہیں دفاع اور ہجوم۔

ان آیات میں دفاع کا حکم ہے۔ ہجوم کا حکم دوسری آیتوں میں ہے اور اس کے مواقع و بواعث اور شرائط دوسرے

ہیں۔

## فضائل دفاع

اسلامی احکام میں حکم ”دفاع“ جو اہمیت رکھتا ہے، وہ عقلاً ضروریہ کے بعد کسی حکم، کسی فرض، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔ قرآن و حدیث میں بار بار یہ بات تملانی گئی ہے کہ قومی زندگی اسی عمل کے بقا پر موقوف ہے۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال قربان کر دینے کے لیے تیار رہے گا، اس وقت تک دنیا کی کوئی قوم ان پر غالب نہ آسکے گی۔ جس دن یہ جذبہ مردہ ہو جائے گا اسی دن سے مسلمانوں کی قومی موت بھی شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے۔ جب تک یہودیوں میں اعتقاد و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، حکومت و عزت انہی کے لیے تھی اور جب چند گھنٹیوں کے عیش و راحت کا شوق قومی زندگی و عزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آ گیا اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے، تو ذلت و دکھلی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا اور ہمیشہ کے لیے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے:

”صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءَ وَيَغْضَبُ مِنَ اللَّهِ“ (۲: ۶۱)

”اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِئِكَةِ مِمَّنْ بَنِيْ اِسْرَآءِئِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسٰى اِذْ قَالُوْا لَنَبِيِّ لَهْمُ اَنْبِئْتْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالْ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَا نُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاءِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ“ (۲: ۲۴۶)

کیا تم بنی اسرائیل کا حال نہیں دیکھتے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد کیا ہوا؟ پہلے تو خود ہی اپنے عہد کے نبی سے درخواست کی ”کسی کو ہم پر بادشاہ بنا دو کہ اس کے ماتحت اللہ کی راہ میں لڑیں“ نبی نے کہا ”اگرچہ تم ایسا کہتے ہو لیکن امید نہیں کہ وقت پر پورے اترو۔ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو یزدلی دکھلا کے نافرمانی کر جاؤ گے“ ان لوگوں نے جواب دیا ”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہم کیوں نہ حق کی راہ میں ظالموں سے جنگ کریں گے حالانکہ انہوں نے ہم کو اور ہماری اولاد کو ہمارے شہروں سے نکال دیا ہے“ لیکن دیکھو جب لڑائی کا حکم دیا گیا تو بجز چند حق پرستوں کے سب اپنے قول و اقرار سے پھر گئے۔ وقت پران کا دعویٰ سچا ثابت نہ ہوا۔

سنن ابوداؤد میں ہے۔ اداضن الناس بالدينار والدرهم وتبايعوا باليمين والبعوا



اذناب بقرہ، وتر کو الیہا دلی سبیل اللہ، انزل اللہ بہم بلاء فلم یرفعہ حتی یواجعوا“ یعنی جب کوئی جماعت جہادنی سبیل اللہ ترک کر دیتی ہے تو اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں جو کبھی دوڑ نہیں ہو سکتیں الایہ کہ وہ اس معصیت سے باز آئیں۔

چونکہ شریعت و ملت کے قیام کی اصلی بنیاد یہی تھی اس لیے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا اور سارے عملوں اور نیکیوں سے جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے اس عمل کا مرتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا۔ جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کا اجر و ثواب بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے۔

کوئی خاص وقت اور عہد اس کے لیے مخصوص نہیں، ہر حال اور ہر زمانے میں ایک مسلم و مومن زندگی کے ایمان و صداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق و دلولہ ہے، یہی ستام دین ہے، یہی عماد ملت ہے، یہی اساس شرع ہے، یہی املاک اسلام ہے، یہی ایمان و نفاق کی اصلی کوئی ہے، یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کے لیے اصلی پہچان ہے۔ نماز اسی سے ہے، روزہ اسی سے ہے، حج اسی سے ہے۔ زکوٰۃ کا سب سے پہلا اور افضل مصرف یہی ہے سب اس کے لیے ملتی ہو جاسکتے ہیں اس کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور روزہ برائیوں سے بچنے کے لیے ڈھال لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو محدود کر دینے والی تلوار۔ پس اس کی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ روزہ، نہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبوبیت سے سرفراز کر دے۔ ہزاروں نمازیں اور ہزاروں روزے بھی اس ایک قطرہ خون کی فضیلت و تقدیس نہیں پاسکتے جو اس راہ میں بہایا گیا اور عمر بھر کی صدقات و خیرات بھی اس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو اس راہ میں خرچ کیا گیا۔ حتیٰ کہ یہی عمل اسلام و ایمان کی اصلی پہچان قرار پایا۔ جس مسلمان کا دل اس کے دلولہ و طلب سے خالی ہو اور ایمان و اسلام کی روشنی سے محروم ہو گیا۔ نفاق کی ظلمت اس پر چھا گئی۔ صحیح مسلم میں ہے۔

”من مات ولم یغز ولم یحدث نفسه بہ، مات علی شعبۃ من النفاق (عن ابی ہریرۃ)“ جو مسلمان اس حالت میں دنیا سے گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں لڑائی لڑی اور نہ اس کے دل میں اس بات کی طلب رہی، اس کی موت ایسی حالت میں ہوئی جو نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

قرطبی نے اس کی شرح میں کہا۔ ”لہذا دلیل علی وجوب العزم“ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جہاد کا عزم اور ارادہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس کے عزم اور طلب سے بھی اگر دل خالی ہو گیا تو

وہ مومن نہیں منافق ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمان چاہیں تو اس فرمان رسول کو سامنے رکھ کر اپنے ایمان و نفاق کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

ترندی میں ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کی ایک جماعت میں اس بات کا چرچا ہوا۔ ای اعمال احب الی اللہ“ ساری نیکیوں اور عبادتوں میں سب سے زیادہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے؟ اس پر سورہ صف نازل ہوئی!

”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَابِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَانْتَهُمْ بُنْيَانٌ مُرُضُونَ“ (۶۱: ۴) اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر اس استقامت اور جماد سے لڑتے ہیں گویا ایک مضبوط دیوار ہے جو تلواروں کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے اور دیوار بھی کیسی! ایسی کہ جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سیدھے ڈال کر جوڑ دی گئی ہو!

پھر اسی سورت میں آگے چل کر فرمایا: یہی وہ عمل ہے جس کے کرنے کے بعد تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں، کوئی خطا، کوئی معصیت، کوئی برائی باقی نہیں رہتی، ابدی نجات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھل جاتا ہے۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ • تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ ط وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ • يُغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ط ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ“ (۶۱: ۱۰-۱۲)

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ آنحضرتؐ سے سوال کیا گیا۔ ”ای العمل الفضل“؟ کونسا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ فرمایا ”ایمان باللہ ورسولہ“ اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا ”تم ماذا“؟ اس کے بعد؟ فرمایا ”الجهاد فی سبیل اللہ“ اللہ کی راہ میں جہاد!

بخاری میں ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے ”قیل ای الناس الفضل؟ فقال مومن يجاهد فی سبیل اللہ بنفسه وماله“ آپ سے پوچھا گیا۔ سب سے زیادہ افضل آدمی کون ہے؟ فرمایا وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرتا ہے۔

اور فرمایا۔ ”الغدوة فی سبیل اللہ اور راحة خیر من الدنيا وما فیها اور خیر مما تطلع علیہ الشمس وغرب“ (بخاری) جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صبح یا شام تمام دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر ہے اور ان ساری چیزوں سے افضل ہے جن پر سورج کھلتا اور ڈوبتا ہے۔

بخاری میں دو حدیثیں ہیں (۱) ”مامن عبدیموت له عندالله خیر یسرہ ان یرجع

الی الدنیا وان له الدنیا وما فیہا الا الشہید“

(۲) ”لما یری من فضل الشہادۃ فانه یسرہ ان یرجع الی الدنیا فیقتل مرقۃ

اخروی“ اور روایت انس ما حدیدخل الجنة یحب ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر

مرات لما یری من الکرامۃ“

حاصل دونوں کا یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں آنے کی کسی کو آرزو نہیں ہو سکتی مگر

اس کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔ جب وہ شہادت کا اجر و ثواب دیکھتا ہے تو تمنا کرتا ہے کاش پھر دنیا میں

جاسکوں اور دس مرتبہ اسی طرح اللہ کی راہ میں مارا جاؤں اور ہر مرتبہ شہادت کی عزت و کرامت حاصل

کروں۔

حد ہوگئی کہ جن لوگوں نے جنگ بدر میں جاں نثاریاں کی تھیں، اگر کبھی ان سے کوئی لغزش

ہوئی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے تو آپ ﷺ نے سزا دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا لعل اللہ اطلع علی

اہل بدر فقال اعملوا ما شئتم یہ وہ جان نثاریاں جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے عجب نہیں

کہ اس ایک عمل کے صلہ میں اللہ نے ان کی ساری پچھلی اور آئندہ خطائیں بخش دی ہوں اور کہہ دیا ہو کہ جو

جی میں آئے کرو!

طبرانی نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے اور کہ جب شام کے رومیوں کی تیاریوں کی خبر

پہنچی تو مدینہ میں مسلمانوں کی حالت نہایت نازک اور کمزور تھی کسی طرح کا ساز و سامان میسر نہ تھا۔ حضرت

عثمانؓ نے یہ حال دیکھا تو اپنا پورا تجارتی قافلہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیا جو شام جانے کے لیے

تیار ہوا تھا۔ اس میں دو سو اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے اور دو سو اوقیہ سونا تھا۔ آنحضرتؐ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لایضر عثمان ما عمل بعدھا“ آج کے دن کے بعد سے عثمان خواہ کچھ ہی

کرے لیکن کوئی عمل اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ (اخروجہ العرملی والحاکم ایضاً من حدیث

عبدالرحمن بن حباب نحوہ“

سبحان اللہ! اس عمل عظیم کی برکت و بخشش! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عمل دفاع کے لیے اپنا

مال و متاع قربان کرنا خدا اور رسول کی نظروں میں ایسا محبوب و محترم کام ہے، جس کے بعد کوئی برائی بھی

صاحب عمل کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کسی عمل کی طاعت، کسی عبادت کو بھی یہ فضیلت نہ ہوئی۔

ترمذی میں ہے ”من رابط لیلۃ فی سبیل اللہ کانت له کالف لیلۃ صیامہا

وقیامہا“ جس مسلمان نے ایک رات بھی جہاد کرتے ہوئے دشمن کے انتظار میں کاٹی، اس کے لیے ایسا

اجر ہے گویا ہزاروں کا روزہ اور ہزار راتوں کی عبادت۔

اور فرمایا: ”مقام احدکم فی سبیل اللہ خیر من عبادۃ احدکم فی اہلہ سبعین سنۃ“ (ترمذی) ساٹھ برس تک اپنے گھر میں عبادت کرنے سے بھی یہ افضل ہے کہ جہاد کے میدان میں کھڑے نظر آؤ۔

اور فرمایا ”حرس لیلہ فی سبیل اللہ، الفضل لہ من الف لیلۃ، بقام لیلہا وبصام نہارہا“ (رواہ احمد) جہاد کی ایک رات اس سے افضل ہے کہ ہزار راتیں عبادت میں اور ہزار دن روزہ میں بسر کیے جائیں۔

اور فرمایا ”حرمۃ النار عن دمعت من خبثۃ اللہ وحرمت النار علی عین سہوت فی سبیل اللہ“ (ایضاً) جو آنکھ اللہ کے خوف سے اٹکبار ہوئی، یا جہاد میں کام کرتے ہوئے جاگی، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے کہ مجاہدین کا ثواب حاصل ہو۔ فرمایا۔ ”هل يستطيع ان تصلي فلا تفتقر، وتصوم فلا تفتقر؟ اس کی طاقت رکھتے ہو کہ برابر نماز پڑھتے رہو اور قحانہ ہو برابر روزہ رکھتے رہو اور کبھی بیچ میں اظہار نہ کرو؟ عرض کیا ”انا اضعف من ان استطع ذالك“ یہ تو میری طاقت سے باہر ہے، فرمایا ”والذی نفسی بیدہا لو طرقت ذلک، ما بلغت فضل المجاہدین فی سبیل اللہ اما علمت ان فرس المجاہد لیستن فی طولہ فیکتب لہ ہذالک الحسنات“ خدا کی قسم! اگر تم ایسا کرنے کی طاقت بھی رکھتے اور کر دکھاتے، جب بھی ان لوگوں کی فضیلت کہاں پاسکتے تھے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجاہد کا گھوڑا لگام میں اچھلتا ہے تو اس کے لیے بھی اس کے نامہ اعمال میں نیکیاں درج ہوتی رہتی ہیں؟ (رواہ احمد وایضاً رواہ البخاری باختلاف بئیر)

بخاری و مسلم میں ہے۔ تین مرتبہ آپ سے پوچھا گیا۔ ما یعدل الجہاد فی سبیل اللہ؟ کونسا کام ہے جو جہاد کے برابر درجہ و فضیلت رکھتا ہو؟ تین مرتبہ فرمایا۔ ”لاستطیعولہ“ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ یعنی کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو جہاد کے برابر درجہ رکھتا ہو اور تم کر سکو، پھر فرمایا ”مثل المجاہد کمثل الصائم القائم القانت ہایات اللہ لا یفتقر عن صلاحہ ولا صیامہ حتی یوجع“

اور فرمایا۔ ”من اظہرت لجماعہ فی سبیل اللہ ساعت من نہار فہما حرام علی النار“ (رواہ احمد) جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں ایک گنہگار کے لیے بھی گرو آلود ہوئے، دوزخ کی

آگ ان قدموں پر حرام ہے۔

امام بخاری نے اسی حدیث کو یوں روایت کیا ہے۔ ”ما اشہوت (وفی روایۃ المستعملی  
”اشہوتنا“ (ماالفتیہ) قد ما عبد فی سبیل اللہ فعمسہ النار۔“ ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس بندے کے  
پاؤں جہاد کی راہ میں غبار آلود ہوتے ہوں، ان کو جہنم کی آگ بھی چھو سکے۔ حافظ عسقلانی اس کی شرح  
میں لکھتے ہیں۔ اس حدیث سے جہادنی سبیل اللہ کی حکمت و فضیلت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جب صرف  
غبار راہ سے قدموں کا آلودہ ہونا اتنا بڑا اجر رکھتا ہے کہ جہنم کی آگ ان پر حرام ہو جاتی ہے تو جو خوش  
نصیب جہاد و قارع میں کمال سعی و تدبیر کرے اور اپنی جان اور مال کو اس کے لیے وقف کر دے اس کے  
اجر و ثواب کا کیا حال ہوگا؟ اور کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ”فاللہ یضاعف لمن یشاء۔“

اور فرمایا ما من میت یموت الا یموت الا یموت عملہ، الا من مات مرابطاً فی سبیل اللہ  
فاللہ لیمولہ عملہ الی یوم القیامۃ وامن من فتنۃ القبر“ رواہ اصحاب السنن کوئی ایسی  
موت نہیں جس کے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہو جاتا ہو، الا وہ شخص کہ جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا  
انتظار کرتا ہو دنیا سے گیا سو اس کا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہے گا۔

یعنی عمل جہاد بھی حسنت جاریہ میں سے ہے۔ حسنت جاریہ جو جب نص حدیث مسلم تین  
ہیں اولاد صالح، علم نافع، اوقاف و تعمیرات خیرہ۔ مثلاً مساجد و مدارس وغیرہ جو بعد کو ہاتی رہیں۔ اس  
حدیث اور اس کی ہم معنی احادیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کا ہر کام بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ طاعت اس کی  
بالکل واضح ہے۔ عمل جہاد کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت و  
سعادت کے لیے اپنا وجود قربان کر دیا جائے۔ پس کوئی عمل نہیں جو اس سے زیادہ سچی اور بے لاگ انسانی  
خدمت اور انسان دوستی کے جذبات رکھتا ہو اور اسی لیے ضروری ہوا کہ اس کا اجر بھی واقعی نہ ہو، دائمی ہو۔  
عمل کا اجر تو نتائج پر موقوف ہے جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملیں گے تو صاحب عمل کا اجر بھی فوراً  
کیوں منقطع ہو جائے۔

اس حدیث میں ”مربطاً فی سبیل اللہ“ کا لفظ آیا ہے اور دوسری حدیثوں میں بھی جا بجا  
”رہا“ کا لفظ وارد ہے۔ ”رہا“ سے مقصود یہ ہے کہ کسی مقام میں ٹھہر کر دشمن کے حملے کا انتظار کرنا تاکہ  
جب دشمن آجائے تو اللہ کی راہ میں مقابلہ کیا جائے۔ نہایت میں ہے۔ ”هو الاقامة فی مکان یوقع  
ھجوم العدو فیھا لقصده لھمہ اللہ“ پس مربوطاً فی سبیل اللہ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر لڑکر شہید ہونے کا  
موقع نہیں ملا اور حملہ کے انتظار ہی میں موت آگئی، جب بھی اس کا اجر مرنے کے بعد برابر بڑھتا رہے گا  
اور وہ ہزاروں کے روزہ و نماز سے بھی افضل ہے اسی بنا پر امام بخاری و امام نووی وغیرہ نے فضل الرباط

فی سبیل اللہ کا باب باندھا ہے۔

قرآن بھی ہر جگہ اور بار بار یہی کہتا ہے:

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ لَا أَعْظَمُ  
دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ط وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ • يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّتِ  
لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ • خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ط إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ • (۲۲-۲۰:۹)

جو لوگ ایمان لائے، حق کی راہ میں اپنا گھریا چھوڑا، اپنی جان و مال سے جہاد کیا سو اللہ کے  
نزدیک سب سے زیادہ اور اونچا درجہ انہی کا ہے یہی لوگ ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں گے اللہ  
کی طرف سے ان کے لیے بشارت ہے۔ اس کی رحمت، اس کی محبت، بہشتی زندگی کی نعمتیں اور ان کی  
دائمی اور ہمیشگی۔ سب کچھ ان ہی کے لیے ہے۔

جو لوگ خود اپنی ذات سے جہاد و قاع میں حصہ نہ لے سکیں مگر مجاہدین کو اپنے مال و متاع سے  
مدد پہنچائیں یا اور کسی طرح کی خدمت انجام دیں تو اگرچہ وہ مجاہدین کا اجر و ثواب نہیں پاسکتے لیکن ان کے  
لیے بھی اجر ہے اور ساری عبادتوں اور طاقتوں سے بڑھ کر اجر ہے۔

ابن ماجہ میں ہے ”من رسل بنفقة فی سبیل اللہ و اقام فی بیتہ، فلہ بكل درہم  
سبع مائۃ درہم و من غزا بنفسہ سبیل اللہ و الفق فی وجہہ ذالک، فلہ لكل درہم سبع  
مائۃ الف درہم، ثم تلا هذه الآية: ” وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ“

یعنی جو مسلمان ایسے وقتوں میں گھر سے نہ نکلا، صرف اپنے روپیہ سے جہاد میں مدد دی تو اس کو  
ہر ایک روپیہ کے بدلے سات سو روپیوں کا اجر ملے گا یعنی اس اتفاق میں سات سو درجہ زیادہ اجر ہے اور  
جس نے روپیہ بھی لگایا اور خود بھی شریک کار ہوا تو اس کے لیے سات ہزار درجہ زیادہ اجر ہے۔ پھر آپ  
نے یہ آیت پڑھی۔ ”اللہ جس کسی کا اجر و ثواب چاہتا ہے دوگنا کر دیتا ہے۔

اور امام بخاری نے باب باندھا ہے۔ ”لفضل من جهز غازيا اس میں زید بن خالد کی  
حدیث لائے ہیں۔ من جهز غازيا فی سبیل اللہ فقد غزا و من خلف غازيا فی سبیل اللہ  
بخير فقد غزا“ یعنی جس شخص نے مجاہد و غازی کے سامان کا انتظام کر دیا تو گویا اس نے خود جہاد کیا اور  
جس نے اس کے پیچھے اس کے کاموں کی دیکھ بھال کی تو اس کے لیے بھی ایسا ہی اجر ہے!

اسلام نے حقوق العباد پر جس قدر زور دیا ہے، معلوم ہے، علی الخصوص والدین اور اقربا کے  
کے حقوق کہ ساری نیکیوں اور ہر طرح کی عبادتوں سے مقدم ٹھہرائے گئے۔ لیکن صرف یہی وہ عمل عظیم ہے  
جس کے لیے یہ حقوق بھی روک نہیں ہو سکتے۔ امت اور شریعت کی حفاظت ہی پر تمام افراد کی حفاظت

موقوف ہے پس اگر امت دشمنوں کے زغہ میں ہے تو نیکی کا سب سے بڑا کام جو زمین پر ہو سکتا ہے مسلمانوں کے سامنے آ گیا۔ اب اس بڑے کام کے لیے سارے چھوٹے کام چھوڑ دینے چاہئیں۔ ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، رشتے ناتے اپنی اپنی جگہ سب حق ہیں سب کا حق ادا کرنا چاہیے لیکن خدا اور اس کی سچائی کا حق سب سے بڑا حق ہے۔ اس رشتہ کے سامنے سارے رشتے ہیچ ہیں پس اگر اس کے کام کا وقت آ گیا تو سب کو اس کی خاطر چھوڑ دینا پڑے گا۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ  
بِتَرْتِيبِهَا وَبِعِبَادَةٍ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِينٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ  
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَبِصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ •  
(۲۴:۹)

مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے والدین تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور اس کے تمام رشتے، یہ مال و متاع جو تم نے کمایا ہے یہ کاروبار تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، یہ تمہارے رہنے کے محل جن میں تمہارا دل اٹکا ہوا ہے اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں اور تمہارے پاؤں ان زنجیروں میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اللہ کی پکار بھی انہیں نہیں ہلا سکتی، تو جان لو کہ اللہ کا کام بھی تمہارا محتاج نہیں۔ نتائج کا انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ جو کچھ کرنا منظور ہے کر دکھائے۔ اللہ کا قانون ہے کہ وہ نافرمانوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا! اگرچہ عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تعمیل اس وقت لازم سے الزم ہو جاتی ہے جب حملہ اعداء کی وجہ سے خاص طور پر ضرورت پیش آ جائے لیکن عزم و استقلال کے لحاظ سے یہ حکم کسی خاص وقت میں محدود نہیں۔ ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ دفاع اعداء کے لیے تیار رہیں اور تیاری کرتے رہیں۔ اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ جو دل اس کے عزم و طلب سے خالی ہوا، اس پر ایمان کی جگہ نفاق کا قبضہ ہو گیا:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ  
وَعَدُوَّكُمْ وَأَخْرَبُونَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِم ۗ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ ط (۶۰:۸)

جس قدر بھی تم سے ممکن ہو، دشمنوں کے مقابلے کے لیے اپنی قوت اور ساز و سامان سے تیار رہو تاکہ تمہاری مستعدی دیکھ کر اللہ اور اس امت کے دشمنوں پر خوف اور رعب چھا جائے تم پر حملہ کرنے کی جرات ہی نہ ہو۔



## حواشی

۱۔ وَاخْرَجَهُ اَيْضًا اِمَامَ اَحْمَدَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ وَابْنِ اَبِي حَتْمٍ وَابْنِ حَبَانَ وَالحَاكِمِ وَقَالَ صَحِيحٌ عَلٰى شَرْطِ الصَّخِيحِيْنَ، وَالبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعْبِ الْاِيْمَانِ وَالمُنَنِ وَطَبْرِيْ فِي التَّفْسِيْرِ،

KITABOSUNNAT.COM



## عہدِ نبوت کا ایک واقعہ

یہ قرآن وسنت کے احکام ہیں۔ اب دیکھیں صاحب شریعت کا اس بارے میں طرز عمل کیا رہا

۴۔

ہجرت کے نویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ رومیوں کی فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھی ہو رہی ہے۔ یہ سن کر آپ نے بھی تیاری کا حکم دے دیا اور تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے کوچ کر دیا۔ چونکہ یہ فوج بڑی ہی تگھڑتی اور بے سروسامانی کے حال میں نکلی تھی۔ اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں صرف ایک سواری آئی تھی۔ جنگل کے پتے کھا کر لوگوں نے گزارہ کیا تھا، اس لیے اس فوج کا نام ”بھیش الحمرہ“ مشہور ہوا۔ اَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۹: ۱۱۷)

آج تم خدا اور اس کے ایمان کی جگہ لوہے اور گندھک کے سامان واسلحہ کی پرستش کر رہے ہو۔ لیکن ایک وقت وہ بھی تھا، جب بے سروسامان مسلمانوں کی یہ جماعت نکلی تھی، تاکہ کرہ ارض کی سب سے بڑی متمدن قوم یعنی رومیوں سے مقابلہ کرے۔

حضرت ابو بکرؓ نے اسی دفاع کے لیے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا۔ جب ان سے پوچھا گیا ”ما اہمیت لاهلک“ اپنے نبوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ تو اس بیکرا ایمان و مجسم عشق حق نے جواب دیا تھا۔ ”اہمیت لہم اللہ ورسولہ“ اللہ اور اس کے رسول کو۔

آنکس کہ ترا بخواست، جانراچہ کندا

فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی

دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند

تو کہ نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی دلیرانہ تیاریوں کا حال سن کر رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور فوجیں منتشر ہو گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس آ گئے۔

اس وقار میں بجز منافقین کے تمام مسلمان شریک ہوئے تھے۔ صرف تین شخص نہ جاسکے۔ کعب بن مالکؓ۔ بلال بن امیہؓ۔ مرارہ بن ربیعؓ۔ کعب بن مالک سابقین انصار میں سے ہیں اور ان

سے ساتین مخلصین میں سے جو عقبہ کی بیعت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کے ایمان و اخلاص میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ ان کا شریک نہ ہونا کسی بری نیت سے نہ تھا سستی اور کاہلی سے آج کل کرتے رہے اور فوج کے ساتھ ملنے کا موقع نکل گیا۔

بائیں ہمہ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظروں میں اس درجہ اہم ہے کہ اتنی سستی اور کاہلی بھی ایک سخت جرم قرار پائی۔ معذرت کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو توبہ قبول نہ ہوئی۔ حکم ہوا کہ گھر میں بیٹھو اور فیصلہ وحی کا انتظار کرو۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تمام تعلقات ان سے ترک کر دیں۔ نہ کوئی بات چیت کرے نہ ملے جلے نہ اور کسی طرح کا واسطہ رکھے۔ پھر ان کی بیٹیوں کو حکم ملا کہ وہ بھی الگ ہو جائیں اور کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ امام بخاری نے ایک طویل روایت خود حضرت کعب بن مالک کی زبانی نقل کی ہے اور اس واقعہ کے لیے خاص باب باندھا ہے۔ کعبؓ کہتے ہیں ہمارا یہ حال ہو گیا تھا کہ سارا ماہینہ انسانوں سے بھرا تھا مگر ہمارے لیے نہ ایک آنکھ دیکھنے والی تھی نہ ایک زبان بات کرنے والی۔ خود عزیز و اقارب نے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ حسرت سے ایک ایک کا منہ نکلتے اور دیوانوں کی طرح پھرتے تھے۔ ایک دن اپنے چچیرے بھائی ابوقنادہؓ کے یہاں گیا مجھے دیکھتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ سلام کیا تو جواب نہ ملا۔ اللہ اللہ! کیا مسلمان تھے کہ ان کا رشتہ تھا تو اللہ اور اس کے رسولؐ کا رشتہ، زندگی تھی تو صرف اس کی حکم پر! الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کی مجسم تصویر تھے۔

عسان کے عیسائی پادشاہ نے یہ حال سنا تو خوش ہوا کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا اچھا موقع نکل آیا ہے۔ کعبؓ کے نام اس مضمون کا خط لکھ کر بھیجا کہ تمہارے آقا ﷺ نے تمہاری ساری عمر کی خدمتوں کا جو معاوضہ دیا ہے وہ دیکھ چکے ہو۔ اب میرے پاس چلے آؤ۔ دیکھو یہاں تمہاری کیسی عزت ہوتی ہے؟ کعب بن مالکؓ کو خط ملا تو اونچی کے سامنے آگ میں جمبو تک دیا اور کہا جواب میں کہہ دینا ہم نے جس آقا ﷺ کی چوکھٹ پر سر رکھا ہے اس کی گہرائیوں اور درباریوں کا حال تمہیں کیا معلوم! اس کی بے التفاتی بھی دوسروں کی محبت و عزت سے ہزار درجہ زیادہ عزیز و محبوب ہے:

اے جفا ہائے تو خوشتر زو فائے و گراں

ان مومنین صادقین کی یہ آزمائش پورے پچاس دن تک جاری رہی۔ بلا آخر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی اور سورہ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی

وَعَلَى الْفَلَقِ الَّذِينَ خَلَقُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَالَّتْ عَلَيْهِمُ الْآرُضُ بِمَا رَحَّبَتْ  
وَضَالَّتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنَّهُ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ فَطَمَّ نَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ  
اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۱۱۸:۹)

اور وہ تین آدمی جن کا معاملہ فیصلہ الہی کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا سو جب ان کا یہ حال ہوا کہ تمام مسلمانوں نے ان کو چھوڑ دیا، زمین باوجود اپنی وسعت کے ان پر تنگ ہو گئی۔ اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اللہ سے پناہ نہیں ہے مگر صرف اسی کی طرف تو پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ تعیناً اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرتا اور خطا کاروں کے لیے مہربانی رکھتا ہے۔

حضرت کعبؓ کو جب قبولیت توبہ کی بشارت ملی تو بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور پناہ سارا مال و متاع شکرانہ قبولیت میں نثار دینا چاہا۔

اس واقعہ میں متعدد باتیں قابل غور ہیں:

(۱) رومیوں نے حملے کی تیاریاں کیں تو اسلام و امت کی حفاظت کے لیے دفاع کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو گیا۔ موسم سخت گرمی کا تھا۔ سفر دور راز کا بے سرو سامانی حد درجہ کی۔ مقابلہ اس حکومت سے جو نصف دنیا پر حکمران تھی۔ حجاز میں فصل پک چکی تھی اور کٹائی کا اصلی وقت تھا۔ یہی فصل ملک کے لیے سال بھر کی خوراک تھی۔ اگر مشکلوں اور مجبوریوں کے عذر سننے جاسکتے ہیں تو ان حالات سے بڑھ کر اور کون سے حالات عذر داری کے لیے مناسب ہو سکتے ہیں؟ مگر دفاع کا فرض ایسا سخت اور اٹل ہے کہ نہ کوئی عذر سنا گیا، نہ کوئی مشکل رکاوٹ ہو سکی۔ حکم ہوا کہ سب کچھ چھوڑ دو ساری مصیبتیں جھیل لو۔ مگر دشمنوں کو روکنے کے لیے نکل کھڑے ہو۔ سورہ توبہ میں اس کا بڑا ہی عبرت انگیز تذکرہ ہے۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

قَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ • (۸۱:۹)

(۲) یہ تینوں مسلمان جو شرکت دفاع سے رہ گئے، مومنین مخلصین میں سے تھے ان کی

زندگیاں اسلام کی بے شمار خدمتوں اور جاں نثاریوں میں بسر ہوئی تھیں عبادتوں اور نیکیوں کا کیا پوچھنا کہ شب و روز اللہ کے رسول کے سایہ تربیت میں رہتے تھے، ان ہی کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے، انہی کے ساتھ روزے رکھتے تھے۔ صحابہ کے ایک ادنیٰ فرد کی عبادت کا مقابلہ ہم اپنی پوری نسلوں اور قوموں کی عبادت گزاریاں پیش کر کے بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت کعب بن مالکؓ سابقون الاولون میں سے تھے۔ جب اسلام کا کوئی ساتھی نہ تھا تو مدینہ کے انصار نے ساتھ دیا۔ عقبہ کی بیعت ثانیہ میں جن ۷۳ جان نثاروں نے بیعت کی تھی یہ انہی عشاق اسلام میں سے ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ کسی اسلامی خدمت میں دوسروں سے پیچھے نہ رہا۔ ہر جنگ میں شرکت کی، ہر موقع پر جان و مال نثار کیا۔ اس دفاع کی شرکت سے بھی جو رہ گئے، تودل کی کمزوری اور نیت کے فساد کی وجہ سے نہیں، چلنے کا پورا سامان کر لیا تھا۔ صرف یہ قصور ہوا کہ سستی اور کاہلی کی۔ پوری طرح مستعدی سے کام نہ لیا۔ تاہم دیکھو یہ سستی اور کاہلی بھی خدا کے حضور کیسا بڑا جرم قرار پائی کہ نہ تو کوئی پھیلی خدمت آڑے آسکی، نہ مدت العمر کی نیکیوں اور عبادتوں ہی نے

کچھ کام دیا۔ نہ کوئی بزرگی اور بڑائی اس معاملہ میں شفیق ہو سکی، نہ ایک ایسے بچے اور پرکھے ہوئے مخلص مسلمان کے لیے عذر و معذرت کی گنجائش نکل سکی۔ سخت سے سخت سزا جو دی جا سکتی تھی دی گئی اور مسلمانوں سے اسلامی برادری کا رشتہ توڑ دیا گیا۔ پچاس دنوں کے لیے جماعت سے باہر کر دیے گئے یہ سارا زمانہ گریہ و زاری اور عبادت و استغفار میں بسر ہوا تب کہیں جا کر توبہ قبول کی گئی۔

(۳) اسلام کے احکام کا قبولیت توبہ کے بارے میں جو حال ہے معلوم ہے خدا کا دروازہ رحمت کسی آنے والے کا اتنا انتظار نہیں کرتا جس قدر اس معصوب روح کا، جو توبہ کے لیے اس کی طرف بڑھے، لو اخطاتم حتی تملاء خطایا کم ما بین السماء والارض ثم استغفرتم اللہ یغفر لکم“ (رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ) اگر تم نے اتنے گناہ کیے ہوں کہ زمین و آسمان کے درمیان وسعت ان سے بھر دی جا سکے، پھر بھی توبہ کے آنسو بہاتے ہوئے آؤ تو دروازہ مغفرت کھلا پاؤ گے لیکن دیکھو، امت کی حفاظت و مدافعت سے غفلت کرنا اللہ کی نظروں میں کیسا سخت جرم ہے کہ یکا یک توبہ بھی قبول نہ ہوئی۔ تینوں صحابی آپ کی واپسی کے بعد پہلی ہی صحبت میں عنونہ نصیر کے لیے حاضر ہو گئے تھے، مگر حکم ملا کہ ابھی نہیں انتظار کرو۔ پچاس دن سزا و عقوبت کے گزر چکے تب کہیں جا کر توبہ قبول ہوئی۔

(۴) جب ان پاک اور مخلص انسانوں کا یہ حال ہوا کہ ایمان ان کا ایمان تھا اور نیکیاں ان کی نیکیاں، ان کے بستر پر خواب کے اجر و ثواب کا بھی ہماری بڑی بڑی عبادتیں مقابلہ نہیں کر سکتیں تو خدا رتلاؤ، ہم بد بختوں اور سیاہ کاروں کا کیا حشر ہوگا کہ نہ ایمان کی دولت ساتھ ہے نہ طاعت و حسنات کی پونجی و امن میں۔ زندگی یکسر برباد و غفلت و معصیت اور عمریں یک قلم تاراج نفس پرستی و نافرمانی۔ وہاں عزم و ایمان کے ساتھ سہو و نسیان تھا مگر عذر قبول نہ ہوا۔ یہاں اغراض و نفاق کے ساتھ صریح نافرمانی و انکار ہے اور پھر نہ عداوت ہے نہ توبہ و انابت ان کے ساتھ سب کچھ تھا اور کام نہ آیا ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا ہے جس نے آنے والے دن کی طرف سے بے فکر کر دیا ہے اور ہمارے غافل دلوں پر بے خونی کی موت چھا گئی ہے۔ تلاؤ زمین و آسمان میں کون ہے جو اس دن ہمیں بچا سکے گا، جب خدا کے غضب کا بے پناہ ہاتھ ہماری طرف بڑھے گا! یقول الانسان یومئذ این المعفر؟



## ایک عام غلط فہمی

البتہ یاد رہے کہ ”جہاد“ کی حقیقت کی نسبت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد کے معنی صرف لڑنے کے ہیں۔ مخالفین اسلام بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا اس عظیم الشان و مقدس حکم کی عملی وسعت کو بالکل محدود کر دیتا ہے۔

”جہاد“ کے معنی: کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں۔ قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس کمال درجہ کی سعی و کوشش کو جو ذاتی اغراض کی جگہ حق پرستی اور سچائی کی راہ میں کی جائے ”جہاد“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ سعی زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی، اتفاق وقت و عمر سے بھی۔ محنت و تکالیف برداشت کرنے سے بھی اور دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے اور اپنا خون بہانے سے بھی۔ جس سعی کی ضرورت ہو اور جو سعی جس کے امکان میں ہو وہ اس پر فرض ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں لغت و شرع، دونوں اعتبار سے یہ بات داخل نہیں ہے کہ ”جہاد“ سے مقصود مجر و لڑائی ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جہاد کا اطلاق اعمال قلبی و لسانی پر نہ ہوتا۔ حالانکہ کتاب و سنت ایسے اطلاقات سے لبریز ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول صاحب آثار نے نقل کیا ہے جو حقیقت جہاد کے بارے میں قول فیصل و جامع ہے۔ ”الامر بالجهاد منه ما يكون بالقلب، كالعزم عليه، ومنه ما يكون باللسان كال دعوة الى الاسلام والحجة والبيان والرأى والتدبير في ما فيه نفع المسلمين وبالبدن اى القتال بنفسه فيجب الجهاد بغاية ما يمكن من هذه الامور (جلد ۱: ۶۵۳)

دشمنوں کی فوج سے خاص وقت ہی مقابلہ ہو سکتا ہے لیکن ایک مومن انسان اپنی ساری زندگی ہرج و مرج و شام جہاد حق میں بسر کرتا ہے۔ مشہور حدیث ہے۔ ”المجاهد من جاهد نفسه في ذات الله والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه“

سورہ فرقان میں ہے:

فَلَا تَطِيعُ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (۵۲: ۲۵) یعنی کفار کے مقابلہ میں بڑے سے بڑا جہاد کرو۔ سورہ فرقان بالاتفاق کہی ہے اور معلوم ہے کہ جہاد بالسيف یعنی لڑائی کا حکم ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔ پس غور کرنا چاہیے کہ کئی زندگی میں کونسا جہاد تھا جس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے؟ جہاد بالسيف تو ہو نہیں سکتا لہذا وہ حق پر استقامت اور اس کی راہ میں تمام مصیبتیں اور شدتیں پھیل لینے کا

جہاد تھا۔ کسی زندگی میں جس طرح یہ جہاد جاری رہا، سب کو معلوم ہے حق کی راہ میں دنیا کی کسی جماعت نے ایسی تکلیفیں اور مصیبتیں نہ اٹھائی ہوں گی، جیسی اللہ کے رسول اور اس کے ساتھیوں نے کسی زندگی میں برداشت کیں۔ اسی پر جہاد کبیر کا اطلاق ہوا۔

اسی طرح منافقوں کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا جہاد الکفار والْمُنَافِقِينَ وَاطْلُظْ عَلَيْهِمْ (۹: ۷۳) حالانکہ منافق تو خود اسلام کے ماتحت مقہورانہ و محکومانہ زندگی بسر کر رہے تھے، ان سے جنگ و قتال کی ضرورت نہ تھی مگر ان سے بھی جنگ کی گئی۔ سو یہ جہاد بھی تبلیغ حق و اتمام حجت کا جہاد تھا جو قلب و زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

بخاری و ابن ماجہ میں ہے حضرت عائشہ نے پوچھا ”علی النساء جہاد“ کیا عورتوں کے لیے بھی جہاد ہے؟ فرمایا ”نعم جہاد، لا قتال فیہ۔ الحج والعمرة“ ہاں جہاد ہے مگر اس میں لڑنا نہیں ہے حج اور عمرہ۔ اس حدیث میں اس سنی اور ترک وطن کی محبت کو جو حج و عمرہ میں پیش آتی ہے عورتوں کے لیے جہاد فرمایا اور کہا ایسا جہاد جس میں لڑائی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑائی کے الگ کر دینے کے بعد بھی حقیقت ”جہاد“ باقی رہتی ہے۔

اگر امت کے لیے دفاع و جنگ کا وقت آ گیا یا کسی جماعت مفسدین ارض پر امام نے حملہ کیا تو ایسے وقتوں میں بھی صرف نفس جنگ ہی نہیں بلکہ سعی و کوشش کی ساری باتیں شریعت کے نزدیک جہاد ہیں۔ جس کی طاقت میں جنگ کرنا نہیں ہے اور اس نے مال دیا تو وہ بھی مجاہد ہے جس نے زبان سے دعوت و تبلیغ کی وہ بھی مجاہد ہے جس نے اس راہ میں اور کسی طرح کی تکلیف و محنت اٹھائی، وہ بھی مجاہد ہے۔ البتہ ایسے وقتوں میں اگر کوئی مسلمان لڑائی کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے پہلو تہی کرے تو اس کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ اس کا شمار مومنوں کی بجائے منافقوں میں ہوگا۔ جو مال دے سکتا ہے اور نہ دیا تو وہ بھی ایمان و اخلاص کی زندگی سے نکل گیا زمین پر گو مسلمان کہلائے پر اللہ کے حضور منافق کہلائے گا۔ جس شخص کی زبان اعلان حق کے لیے جہاد میں کھل سکتی ہے مگر نہ کھلی، اس نے بھی ایمان چھوڑ کر نفاق کی راہ اختیار کر لی۔ گو شیطان جیل اور نفس خادع اس کو ہزار فریب دیتا ہے ترمذی اور ابو داؤد میں ہے ”الفضل الجہاد کلمة حق عند سلطان جائر“ سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والا جہاد وہ کلمہ حق ہے جو شاہان جو رو ظلم کے سامنے بے باک نہ کہا جائے۔

اور پھر ان سب سے بالاتر مرتبہ ان مجاہدین کا ملیں اور اصحاب عزیمت و عمل کا ہے جن کی زندگی سر تا سر جہادنی سمیل اللہ، اور جن کا وجود سیکر خدمت حق و شہادت کی صدق، و عشق و دعوت ہے، جو اس عمل مقدس کے لیے کسی خاص صدائے تغیر اور اعلان وقت کے منتظر نہیں رہتے۔ بلکہ ہر صبح جو ان پر آتی ہے،

جہادنی سبیل اللہ کی صبح ہوتی ہے اور ہر شام کی تاریکی جو ان پر پھیلتی ہے، وہ اسی راہ کی شام ہوتی ہے ان کی زندگی پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جو جہاد کے مرتبہ علیا و فضیلت عظمیٰ کے اجر و ثواب سے خالی ہو۔

کائنات ہستی کے ہر عمل کی طرح یہ عمل بھی تین عنصروں سے مرکب ہے: دل، زبان، اعضا و جوارح۔ سوان کا دل ہمیشہ عشق حق اور عزم مقصد کی آتش شوق میں پھٹکتا رہتا ہے ان کی زبان ہمیشہ اعلان حق و دعوت الی اللہ میں سرگرم رہتی ہے۔ ان کے ہاتھ اور ان کے تمام جوارح کبھی اس راہ کی سعی و محنت سے نہیں ٹھکتے۔ اس کے بعد جہاد کا کونسا کام رہ گیا جو انہوں نے نہیں کیا؟ اس راہ کا کونسا مرتبہ رہ گیا جو انہوں نے نہیں پایا: ”ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ“ (۲۱:۵۷)

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

جہاد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کرو! انسانی اعمال کی کونسی بڑائی اور عظمت ہے جو اس کے دائرہ سے باہر رہ گئی اور نوح انسانی کی ہدایت و سعادت کا کونسا عمل حق ہے جو اس کے بغیر انجام پاسکتا ہے پس یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کی اہمیت و فضیلت پر اس قدر زور دیا کہ ساری نیکیاں، ساری عبادتیں اس سے پیچھے رہ گئیں۔ سب کا حکم شاخوں کا ہوا جڑ یہی عمل قرار پایا اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل فضیلت کی ہو سکتی ہے کہ خود اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

”والذی نفسی بیدہ، لو ددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا، ثم اقتل ثم

اقتل. ثم احیا، ثم اقتل“ (رواہ البخاری)

خدا کی قسم! اگر ممکن ہوتا تو میں یہ چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں تاکہ اس کی راہ میں جان دینے کی سعادت و لذت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے۔

تمنتی سلمی ان نموت بحیہا

واہون شئی عندنا ما تمنت



## احکام قطعیتہ دفاع

غرضیکہ ”دفاع“ اسلام کے ان بنیادی حکموں میں سے ہے، جن کو ایک مسلمان مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں کر سکتا۔ اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت باقی رہ گئی ہے تو اس کی طاقت سے باہر ہے کہ اللہ کی یہ صدائے حق سنے اور از سر تا پا کانپ نہ اٹھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ الْفِرْعَوْنُ لَمْ يَكُنْ سَبِيلَ اللَّهِ إِنَّا نَعْلَمُ إِلَى الْأَرْضِ ط أَرْضِنُكُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْأٰخِرَةِ ط فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِمِ الْأٰخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ (۳۸:۹)۔

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہو تو تمہارے قدموں میں حرکت نہیں ہوتی اور زمین پر ڈھیر ہوئے جاتے ہو؟ کیا تم نے آخرت چھوڑ کر صرف دنیا ہی کی زندگی پر قناعت کر لی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو یاد رکھو جس زندگی پر مجھے بیٹھے ہو وہ آخرت کے مقابلہ میں بالکل ہی بیچ ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

إِن تَنفَرُوا يُعَلِّبْكُمْ عَدَاؤَنَا إِلَيْكُمْ لَاجٍ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳۹:۹)

یاد رکھو اگر تم نے حکم الہی سے سر تابلی کی اور وقت کے آنے پر بھی راہ حق میں کمر بستہ نہ ہوئے تو اللہ نہایت ہی سخت عذاب میں ڈال کر اس کی سزا دے گا۔ اور تمہارے بدلے کسی دوسری قوم کو خدمت اسلام کے لیے کھڑا کر دے گا اور تم جھانٹ دیے جاؤ گے۔ کلمہ حق تمہارا محتاج نہیں ہے تم ہی اپنی زندگی و نجات کے لیے اس کے محتاج ہو!

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت! ان کی حکومتوں کے مٹانے اور ان کی آبادیوں اور شہروں کو آپس میں بانٹ لینے کے لیے کفار ایک دوسرے کے ساتھی اور حامی ہیں:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ط (۴۳:۸)

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی تو وہ ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں۔

مسلمانوں کی مخالفت میں خزانوں کے خزانے خرچ کر ڈالتے ہیں:



اِنَّ الدِّينَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصِلُوْا عَن سَبِيْلِ اللّٰهِ (۸:۳۶)  
 جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ حق کی مخالفت میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں۔

پس مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی اسلامی و ایمانی خصلت یہ قرار پائی کہ۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ (۹:۷۱)

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں باہم ایک دوسرے کی رفیق اور مددگار ہیں۔

اور اسی بنا پر مسلمانوں کا فرض ٹھہرا کہ اگر دنیا کے کسی ایک اسلامی حصہ پر غیر مسلم حملہ کریں اور وہاں کے مسلمان ان کے مقابلہ کی کافی قوت نہ رکھتے ہوں یا بالکل مغلوب و مقہور ہو گئے ہوں تو تمام دوسرے حصص عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کی یاوری و اعانت کے لیے اسی طرح اٹھ کھڑے ہوں۔ جس طرح خود اپنی آبادیوں کی حفاظت کے لیے اٹھتے اور اپنی جان و مال سے اسی طرح مدد دیں جس طرح خود اپنے گھربار کی حفاظت کے لیے مدد دیتے۔

یہ نہ کوئی نیا مذہبی اجتہاد ہے، نہ کوئی پولیٹیکل فتویٰ۔ تمام دنیا کے مسلمان فقہ و قوانین شریعت کی جو کتابیں صدیوں سے پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں اور جو چمپی ہوئی بازاروں میں ہر جگہ ملی ہیں اور جن پر خود ہندوستانی عدالتوں میں عمل کیا جا رہا ہے۔ ان سب میں یہ احکام موجود ہیں۔ اسلامی وینیات کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ملے گا جو ان حکموں سے بے خبر ہو اور پھر ان سب کے اوپر کتاب اللہ (قرآن) ہے جو اپنے ہر پارہ اور ہر سورۃ کے اندر اس حکم کا اعلان اور اس قانون کی پکار تیرہ صدیوں سے بلند کر رہی ہے۔ نوع انسانی کی کامل بیس ٹیلیس گز چنگیں اور یہ احکام اپنی یکساں، غیر متبدل، اٹل اور لا انتہا طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

”جہاد“ کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم ”قتال“، یعنی لڑائی ہے اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ”ہجوم“ اور ”دفاع“، یعنی اُفینسو (OFFENSIVE) اور ڈیفینسو (DEFENSIVE) واصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے ضروری ہے کہ حریف و منفذ قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور اسلام کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع ہوں گے۔

فقہاء کی اصطلاح میں فرائض شرعیہ کی دو قسمیں ہیں ”کفایہ“ اور ”عین“۔ یہ وہی اعمال انسانی کی قدرتی تقسیم ہے جس کو ”جماعتی فرائض“ اور ”شخصی فرائض“ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ”فرض کفایہ“ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بہ حیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں نہ کہ بہ حیثیت فرد و انفراد۔ یعنی اپنے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کر دیے گئے ہیں کہ ان کا انتظام

کردیں۔ پس انتظام ہو جانا چاہیے یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بذات خاص اس میں حصہ بھی لے۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دے دیا تو باقی مسلمانوں پر سے اس وقت ساقط ہو گیا جیسے تجنیز و تکفین اموات اور نماز جنازہ۔ البتہ ایک مسلمان کے لیے عزیمت اسی میں ہوگی کہ ادائے فرض کفایہ میں بھی حصہ لے۔

فرائض کفایہ میں شریعت کا خطاب اشخاص سے نہیں ہے بلکہ جماعت سے ہے۔ پس ہر مسلمان جماعت اور آبادی کو اس کا انتظام کر دینا چاہیے جب انتظام ہو گیا تو اس آبادی کے بقیہ افراد پر اس کا وجوب باقی نہ رہے گا۔

دوسری قسم ”اعیان“ کی ہے۔ یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہو جاسکتا جیسے پانچ وقت کی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔

شرعاً قتال کی پہلی صورت (یعنی ہجوم و مقابلہ کا دائمی سلسلہ) فرض کفایہ ہے۔ بحکم ”وما كان المؤمنون لينفروا كافة“ ضروری نہیں کہ یہ ایک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے۔ ہر عہد اور ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے۔ اگر ایک جماعت انجام دے رہی ہے تو کافی ہے جو مسلمان شریک ہوگا اس کے لیے بڑا اجر ہے جو شریک نہ ہوگا اس کے لیے کوئی گناہ نہیں۔ صاحب ہدایہ (جس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اور ہندوستانی عدالتوں میں محض لاء کی بنیادی کتاب ہے) لکھتے ہیں۔

الجهاد فرض على الكفايه اذا قام فريق من الناس سقط عن الباقيين. فان لم يقيم به احد، الم جميع الناس بتركه. لان الوجوب على الكل (كتاب السير)

جہاد فرض کفایہ ہے۔ جب مسلمانوں کی کوئی ایک جماعت اس کے لیے کھڑی ہوگئی تو باقی مسلمانوں کے لیے واجب نہیں رہا لیکن اگر کوئی گروہ بھی اس کے لیے نہ اٹھا تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کر دینے کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے، کیونکہ فرض پوری قوم پر ہے۔

لیکن جماعت سے کیا مقصود ہے! تمام دنیا کے مسلمانوں کی مجموعی جماعت یا ہر ہر ملک اور اقلیم کی جماعت؟ اس کی تشریح سہی جلی حاشیہ عنایہ میں کرتے ہیں:

القول لا يبغي ان يفهم منه ان الوجوب على جميع اهل الارض  
كاله حتى يسقط عن اهل الهند بقيام اهل الروم اذ لا يندفع  
بقيامهم الشرع عن الهنود. المسلمون وان قوله تعالى قاتلوا الذين

يَلُو نَكْمَ مِنَ الْكُفَّارِ يَدُلُّ عَلَىٰ اَنْ الْوَجُوبَ عَلَىٰ اَهْلِ كُلِّ قَطْرٍ  
يَقْرَبُنَ الْكُفَّارَ. (مجموعہ فتح القدير ۳: ۲۸)

ہدایہ کی عبارت کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ اگر ایک ملک کے مسلمانوں نے یہ فرض ادا کر دیا تو دوسرے ملک کے مسلمانوں پر سے ساقط ہو گیا۔ مثلاً اگر روم کے ترکوں نے جہاد قائم رکھا تو ہندوستان کے مسلمانوں پر سے ساقط ہو گیا۔ کیونکہ مقصود قیام جہاد سے یہ ہے کہ مسلمانوں پر سے دشمنوں کے حملوں اور شرک و دور کیا جائے ظاہر ہے کہ مسلمانان روم کے جہاد کرنے سے مسلمانان ہند محفوظ نہیں ہو جاسکتے۔ وہ تو تب ہی محفوظ ہوں گے جب خود اپنے ملک میں اس کا انتظام کریں۔ پس مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اگر اس ملک کے تمام مسلمانوں میں سے ایک جماعت یہ فرض انجام دیتی رہی تو وہاں کے بقیہ مسلمانوں پر سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا لیکن دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر فرضیت باقی رہے گی۔ قرآن میں ہے: قَاتِلُوا الدِّينَ يَلُو نَكْمَ مِنَ الْكُفَّارِ۔ (۱۲۳:۹) اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان

مسلمانوں پر جو دشمنوں سے قریب ہوں قتال واجب ہے۔ انہما

اس سے واضح ہو گیا کہ اس فرض میں خطاب تمام مسلمانان عالم سے نہیں ہے بلکہ ہر جماعت اور ملک کے مسلمانوں سے ہے اور علی الکفایہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے کچھ مسلمان اس فرض کو انجام دیتے رہیں بلکہ ہر ملک کے مسلمانوں میں سے اتنے مسلمانوں کو انجام دینا چاہیے۔ کہ حصول مقصد جہاد کے لیے کافی ہو۔ پس ایک ملک میں سلسلہ جہاد کے بقاء سے دوسرے ملک کے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ان پر بدستور اس کا وجوب باقی رہے گا اور بصورت ترک اس ملک کے تمام مسلمان گنہگار ہوں گے۔ گزشتہ پانچ صدیوں سے مسلمانان عالم نے اس فرض شری کو یک قلم فراموش کر دیا ہے اور صرف کسی ایک حصہ کے مسلمانوں ہی کے ذمہ اس کو چھوڑ کر خود فارغ البال ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اعدائے حق کو صدیوں کی صدیاں عروج و ظہور کے لیے مل گئیں، اور مسلمانوں کے لیے تمام کرۂ ارضی میں ایک گوشہ بھی امن و سکون کا باقی نہ رہا۔ لَمَّا كَانَ اللَّهُ لِيُظَلِّمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ۔ (۷۰:۹)

اور فتح الباری میں ہے ”هو فرض كفایہ علی المشهود، الا ان تدعو الحاجه

الیہ“ اس کے بعد کہا ”وان جنس جهاد الكفار متعين على كل مسلم، اما بیده، و اما

ہلسانہ و اما بما لہ و اما بقلبہ“ (جلد ۶: ۲۸) یعنی جہاد کی یہ قسم فرض کفایہ ہے۔ باقی رہائش جہاد تو وہ ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ کسی کے لیے ہاتھ سے، کسی کے لیے مال سے، کسی کے لیے دل سے۔ یعنی جس وقت ایک گروہ ہاتھ اور تلواریں سے معروف جہاد ہوگا تو بقیہ مسلمانوں پر دل اور زبان سے ان کی سعی و اعانت فرض ہوگی اور مال و دولت والوں کا فرض ہوگا کہ مال سے مدد کریں۔

اسی طرح اقرار میں ہے۔ ”ہو فرض کفایہ اذا قام بہ من یکفی سقط وجوبہ عن غیرہم“ ابن ادریس اس کی شرح میں لکھتے ہیں و معنی الکفایہ فی الجہاد ان ینھض الیہ قوم یکفون فی جہادہم اما ان یکونوا جنداً الہم دو امین او یکونوا اعدوا انفسہم لہ تبرعاً و تكون فی الثغور من یدفع العد و عنھا و یبعث فی کل سنت جیشا یمرون علی العد و فی بلادہم“ (جلد ۱: ۶۵۱)

یہ صورت تو اس قتال کی ہے جس کی صورت حملہ و هجوم کی ہوگی۔ دوسری قسم ”دفاع“ ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں پر حملہ کا قصد کرے تو اس حملہ و تلواریں سے محفوظ کا مقابلہ کرے روکنا اور اسلامی ملکوں اور آبادیوں کو غیر مسلموں کی حکومت اور ہر طرح بغض و اثر سے محفوظ رکھنا۔

یہ فرض کفایہ نہیں ہے بلکہ بالاتفاق مثل نماز روزہ کے ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو جاسکتے۔ جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے نماز ساقط نہیں ہو جاتی۔ اسی ”ہدایہ“ میں ہے۔

”الا ان یکون النفر عاماً فحینئذ بصر من فروض الاعیان“

نفر ”نفر“ سے ہے ”نفر“ کے معنی ہیں تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑ جانا۔ پس قوم کے ایسے بلاوے اور اجتماع پر جو لڑائی کے لیے ہو ”نفر“ کا اطلاق ہوا۔ قرآن میں ہے۔ اِنْفِرُوا خِفَافًا وَ ثِقَالًا (۹: ۴۱) اور اَلَا تَنْفِرُوا (۹: ۳۹) مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع و قیام کا وقت آ گیا تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے۔

ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

هذا اذا لم یکن النفر عاماً فاذا کان النفر عاماً بان ھجموا علی بلدہ من بلاد المسلمین فیبصر من فروض الاعیان سواء کان المستنفر عدلاً او فاسقاً.

(فتح القدیر ۴: ۲۸۰)

فرض کفایہ کی صورت اس وقت تک ہے کہ نفیر کی حالت نہ ہو لیکن اگر مسلمانوں کے شہروں

میں سے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جائے گا۔ خواہ جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق۔

اور عنا یہ میں ہے:

”کم الجهاد یصیر فرض عین عند النفر العام علی من یقرب من العدو وهو

یقدر علیہ“ (مجموع فتح القدر ۴: ۲۸۱)۔

اور اگر نفر عام کی حالت ہو تو پھر جہاد کرنا ان سب مسلمانوں پر فرض عین ہو جائے گا جو دشمن

سے قریب ہوں اور اس پر قدرت رکھتے ہوں۔

اسی طرح سراجیہ، درالختار اور شامی وغیرہ تمام کتب فقہ میں ہے۔

”اذا جاء النفر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو اور الجهاد

فرض کفایہ اذا لم یکن النفر عاما فاذا اقام به البعض یسقط عن الباقین، فاذا صار

النفر عاما، فحينئذ یصیر من فروض الاعیان“ الخ

حملہ و ہجوم کے دائمی جہاد میں (جب قتال فرض کفایہ ہوتا ہے)۔ بعض جماعتیں مستثنیٰ ہیں مثلاً

عورتیں اور نوکر عورتوں کے لیے شوہر کی خدمت اور نوکر کے لیے آقا کی خدمت مقدم ہے۔ لیکن اگر دفاع

کی صورت پیش آگئی ہو تو اس کی فرضیت ایسی ہمہ گیر اور پالاتر ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گروہ،

کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، بیوی بلا شوہر کی اجازت کے نکل کھڑی ہو۔ غلام بلا آقا کی اذن کے مشغول

جہاد ہو جائے۔ ہدایہ میں ہے:

”فان هجم العدو على بلد وجب على جميع الناس الدفع تخرج المرأة

بغير اذن زوجها والعبد بغير اذن المولى لانه صار فرض عين، وملك اليمين ورق

النكاح لا يظهر لى حق فروض الاعيان كما فى الصلوة والصوم بخلاف ما قبل النفر

لان بغيرهما مقنعاً فلا ضرورة الى ابطال حق المولى والزوج (کتاب السير)

لیکن اگر دشمنوں نے کسی شہر پر حملہ کیا، تو پھر تمام لوگوں پر دفاع فرض ہو گیا بیوی بلا شوہر کی

اجازت کے اور غلام بلا آقا کی اذن کے دفاع میں حصہ لے اس لیے کہ اب جہاد فرض عین ہو گیا اور جو

فرائض ایسے ہیں ان پر ملکیت اور زوجیت کے حقوق موثر نہیں ہو سکتے جیسے نماز اور روزہ۔ اگر نماز کا وقت

آ گیا ہے تو عورت پر نماز فرض ہوگئی شوہر کے اذن پر موقوف نہیں۔ البتہ نفر سے پہلے یہ صورت نہ تھی۔

اس وقت عورتوں اور غلاموں کی شرکت کے بغیر بھی یہ فرض ادا ہو سکتا تھا۔ پس ضرورت نہ تھی کہ شوہر اور آقا

کے حقوق باطل کیے جائیں۔

ہم نے ہدایہ اور متداول کتب فقہ کی عبارتیں سب سے پہلے اس لیے نقل کیں کہ ان کتابوں کے نام سے ہندوستان کی سرکاری عدالتیں بھی آشنا ہیں اور انگریزی میں مخزن لاء پر جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں سب میں ان کا حوالہ موجود ہے۔ پس باسانی دیکھ لیا جاسکتا ہے کہ فی الحقیقت اسلام کے شرعی احکام یہی ہیں یا نہیں؟ ورنہ تمام کتب تفسیر و حدیث میں بھی یہ احکام موجود ہیں۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے ”وجوب النفیر“ یعنی جب حفاظت کی ضرورت پیش آجائے تو قتال کے لیے سب اللہ کھڑا ہونا واجب ہے۔ پھر آئیے ”انفروا حفاظاً وبقالا“ (۳۱:۹) اور ”مآلکم اذا قیل لکم انفروا“ (۳۸:۹) (الخ) سے وجوب پیدائش لایا گیا ہے اللہ کے بعد حضرت ابن عباس کی روایت درج کی ہے ”لا ہجرۃ بعد الفتح ولكن جہاد ونبیہ ولبیہ استنفرتم لاستنفرنا“ یعنی وہ جو اوائل اسلام میں ایک خاص طرح کی ہجرت فرض ہوئی تھی تو فتح تک ہجرت کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ جہاد اور عزم جہاد قیامت تک باقی ہے تو جب جمع ہونے کے لیے پکارے جاؤ جمع ہو جاؤ اور جہاد کرو۔

فتح الباری میں ہے ”الا ان تدعوا الحاجة اليه كان يدھم العدو ويتعين على عينه الامام“ (جلد ۶: ۲۸)

اور موطا امام مالک میں ہے ”اذا كان الكفار مستقرين بلادهم فالجھاد فرض كفايه ان اقام به بعضهم سقط الحرج عن الباقيين و اذا قصدوا بلادنا واستنفر الامام المسلمین و جب على الاعيان“ یعنی اگر کفار اپنے اپنے ملکوں میں ہیں مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہوئے ہیں تو اس حالت میں جہاد فرض کفایہ ہے لیکن جب وہ ہمارے ملکوں کا قصد کریں اور امیر اسلام نفیر کا اعلان کرے تو پھر فرض عین ہو جائے گا۔

چونکہ باب ”نفیر“ کا لفظ آیا ہے اس لیے یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیے کہ نفیر عام سے مقصود کیا ہے؟ اس سے یہ مقصود ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آجائے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یا یہ مقصود ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا مسلمانوں کو نہ بلائے گا نفیر عام کی حالت پیدا نہ ہوگی؟ اس کا جواب شاہ ولی اللہ نے موطا کی شرح میں دے دیا ہے۔

”نزدیک استنفر جہاد فرض علی الاعیان می شود استنفر راجع منقطع کینم حاصل شود حالتی کہ مقتضائے استنفر شدہ است از قصد کفار بلا و مارا و قیام حرب در میان جیوش مسلمین و کافرین و عدم کفایہ ازال مسلمانان انچه بدان ماند (مسوی جلد ۲: ۱۳۹)“

شاہ صاحب کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نفیر کی صورت کیا ہے؟ تو یہ ضروری نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارے کہ آؤ جہاد کرو۔ مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو

مستحقانے نفیر ہے۔ پس جب غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا اور مسلمانوں اور کافروں میں لڑائی شروع ہوگئی تو جہاد فرض ہو گیا اور جب دشمنوں کی طاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہوئی اور ان کی شکست کا خوف ہوا تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانان عالم پر جہاد فرض ہو گیا۔ خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے۔ پکارنے والا نہیں ہے تو یہ مسلمانوں کی بد نظمی و بد حالی ہے۔ ان کا فرض ہوگا کہ داعی و امیر کا انتظام کریں۔ یہی حال تمام فرائض کا ہے۔ نماز کا جب وقت آجائے تو خواہ موذن کی صدائے ”حسی علی الصلوٰۃ“ سنائی دے یا نہ دے، وقت کا آجانا و جوب کے لیے کافی ہوتا ہے۔



## ترتیب وجوب دفاع

جب دفاع کا فرض عین ہونا واضح ہو گیا تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے شریعت نے ایک خاص ترتیب اختیار کی ہے۔ عقل و حکمت کی بناء پر وہی اس معاملہ کی قدرتی اور صحیح ترتیب ہو سکتی تھی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ غیر مسلموں نے کسی اسلامی حکومت اور آبادی کا قصد کیا تو اس شہر کے تمام مسلمانوں پر یہ مجرد قصد اعداء دفاع فرض عین ہو گیا۔ باقی رہے دیگر ممالک کے مسلمان، تو اگر زبرد جنگ مقامات کے مسلمان دشمن کے مقابلہ کے لیے کافی قوت نہیں رکھتے دشمن بہت زیادہ قوی ہے۔ یا قوت تو رکھتے ہیں مگر غفلت و تساہل کرنے لگے ہیں تو اس حالت میں یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر بھی دفاع فرض عین ہو جائے گا بالکل اسی طرح جیسے نماز اور روزہ۔

مگر صورت اس کی یوں ہوگی کہ پہلے اس مقام سے قریب تر مقامات کے مسلمانوں پر واجب ہوگا، پھر ان سے قریب تر پھر ان سے قریب تر پر حتیٰ کہ مشرق و مغرب، جنوب و شمال، تمام اکناف عالم کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے فرضیت عائد ہو جائے گی۔

اس وقت سارے فرانس، سارے وٹانف، سارے کام ملتوی کر دینے چاہئیں۔ یہ مجرد اطلاع ہر مسلمان کو اپنی تمام قوتوں اور ساز و سامان کے ساتھ وقف دفاع ملت و جہاد فی سبیل اللہ ہو جانا چاہیے اور قیام، قاع کے لیے شرعاً جن جن وسائل و انتظامات کی ضرورت ہے۔ سب کو مل کر ان کا انتظام کرنا چاہیے۔ اگر کسی آبادی میں مسلمانوں کا کوئی امام و پیشوا نہیں ہے جو عظم و قیام اپنے ہاتھ میں لے تو سب کا فرض ہوگا کہ پہلے امام دامیر کا انتظام کریں۔ پھر جن جن وسائل کی ضرورت ہو ان کے حصول کے لیے ہر ممکن تدبیر وسیعی کام میں لائیں اگر ایسا نہ کیا گیا تو سب اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ سب بتلائے معصیت و فسق ہوں گے۔ ایسی معصیت، ایسا فسق، ایسا عدوان، ایسا نفاق جس کے بعد صرف کفر ہی کا درجہ ہے۔

اگر قیامت کا آنا حق ہے اور یہ جھوٹ نہیں کہ خدا کا وجود ہے تو مسلمانان عالم کے پاس اس وقت کیا جواب ہوگا جب قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ تم کروڑوں کی تعداد میں زندہ و سلامت موجود تھے تمہارے جسوں سے روح کھینچ نہیں لی گئی تھی، تمہاری قوتوں کو سلب نہیں کر لیا گیا تھا، تمہارے کان بہرے نہ تھے، نہ ہاتھ کئے ہوئے اور پاؤں لنگڑے تھے پھر تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تمہارے سامنے تمہارے



بھائیوں کی گردنوں پر دشمنوں کی تلواریں چل گئیں، وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے اسلام کی آبادیاں غیروں کے قبضہ و تسلط سے پامال ہو گئیں۔ پر نہ تو تمہارے دلوں میں جنش ہوئی، نہ تمہارے قدموں میں حرکت ہوئی، نہ تمہاری آنکھوں نے محبت و ماتم کا ایک آنسو بہایا اور نہ تمہارے خزانوں پر سے بجلی دزر پرستی کے لقل ٹولے۔ تم نے چین اور آرام کے بستروں پر لیٹ کر بربادی طلت اور پالمائی اسلام کا یہ خونیں تماشا دیکھا اور اس بے درد تماشا کی کی طرح بے حس و حرکت نکتے رہے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر ڈوبتے ہوئے جہازوں اور بہتی ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہا ہوا!

”ارضیتم بالحیاة الدنیا من الآخرة؟ لماعتاع الحیاة الدنیا فی

الآخرة الا لقلیل!“

(تم آخرت سے غافل ہو کر دنیا کی زندگی میں مگن رہے) کیا تمہیں معلوم نہ

تھا) دنیا کا عیش و آرام چند روزہ ہے؟

فتح القدیر میں ہے

”لیجب علی جمیع اهل تلك البلدة النفرة، وكذا من يقرب منهم ان لم

یکن باهلها کفایة وكذا من يقرب ان لم یکن باهلها کفایة وكذا من يقرب ممن يقرب

ان لم یکن بمن يقرب کفایة او تکاسلوا وعصوا وهکذا الی ان یحب علی جمیع اهل

الاسلام شرقاً وغرباً“ (جلد ۲ صفحہ ۸۴)

اگر غیر مسلموں نے حملہ کیا تو پھر اس شہر کے تمام باشندوں پر دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا

فرض میں ہو جائے گا اور اگر دشمن زیادہ طاقتور ہیں اور مقابلہ کے لیے وہاں کے مسلمان کافی نہیں تو جو

مسلمان ان سے قریب ہوں ان پر بھی فرض میں ہو جائے گا اور اگر وہ بھی کافی نہیں یا انہوں نے سستی کی یا

دانستہ انکار کیا تو پھر ان تمام لوگوں پر جو ان سے قریب ہوں یہ فرض عائد ہوگا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے

اس کا وجوب منتقل ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ تمام مسلمانوں پر خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، دفاع کے

لیے اٹھ کھڑا ہونا فرض ہو جائے گا۔ انتہا

ایسا ہی تمام کتب معتدہ فقہ و حدیث میں ہے۔ عبارتوں کے نقل و ترجمہ میں طول ہوگا۔

رد المحتار وغیرہ کی شروع میں ذخیرہ سے نقل کیا۔

”فاما من ورائهم بعد من العدو، فهو فرض کفایة علیهم حتی

یسمعهم ترکه، اذا لم یحتج الیهم بان عجز من کان یقرب من

العدو عن المقاومة، اولم یعجزوا عنها لکنهم تکاسلوا، فانه

يفترض على من يليه فرض كالصلوة والصوم لا يسممهم تركه  
وتم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً“.

اور عتابیہ شرح ہدایہ میں ہے:

”ثم الجهاد يصير فرض عين عند النفي العام على من يقرب من  
العدو وهو يقدر عليه، واما من ورائهم فلا يكون فرضاً عليهم الا  
اذا احتيج اليهم اما بعجز القريب، واما للتكاسل، فحينئذ يفرض  
على من يليهم“ الخ

اور شرح موطا میں ہے:

”فان لم تقع الكفاية بمن نزل بهم يحجب على من بعد منهم من

المسلمين عونهم“ (جلد ۲-۱۲۹)

البتہ یاد رہے کہ یہ دفاع کی عام صورت ہے۔ لیکن دو حالتیں شرعاً ایسی بھی ہیں جن میں  
وجوب دفاع کے لیے کیے بعد دیگرے اس تربیت اور ”الا لرب لالا لرب“ کی ضرورت باقی نہیں  
رہتی۔ بیک وقت اور بیک دفعہ ہی تمام مسلمانان عالم پر دفاع فرض ہو جاتا ہے۔

پہلی حالت یہ ہے کہ خلیفہ وقت تمام مسلمانان عالم سے طالب اعانت ہو یا اس کی بے بسی و  
بے چارگی کی حالت ایسی ہو جائے کہ بلا تمام مسلمانان عالم کی مجموعی اعانت کے ٹکسی و فتح ممکن نہ ہو۔  
دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کے عین مرکزی مقام یعنی جزیرہ عرب پر غیر مسلم حملہ آور  
ہوں۔ جن کو ہمیشہ غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بستہ ہو۔  
تفصیل اس کی آگے آتی ہے۔



KITABOSUNNAT.COM

## جزیرہ عرب و بلادِ مقدسہ

### مرکزِ ارضی

کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کا کوئی ارضی مرکز نہ ہو۔ کوئی تعلیم باقی نہیں رہ سکتی، جب تک اس کی ایک قائم و جاری درسگاہ نہ ہو۔ کوئی دریا جاری نہیں رہ سکتا جب تک ایک محفوظ سرچشمہ سے اس کا لگاؤ نہ ہو۔

نظامِ شمس کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنے مرکزِ شمس ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالاتر جاہلیت ہے جس نے یہ پورا معلق کارخانہ سنبھال رکھا ہے، اللہ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى (۲:۱۳) یہی قانونِ الٰہی ہے جس پر انکی شریعت کے تمام جماعتی احکام مبنی ہیں۔ پس جس طرح اسلام نے امت کی بقا و روح و ہدایت کے قیام کے لیے ہر طرح کے مرکز قرار دیے، ضروری تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیام تک کے لیے قرار دے دیا جاتا۔

ان بے شمار مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، اسلام نے اس غرض سے سرزمینِ حجاز کو اپنے مرکز کے طور پر منتخب کیا یہی نافِ زمین دنیا کی آخری اور دائمی ہدایت و سعادت کے لیے مرکزی سرچشمہ اور روحانی درسگاہ قرار پائی اور چونکہ سرزمینِ حجاز جزیرہ عرب میں واقع تھی، وہی اسلام کا اولین وطن، وہی اس کا سب سے پہلا سرچشمہ تھا اس لیے ضروری تھا کہ اسلامی مرکز کے قریبی گرد و پیش کا بھی وہی حکم ہوتا جو اصل مرکز کا ہوتا ہے۔ لہذا یہ تمام سرزمین بھی جو کہ حجاز کی ”وادیِ غیر ذی زرع“ کو گھیرے ہوئے ہے اسی حکم میں داخل ہوگئی۔ ذَلِكُمْ تَقْلِيدُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۹۶:۶)

”مرکزِ ارضی“ سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دنیا کی بین الہنی دعوت تھی۔ وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کے اجزا تمام کرۂ ارضی میں بکھر جانے اور پھیل جانے والے تھے۔ پس ان بکھرے ہوئے اجزا کو ایک دائمی متحدہ قومیت کی ترکیب میں قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایک مقام ایسا مخصوص کر دیا جاتا، جو ان تمام متفرق و منتشر اجزاء کے لیے اتحاد و انعام کا مرکزی نقطہ ہوتا کہ سارے بکھرے ہوئے اجزاء وہاں پہنچ کر سمٹ جاتے۔ تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جاتیں۔ ہر شاخ کو اس جڑ سے زندگی ملتی۔ ہر نہر اس سرچشمہ سے سیراب

ہوتی۔ ہر ستارہ اس سورج سے روشنی اور گرمی لیتا۔ ہر دوری اس سے قرب پاتی۔ ہر فصل کو اس سے مواصلت ملتی۔ ہر امتیاز کو اس سے اتحاد و یکپارگی حاصل ہوتی۔

وہی مقام تمام امت کی تعلیم و ہدایت کے لیے ایک وسیلہ درساگاہ کا کام دیتا۔ وہی تمام کرۂ ارضی کی پھیلی ہوئی کثرت کے لیے نقطہ وحدت ہوتا۔ ساری دنیا ٹھنڈی پڑ جاتی پر اس کا تصور کبھی نہ بھٹتا۔ ساری دنیا تاریک ہو جاتی، مگر اسکی روشنی کبھی گل نہ ہوتی۔ اگر تمام دنیا اولاد آدم کے ہا ہی جنگ و جدال اور فتنہ و فساد سے خون ریزی کی دوزخ بن جاتی پھر بھی ایک گوشہ قدس ایسا رہتا جو ہمیشہ امن و رحمت کی بہشت ہوتا اور انسانی فتنہ و فساد کی پرچھائیں بھی وہاں نہ پڑ سکتی۔

اس کا ایک ایک چھوٹا سا حصہ ہوتا اس کا ایک ایک کونہ خدا کے نام پر محترم ہو جاتا اور اس کا ایک ایک ذرہ اس کے جلال و قدوسیت کی جلوہ گاہ ہوتا۔ خونریز اور سرکش انسان ہر مقام کو اپنے ظلم و فساد کی نجاست سے آلودہ کر سکتا۔ پر اس کی فضائے مقدس ہمیشہ پاک و محفوظ رہتی اور جب زمین کے ہر گوشے میں انسان کی سرکشی اپنی نجر مانہ خداوندی کا اعلان کرتی تو وہاں خدا کی ہچی پادشاہت کا تختِ عظمت و جلال بچھ جاتا اور اس کا ظلم و ماطفت تمام بندگان حق کو اپنی طرف کھینچ بلاتا۔

دنیا پر کفر و شرک کے جماؤ اور اٹھان کا کیسا ہی سخت اور بڑا وقت آ جاتا، مگر ہچی توحید اور بے میل خدا پرستی کا وہ ایک ایسا گھر ہوتا، جہاں خدا اور اس کی صداقت کے سوانہ کسی خیال کی پہنچ ہوتی، نہ کسی صدا کی گونج اٹھ سکتی۔

وہ انسان کی پھیلی ہوئی نسل کے لیے ایک مشترک اور عالمگیر گھر ہوتا۔ کٹ کٹ کر قومیں وہاں جڑتیں اور بکھر بکھر کے نسلیں وہاں بنتیں۔ پرند جس طرح اپنے آشیانوں کی طرف اڑتے ہیں اور پرڈانوں کو تم نے دیکھا کہ روشنی کی طرف دوڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کے گروہ اور قوموں کے قافلے اس کی طرف دوڑتے اور زمین کی خشکی و تری کی وہ ساری راہیں جو اس تک پہنچ سکتیں، ہمیشہ مسافروں اور قافلوں سے بھری رہتیں۔

دنیا بھر کے زخمی دل وہاں پہنچنے اور شفا اور تندرستی کا مرہم پاتے۔ بے قرار و مضطرب روجوں کے لیے اس کی آغوش گرم میں آرام و سکون کی ٹھنڈک ہوتی۔ گناہ کی کشائفتوں سے آلودہ جسم وہاں لائے جاتے اور محرومی و نامرادی کی مایوسیوں سے گھائل دل چیتنے اور تڑپتے ہوئے اس کی جانب دوڑتے تو اس کی پاک ہوا کو امید و مراد کی عطر بیزی سے مشکبار ہو جاتی، اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں خدا کی محبت و بخشش کے بادلوں میں چھپ جاتیں اور اس کی مقدس فضا میں رحمت کے فرشتے غول درغول اتر کر اپنی معصوم مسکراہٹ اور اپنے پاک لغوں کے ساتھ مغفرت و قبولیت کی بشارتیں بانٹتے۔

شاخوں کی شادابی جز پر موقوف ہے۔ درختوں کی جزا اگر سلامت ہے تو شاخوں اور چوں کے مرجھانے سے باخ اجز نہیں جاتا۔ دس ٹہنیاں کاٹ دی جائیں گی تو تین نئی نکل آئیں گی۔ اسی طرح قوم کا مرکز ارضی اگر محفوظ ہے تو اس سے منسوب قوم کے بکھرے ہوئے کھلوں کی بربادی سے قوم نہیں مٹ سکتی۔ سارے کھلے مٹ جائیں، مگر مرکز ہاتی ہے تو پھر نئی شاخیں پھوٹ آئیں گی اور نئی نئی زندگیاں ابھریں گی۔ پس جس طرح مسلمانوں کے اجتماعی دائرہ کے لیے خلیفہ و امام کے وجود کو مرکز ٹھہرایا گیا، اسی طرح ان کی ارضی وسعت و پھیلاؤ کے لیے عبادت کدہ ابراہیمی کا کعبہ اللہ، اس کی سرزمین حجاز، اور اس کا ملک جزیرہ عرب دائمی مرکز قرار پایا۔ یہی معنی ان آیات کریمہ کے ہیں کہ:

جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ لِيُخَلِّقَ لِلنَّاسِ (۹۷:۵)

اللہ نے کعبہ کو جو اس کا محترم گھر ہے انسانوں کے بقا و قیام کا باعث (اور مرکز) ٹھہرایا۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَقَابِلَةَ لِلنَّاسِ وَأَمْنَا (۱۲۵:۲) اور جب ایسا ہوا کہ ہم نے خانہ کعبہ کو انسانوں کے لیے اجتماع کا مرکز اور امن کا گھر بنایا

اور

وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۹۷:۳) جو اس کے حدود کے اندر پہنچ گیا، اس کے لیے کسی طرح کا خوف اور ڈر نہیں۔

اور یہی علت تھی تحویل قبلہ کی نہ وہ جو لوگوں نے بھی!

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَلَئِنْ أُوْجُوْهُكُمْ سَطَرَةٌ (۱۵۰:۲)

اور تم کہیں بھی ہو، لیکن چاہیے کہ اپنا رخ اسی کی جانب رکھو!

کیونکہ جب یہی مقام ارضی مرکز قرار پایا تو تمام افراد قوم کے لیے لازمی ہوا کہ جہاں کہیں بھی ہوں، رخ ان کا اسی طرف رہے اور دن میں پانچ مرتبہ اپنے قومی مرکز کی طرف متوجہ ہوتے رہیں اور یاد رہے کہ من جملہ بی شمار مصالح و حکم کے، ایک بڑی مصلحت فریضہ حج میں یہ بھی ہے کہ ساری امت، تمام کمرہ ارضی اور تمام اقوام عالم کو، اس نقطہ مرکز سے دائمی پیوستگی بخش دی۔

وَأَيُّنَ لِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ

كُلِّ فَتْحٍ عَمِينٍ (۲۷:۲۲)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ پھر ایسا ہوگا کہ ساری دنیا کو یہ گوشہ برکت سمجھنے بلانے گا۔ لوگوں کے پیادے اور سوار قافلے دور دور سے یہاں پہنچیں گے۔



## احکام شرعیہ

اس مرکز کے قیام و بقا کے لیے سب سے پہلی بات یہ تھی کہ دائمی طور پر اس کو صرف اسلام کے لیے مخصوص کر دیا جائے جب تک یہ خصوصیت قائم نہ کی جاتی امت کے لیے اس مرکزیت کے مطلوبہ مقاصد و مصالح حاصل نہ ہوتے۔

چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا:

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا. (۲۸:۹)

مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کے لیے مخصوص ہیں اب آئندہ کوئی غیر مسلم اس کے قریب بھی نہ آنے پائے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں، بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں۔ جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا ہے کہ مسجد حرام سے مقصود صرف احاطہ کعبہ ہی نہیں ہے بلکہ تمام سرزمین حرم ہے اور دلائل و مباحث اس کے اپنے مقام پر درج ہیں۔

اور اسی طرح احادیث و صحیحہ سے جو حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، انس، جابر، ابو ہریرہ، عبداللہ بن زید، رافع بن خدیج، ہبل بن حنیف وغیرہم اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں ثابت ہو چکا ہے کہ مدینہ کی زمین بھی مثل مکہ کے حرم ہے اور عمر و ثور اس کے حدود ہیں۔ المدینہ حرام مابین عبیر الی ثور“ اخرجه الشيخان اور روایت سعد کہ ”انی احرم مابین لابتی المدینہ ان یقطع اعضاها او یقتل صیدھا“ رواہ مسلم اور روایت انس متفق علیہ کہ ”اللهم ان ابراهیم حرم مکہ، وانی احرم مابین لا بیتھا“ خدا یا! ابراہیم نے مکہ کو حرم ٹھہرایا اور میں مدینہ کو حرم ٹھہراتا ہوں۔ یہ احکام تو خاص اس مرکز کی نسبت تھے، باقی رہا اس کا گرد و پیش یعنی جزیرہ عرب، تو گواس کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی تاہم اس کا خالص اسلامی ملک ہونا ضروری تھا تاکہ اسلامی مرکز کا گرد و پیش اور اس کا مولد و نشا ہمیشہ غیروں کے اثر سے محفوظ رہے۔

اسلام کا جب ظہور ہوا تو علاوہ مشرکین عرب کے یہود و نصاریٰ کی ایک بڑی جماعت جزیرہ عرب میں آباد تھی۔ مدینہ میں یہودیوں کے متعدد قبیلے تھے۔ خیبر میں انہی کی ریاست تھی۔ یمن میں نجران عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا۔

مدینہ کی سرزمین خود آپ کی زندگی ہی میں یہودیوں سے خالی ہو گئی۔ آخری جماعت جو مدینہ

سے خارج کی گئی جو قبیلہ اشعور اور بنو حارثہ کا گروہ تھا۔ امام مسلم نے ابن عمر کا قول نقل کیا ہے ”ان یہود بنی النضیر حاربوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجلی بنی النضیر والقرقریظہ ومن علیہم حتی حاربت قریظہ فقتل رجالہم وقسم اولادہم ولسانہم بین المسلمین الا بعضهم لحقوا برسول اللہ فانہم واسلموا، واجلی یہود المدینہ کلہم بنی قینقاع وهم قوم عبد اللہ بن سلام ویہود بنی حارثہ، وکل یہودی کان بالمدینہ۔“

بخاری و مسلم میں اس آخری اخراج کا واقعہ بروایت حضرت ابو ہریرہ مروی ہے۔ آپ صحابہ کو ساتھ لے کر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں تشریف لے گئے اور فرمایا ”یا معشر الیہود اسلموا واسلموا“ اسلام قبول کرو نجات پاؤ گے۔ پھر فرمایا۔ ”اعلموا ان الارض لله ورسوله والی ارید ان اجلیکم من هذه الارض، فمن وجد منکم بماله شیئا فلیبعه، والافاعلموا ان الارض لله ورسوله۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تم کو اس ملک سے خارج کر دوں۔ پس اپنا مال و متاع فروخت کرنا چاہو تو کرو ورنہ جان رکھو کہ اس ملک کی حکومت صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے لیے ہے۔“

جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو وہ مقام ایسے رہ گئے تھے جہاں سے یہود و نصاریٰ کا اخراج نہ ہو سکا تھا خیبر اور نجران۔ پس آپ نے وصیت فرمائی کہ آئندہ جزیرہ عرب صرف اسلام کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ جو غیر مسلم اس ملک میں باقی رہ گئے ہیں خارج کر دئے جائیں۔ امام بخاری نے باب باء عا ہے ”اخراج الیہود من جزیرة العرب“۔ اس میں پہلی روایت یہود مدینہ کے اخراج کی لائے ہیں جو ادھر گزر چکی۔ دوسری روایت حضرت ابن عباس کی ہے۔ آنحضرتؐ نے مرض الموت میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ ایک یہ تھی ”اخرجوا المشرکین من جزیرة العرب“۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: اقتصر علی ذکر الیہود لانہم یوحدون اللہ تعالیٰ الا القلیل ومع ذلك امر باخراجہم، لیکون اخراج غیرہم من الکفار بطریق اولیٰ (فتح الباری ۶-۱۹۳) یعنی امام بخاری نے عنوان باب میں صرف یہود کا ذکر کیا۔ اس میں استدلال یہ ہے کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہودی سب سے زیادہ توحید کے قائل ہیں۔ ان کو خارج کیا گیا تو دیگر مذاہب کے اخراج کا جو بے بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا۔ پس حاجت تشریح نہیں۔

حضرت عمر کی روایت میں ”یہود و نصاریٰ“ کا لفظ ہے ”لاخرجن الیہود و النصاریٰ من جزیرة العرب حتی لا ادع الا مسلماً رواہ مسلم واحمد والترمذی وصحیحہ۔ ابو سعید بن جراح سے امام احمد نے روایت کیا ہے: آخر ما تکلم به رسول اللہ صلعم اخرجوا یہود اهل الحجاز و اهل نجران من جزیرة العرب۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں اس کی علت بھی واضح

کردی ہے۔ آخر معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قابل لا یتربک بجزیرة العرب دینان“ رواہ احمد۔ یعنی سب سے آخری وصیت رسول اللہ کی یہ تھی کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں صرف اسلام ہی کے لیے مخصوص ہو جائے۔ امام مالک نے موٹا میں عمر بن عبدالعزیز اور ابن شہاب کے مراسیل نقل کیے ہیں اور محمودی وغیرہم نے باب باندھا ہے۔ ”اخراج اليهود والنصارى من جزيرة العرب“۔ عمر بن عبدالعزیز کی روایت میں ہے وکان من آخر ماتکلم بہ رسول اللہ صلعم، انه قال لقاتل اللہ اليهود والنصارى، اتخذوا قبور البیائهم مساجد۔ لایبقیان دینان بارض العرب۔ اور ابن شہاب کے الفاظ ہیں: لایجتمع دینان فی جزیرة العرب“

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آخر تکلم ”قاتل اللہ اليهود والنصارى جو نقل کیا ہے تو حضرت عائشہؓ سے صحیحین وغیرہمیں بطریق رفع بھی ثابت ہے۔

حافظ نوادی نے گو امام بخاری کا اتباع کیا اور اجلاء الیہود کا باب استدلالاً کافی سمجھا لیکن حافظ منذری نے تلخیص مسلم میں ”اخراج اليهود والنصارى من جزيرة العرب“ کا الگ باب باندھا کہ جزیرہ عرب والی روایتیں روایات اجلاء الیہود سے الگ کر دی ہیں۔ یہ وصیت نبویؐ علاوہ طرق ہالا کے مسند امام احمد، مسند حمیدی، سنن بیہقی وغیرہ میں بھی مختلف طریقوں سے مروی ہے اور سب کا مضمون متحد اور باہم گرا جہاں دینین اور اعتقاد و تقویت کا حکم رکھتا ہے۔

احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم ان احکام کی ہے جن کا تعلق افراد کی اصلاح و تزکیہ سے ہوتا ہے۔ جیسے تمام اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات دوسرے وہ ہیں جن کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے جیسے فتح ممالک اور قوانین سیاسیہ و ملکیہ۔

سنت الہیوں واقع ہوئی ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی زندگی ہی میں تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں اور وہ دنیا نہیں چھوڑتا مگر ان کی تکمیل کا اعلان کر کے۔ لیکن دوسری قسم کے لیے ایسا ہونا ضروری نہیں۔ بہت سے احکام ایسے ہوتے ہیں جن کے نفاذ و وقوع کے لیے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل و عملیہ پاتے ہیں۔ پس ان کی نسبت یا تو بطریق پیشین گوئی کے خبر دے دی جاتی ہے یا اپنے جانشینوں کو وصیت کر دی جاتی ہے۔

یہ معاملہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا۔ پس ضرور تھا کہ اس کا پورا پورا نفاذ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں ہو جاتا۔ آپ ﷺ نے یہود مدینہ کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کر دیا تھا۔ یہود خیبر سے ابتدا ہی میں شرط کر لی تھی کہ جب ضرورت ہوگی، اس سرزمین سے خارج



کر دیے جاؤ گے۔ پھر محجیل کے لیے اپنے جانشینوں کو وصیت فرمادی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں محجیل کا وقت آ گیا اور یہود خیبر نے طرح طرح کی شرارتیں اور نافرمانیاں کر کے خود ہی اس کا موقع پہنچا دیا۔ پس حضرت عمرؓ نے اس وصیت کی تحقیق کی اور جب پوری طرح تصدیق ہو گئی تو تمام صحابہ کو جمع کر کے اعلان کر دیا۔ سب نے اتفاق کیا اور یہود خیبر و نذک سے خارج کر دیے گئے۔ اسی طرح نجران سے بھی عیسائیوں کا اخراج عمل میں آیا۔ امام زہری نے ابن عقبہ سے اور امام مالک نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے۔ ”ما زال عمر حتى وجد الثبت عن رسول الله انه قال لا يجمع مع جزيرة العرب دينان، فقال من كان له من اهل الكتابين عهد فليأت به، انفدله، والافانى اجليكم، فاجلاهم، (اخرجه ابن ابى شيبه)

امام بخاری نے یہود خیبر کے اخراج کا واقعہ کتاب الشروط کے باب ”اذا اشترط لى المزارة اذا شئت اخرجك“ میں درج کیا ہے اور ترجمہ باب میں استدلال ہے کہ یہود خیبر کا تقریر پہلے ہی سے عارضی و مشروط تھا بالاستقلال نہ تھا۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں حضرت عمر کے اجلا کردہ اہل کتاب کی تعداد چالیس ہزار منقول ہے۔

پس صاحب شریعت کے قول و عمل، ان کے آخری لمحات حیات کی وصیت، حضرت عمر کی فصیح تصدیق، تمام صحابہ کے اجماع و اتفاق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام نے ہمیشہ کے لیے جزیرہ عرب کو صرف اسلامی آبادی ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے لہذا یہ کہ کسی مصلحت سے خلیفہ وقت عارضی طور پر کسی گروہ کو داخل ہونے کی اجازت دیدے اور ظاہر ہے کہ جب وہاں غیر مسلموں کا قیام اور دودنیوں کا اجماع شریعت کو منظور نہیں تو غیر مسلم کی حکومت یا حاکمانہ نگرانی و بالادستی کو جائز رکھنا کب مسلمانوں کے لیے جائز ہو سکتا ہے۔



## حواشی

لغو زیادہ مفصل بحث رسالہ ”جامع الشواہد“ میں لکھ چکا ہوں۔ اس رسالہ کا اصل موضوع مسئلہ خلافت ہے۔ یہ نکتہ ضمنتاً آ گیا ہے پس اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

## جزیرہ عرب کی تحدید

باقی رہا یہ مسئلہ کہ جزیرہ عرب سے مقصود کیا ہے؟ تو یہ بالکل صاف و واضح ہے اس کے لیے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔ نص حدیث میں ”جزیرہ عرب“ کا لفظ وارد ہے اور عقلاً و اصولاً معلوم ہے کہ جب تک کوئی سبب قوی موجود نہ ہو، کسی لفظ کے منطوق اور عام و متعارف مدلول سے انحراف جائز نہ ہوگا اور نہ بلا تخصیص کے قیاساً تخصیص جائز۔ شارح نے ”جزیرہ“ کا لفظ کہا اور دنیا میں اس وقت سے لے کر اب تک جزیرہ عرب کا اطلاق ایک خاص ملک پر ہر انسان کر رہا اور جان رہا ہے پس جو مطلب اس کا سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے وہی سمجھا جائے گا۔

تمام مورخین اور جغرافیہ نگاران قدیم و جدید متفق ہیں کہ عرب کو ”جزیرہ“ اس لیے کہا گیا کہ تین طرف سمندر اور ایک جانب دریا کے پانی سے محصور ہے۔ یعنی تین طرف بحر ہند، خلیج فارس، بحر احمر و قلمرو واقع ہیں ایک جانب دریائے دجلہ و فرات۔

سخ الباری وغیرہ میں سے ”قال الخلیل سمیت جزيرة العرب لان بحر فارس وبحر حبشة والفرات والدجله احاطت بها (۱۱۸:۶) اور اصمعی کا قول ہے: لاحاطة البحار بها، یعنی بحر الہند والقلمزم وبحر الفارق وبحر الحبشة ودجله (ایضاً)

نہایہ میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔ سمیت جزيرة لان بحر الفارق وبحر سودان احاطت بجانہا، واحاطت بالجاناب الشمالي دجله والفرات؛

یہی قول ارباب لغت کا بھی ہے۔ قاموس میں ہے۔ جزيرة العرب ما احاط به بحر الہند والشام ثم دجله والفرات۔ پروفیسر پطرس بستانی نے بھی (جوزمانہ حال میں شام کا ایک مشہور مسیحی مصنف گزرا ہے اور جس نے عربی میں انسائیکلو پیڈیا یعنی شروع کی تھی) محیط الجبل میں یہی تعریف کی ہے۔

حاصل سب کا یہی ہے کہ جزیرہ عرب وہ سرزمین ہے جس کے تین جانب سمندر ہیں اور شمالی جانب دریائے دجلہ و فرات

سب سے زیادہ مفصل جغرافیہ یا قوت حموی نے بحکم البلدان میں دیا ہے۔ اس سے زیادہ جامع و مستحکم کتاب عربی میں جغرافیہ و تقویم بلدان کی کوئی نہیں۔

اما سميت بلاد العرب جزيرة لا حاطة الالهةار و البحار و ذلك  
ان الفرات قبل من بلاد الروم، فظهر بناحية قنسرین، ثم انحط  
على اطراف الجزيرة و سواد العراق، حتى وقع بالبحر فى ناحية  
البصرة والابله، واعد الى عبادان، و اخذ البحر فى ذلك  
الموضع مغربان منعطفاً ببلاد العرب“ الخ

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ عرب اس لیے جزیرہ مشہور ہوا کہ سمندروں اور دریاؤں سے گھرا ہوا  
ہے۔ صورت اس کی یوں ہے کہ دریائے فرات بلاد روم سے شروع ہوا اور قنسرین کے نواح میں عرب کی  
سرحد پر ظاہر ہوا پھر عراق میں ہوتا ہوا بصرہ کے پاس سمندر میں جا ملا۔ وہاں سے پھر سمندر نے عرب کو گھیرا  
اور قطیف و بصرہ کے کناروں سے ہوتا ہوا عمان اور بحر سے گزر گیا۔ پھر حضرموت اور عدن ہوتا ہوا چھتیم کی  
جانب یمن کے ساحلوں سے جا لگرایا۔ حتیٰ کہ جدہ نمودار ہوا جو کہ مکہ حجاز کا ساحل ہے۔ پھر ساحل طور اور خلیج  
ایلہ پر جا کر سمندر کی شاخ ختم ہو گئی۔ پھر سرزمین مصر شروع ہوتی ہے اور قلمزم نمودار ہوتا ہے۔ اور اس کا  
سلسلہ بلاد فلسطین سے سواحل عسقلان ہوتا ہوا سرزمین صور و ساحل اردن تک بیدوت پر پہنچتا ہے اور آخر  
میں پھر قنسرین تک ختمی ہو کر وہ جگہ آ جاتی ہے جہاں سے فرات نے عرب کا احاطہ شروع کیا تھا۔ پس اس  
طرح چاروں طرف پانی کا سلسلہ قائم ہے۔ پھر احمر اور قلمزم کی درمیانی خشکی بھی پانی سے خالی نہیں کیونکہ  
سوڈان سے دریائے نیل وہاں آ پہنچتا ہے اور قلمزم میں گرا ہے۔ یہی جزیرہ ہے جس سے عرب کی سرزمین  
مبارت ہے اور یہی عرب اقوام کا مولد و منشاء ہے (انتہا کھوار جلد ۳: ۱۰۰)

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ جزیرہ عرب کے حدود کیا ہیں؟ عرب کا نقشہ اپنے سامنے رکھو  
اور اس پر مندرجہ بالا خطیہ منطبق کر کے دیکھو اور شمال ہے دائیں مشرق بائیں مغرب، شمال میں دریائے  
فرات مغرب سے خم کھاتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ اور صحرائے شام کے کنارے سے گزرتا ہوا دجلہ میں مل جاتا  
ہے۔ پھر دونوں مل کر خلیج فارس میں گرتے ہیں فرات کے پیچھے دجلہ کا خطہ ہے۔ اسی پر بغداد واقع ہے۔ خلیج  
فارس کے مشرق میں ایران ہے اور مغربی ساحل میں قطیف و حساء۔ پھر یہ خلیج تنگ نائے ہرمز سے نکل کر  
مسطح و عمان کے کناروں سے گزرتا ہے اور اس کے بعد ہی بحر عمان نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حضر  
موت کا ساحل دیکھو گے پھر عدن آ گیا اور باب المندب سے جنوبی آگے بڑھے بحر احمر شروع ہو گیا۔  
چونکہ اس کا مغربی ساحل افریقہ و حبش سے متصل ہے، اس لیے قدیم جغرافیہ میں اس کو بحر حبش بھی کہتے  
ہیں۔ بحر احمر کے کنارے پہلے یمن ملے گا پھر جدہ۔ اس کے بعد ساحل حجاز حتیٰ کہ سمندر کی شاخ تلی ہو کر  
طور سینا تک منطقی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی خلیج عقبہ کی شاخ نمودار ہوئی۔ اب مصر کی سرزمین شروع

ہوگئی۔ نبرسویز کے بننے سے پہلے یہ خشکی کا ایک ٹکڑا تھا جس نے بحر احمر کو بحر متوسط سے جدا کر دیا تھا۔ اس لیے صاحبِ معجم نے یہاں دریائے نیل کا ذکر کیا جس کو اسی درمیانی تختہ خشک کے بائیں جانب دیکھ رہے ہو وہ قاہرہ سے ہوتا ہوا اسکندریہ کے پاس سمندر میں گرتا ہے۔ پس اگرچہ اس زمانے میں یہ ٹکڑا خشک تھا مگر سمندر کی جگہ دریائے نیل کا خط آبی موجود تھا۔

اس کے بعد بحر متوسط ہے جس کے ابتدائی حصہ کو قدیم جغرافیہ نویس بحر مصر و شام سے موسوم کرتے تھے۔ اسی پر بیروت واقع ہے۔ اور ساحل سے اندر کی جانب دیکھو گے تو پھر وہی مقام سامنے ہوگا جہاں سے دریائے فرات نمودار ہو کر خلیج فارس کی جانب بڑھا تھا۔

پس یہ ایک مثلث نما ٹکڑا ہے جو اس تمام بحری احاطہ کے اندر واقع ہے۔ صرف خشکی کا ایک حصہ شمال میں فرات کے بائیں جانب نظر آتا ہے یعنی سرحد شام۔ یہی مثلث ٹکڑا جزیرہ عرب ہے۔ قدیم و جدید جغرافیہ نگار، دونوں اس پر متفق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے ”جزیرہ“ اور ”جزیرہ نما“ ہونے میں سب سے زیادہ اہم وجود دریائے جلد و فرات کا ہے۔ کیونکہ اگر یہ عرب کے حدود سے کوئی متصل تعلق نہیں رکھتے تو پھر اس کی ایسی صورت ہی باقی نہیں رہتی جس پر جزیرہ کا اطلاق ہو سکے۔ یعنی شمال کی جانب بالکل خشک رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے عرب کی تعریف کی، احاطہ بحر و نہر کا لفظ کہہ کر واضح کر دیا کہ جانب شمال دجلہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جنہوں نے مقامات کے نام لے کر حدود متعین کئے انہوں نے بھی صاف کہہ دیا کہ شمالی حدود جلد ہے۔ نہا، یہ معجم البلدان اور فتح الباری میں اصمعی کا قول منقول ہے عن القسی عدن ابن الی ریف العراق طولاً ومن جده ساحل البحر الی اطراف الشان عرضاً“ کربانی نے کہا ”ہی ماہین عدن الی ریف العراق طولاً ومن جده الی الشام عرضاً“۔ یہی قاسوس میں ہے۔ ایسا ہی ابن کلیسی سے مروی ہے۔ رفاعہ بک طہمباوی نے قدیم و جدید کتب سے اخذ کر کے عربی میں ”تعريفات النافعة لمزيد الجغرافيه“ لکھی۔ اس میں یہی حدود ہیں۔ پس صاحبِ معجم کی تفصیل اور تمام اقوال سے ثابت ہو گیا کہ عرب طول میں عدن سے لے کر عراق کی ترائی تک اور عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حد شمال میں وہابی جانب دجلہ ہے اور اگر عرض کا خط کھینچیں تو بائیں جانب شام۔ آج کل کے جغرافیوں میں بھی عرب کے یہی حدود بتلائے جاتے ہیں۔

پچھم میں بحر احمر، دکھن میں بحر ہند، پورب میں خلیج فارس اور اتر میں ملک شام۔ اسی معجم البلدان میں عراق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ای الہا اسفل ارض العرب (جلد ۶: ۱۳۳) یعنی عراق اس لیے نام ہوا کہ یہ زمین عرب کا سب سے زیادہ مچلا حصہ ہے۔ اس

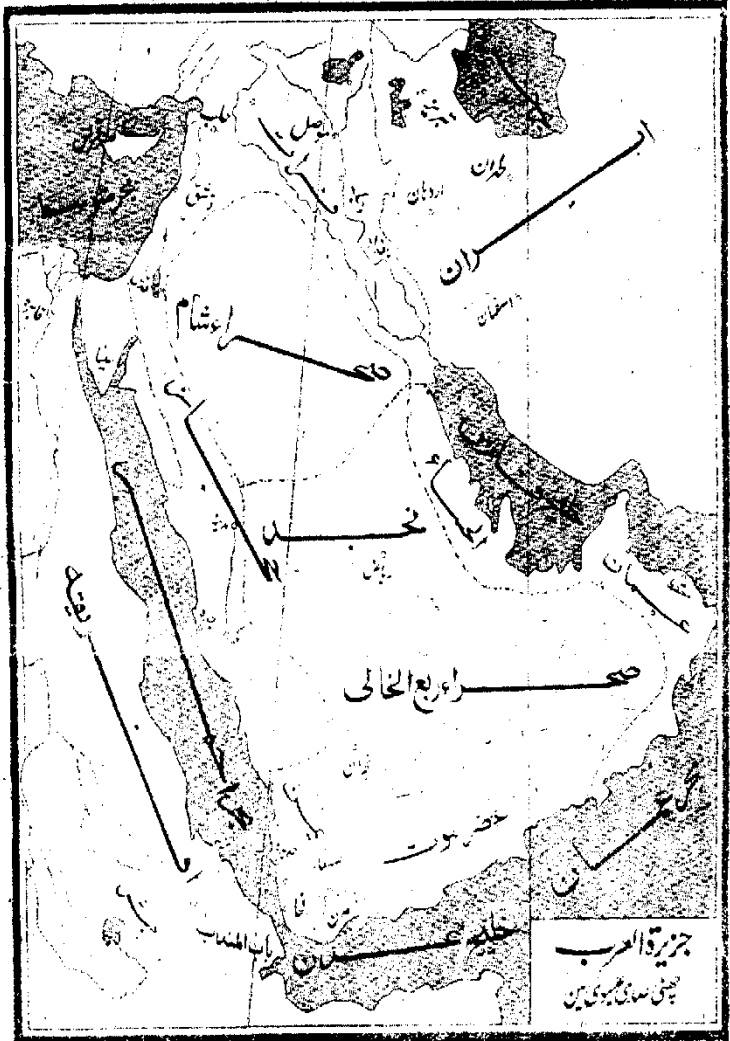
سے بھی ثابت ہوا کہ عراق عرب میں داخل ہے۔ البتہ عراق کا وہ حصہ جو دجلہ کے پار واقع ہے اس میں داخل نہ ہوگا۔

ہم یہاں عرب کا ایک نقشہ تفسیر البیان کے مسودہ سے لے کر درج کرتے ہیں۔ اس نقشہ میں ظہور اسلام کے وقت جزیرہ عرب کی حالت دکھائی ہے۔ یہ نقشہ دراصل یورپ کے بعض مشہور مستشرقین (اور نیچلسٹ) نے قدیم نقشوں اور تعریفات سے مدد لے کر تیار کیا تھا جس کو سنہ ۱۸۵۰ء میں پروفیسر فرڈینیڈ وِسٹن فیلڈ (Ferdinand Westenfeld) نے لندن یونیورسٹی سے شائع کیا۔ جزیرہ عرب کے تمام قدیم نقشوں میں سب سے زیادہ صحیح اور مستند نقشہ یہی ہے۔ نقطوں کے خطوط سے تجارتی جالوں کی وہ سڑکیں دکھائی ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے اندرونی مقامات سے سواحل تک جاتی تھیں۔



( نقشہ )

اخرجوا اليهود و النصارى من جزيرة العرب (الحديث)



## مسجد اقصیٰ و ارض مقدس

مقامات مقدسہ اسلامیہ کے سلسلہ میں بیت المقدس اور اس کی سرزمین کا مسئلہ بھی مسلمانوں کے لیے اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا جس قدر حرم مکہ اور حرم مدینہ کی ہے۔

اسلام نے صرف تین مقامات کے لیے نیت طاعت و ثواب سفر کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان میں جس طرح مکہ و مدینہ کا نام ہے، اسی طرح بیت المقدس کا بھی ذکر ہے۔ بخاری و مسلم کی مشہور روایت میں ہے۔ لا نشد الرحال الا الی ثلاثہ مساجد: المسجد الحرام، و مسجدی ہذا و المسجد الاقصیٰ، یعنی یہ نیت زیارت و طاعت سفر کا قصد و اہتمام کرنا نہیں ہے۔ مگر ان تین جگہوں کے لیے مسجد حرام، مدینہ اور مسجد اقصیٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے شرعاً یہی تین مقام سب سے زیادہ مقدس و محترم ہیں اور انہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی زیارت کے لیے نیت کر کے اپنے وطنوں سے نکلتے ہیں، سفر کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اس کے معاوضہ میں ان کے لیے بڑا ہی اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور ائمہ اسلام نے اتفاق کیا ہے کہ اگر مسجد اقصیٰ کی زیارت کی نذر مانی ہو تو اس کا ادا کرنا اسی طرح واجب ہوگا جس طرح زیارت مسجد نبوی اور حج و عمرہ کا ادا کرنا۔ حالانکہ ان تین جگہوں کے علاوہ اگر کسی دوسری زیارت گاہ کے سفر کے لیے نذر مانی ہو تو اس کا ادا کرنا با اتفاق ائمہ واجب نہ ہوگا۔ اسی بات سے اندازہ کر لیا جاسکتا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین مسلمانوں کے مذہبی احکام و اعتقاد میں کیا اہم و درجہ رکھتی ہے!

یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس کا اللہ نے یہودیوں سے وعدہ کیا تھا اور بالآخر وعدہ پورا ہو کر رہا۔ لیکن وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ اور دنیا کی حکومت و عزت کے ساتھ یہاں کی بادشاہت بھی ان سے چھین لی گئی پھر سبکی دور شروع ہوا۔ اس کے بعد مسلمان وارث ہوئے۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس وراثت کی بشارت دی تھی: "وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ لَارْضَ نَزَلْنَا بِهَا وَابِی الصَّالِحُونَ • اِنْ لِيْ هٰذَا لَكَلٰمًا لِّقَوْمٍ عَلِيْمِيْنَ • وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" (۱۰۵:۲۱-۱۰۷) حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے مروی ہے کہ اس

آیت میں ”الارض سے مقصود بیت المقدس اور فلسطین ہے۔ اس میں خبر دی گئی تھی کہ اب وہاں کی بادشاہت مسلمانوں کے حصہ میں آئے گی۔ اسی لیے کہا ان فی ہذا البلاغا الخ

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اس سرزمین کی خدمت و وراثت کو اللہ کی طرف سے ایک مخصوص عطیہ و امانت سمجھا اور اس کی حفاظت کو حرمین کی طرح ساری دنیا کی حکومت و فرمانروائی سے بھی زیادہ عزیز و محبوب سمجھتے رہے۔ یہی اعتقاد دینی تھا جس نے مسیحی جہاد کی ان آٹھ لڑائیوں کو کامیاب ہونے نہ دیا۔ جن میں تمام یورپ کی طاقت اکٹھی ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ وقت مسلمانوں کی پولیٹیکل طاقت کے عروج کا نہ تھا۔ تنزل و انحطاط کا تھا اور تمام عالم اسلامی مختلف حکومتوں میں متفرق ہو چکا۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہاں کی حکومت خلیفہ اسلام کے ماتحت رہی ہے۔ اور ہمیشہ خود یورپ نے مسیحی دنیا کے امن و سکون کے لیے اسی بات کو بہتر سمجھا ہے۔ پس اگر آج پھر ازمنہ مظلمہ (مڈل ایسجز) کی تاریخ دہرائی جائے گی اور اسلام کی جگہ سے مسیحیت یا یہودیت کے زیر اثر لانے کی کوشش کی جائے گی تو مسلمانان عالم کے لیے ناممکن ہوگا کہ خاموش رہ سکیں۔ ان کا فرض ہوگا کہ جب گزشتہ کروسیڈ کا ایک حصہ دہرایا گیا ہے تو دوسرا حصہ بھی ظہور میں آجائے۔ وہ مسلمانوں کی دینی زیارت گاہ ہے، ان کا مقدس اولین قبلہ ہے۔ اس کی مذہبی وابستگی ان کے ایمان و مذہب کا جزو ہے۔ اگر وہاں یہودیوں کا اقتدار بڑھایا جاتا ہے یا کسی مسیحی حکومت کو نگرانی و بالادستی کے نام سے قائم کیا جاتا ہے تو یہ صرف مسلمانوں کی آبادیوں ہی کو نہیں بلکہ ان کی شریعت کو چیلنج دینا ہے اور مسلمانوں کو مجبور کر دینا ہے کہ یا تو اسلام کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کر لیں یا اس کی اطاعت و حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔



KITABOSUNNAT.COM



## خاتمہ سخن

### نتائج بحث

گزشتہ مباحث و تفصیلات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے۔ "خلیفہ" سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان بادشاہ اور صاحب حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجراء و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں کے مقابلے کے لیے پوری طرح طاقتور ہو۔

(۲) اس کی اطاعت و اعانت ہر مسلمان پر فرض ہے اور مثل اطاعت خدا و رسول ﷺ کے لیے ہے تا وقتیکہ اس سے کفر یا باغ (مرتد) ظاہر نہ ہو۔ جو مسلمان اس کی اطاعت سے باہر ہوا، وہ اسلامی جماعت سے باہر ہو گیا۔ جس مسلمان نے اس کے مقابلے میں لڑائی کی یا لڑنے والوں کی مدد کی اس نے اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ وہ اسلام سے باہر ہو گیا اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلم سمجھتا ہو۔

(۳) ایک خلیفہ کی حکومت اگر جم جمی ہے اور پھر کوئی مسلمان اس کی اطاعت سے باہر ہو اور اپنی حکومت کا دعوے کیا تو وہ باغی ہے اس کو قتل کر دینا چاہیے۔

(۴) صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطین عثمانیہ کو حاصل ہے اور اس وقت آزدوئے شرع تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور اسلام کی جگہ جاہلیت منول لی۔ جس نے ان کے مقابلے میں لڑائی کی یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔

(۵) صرف خلیفہ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں لڑائی ہو تو کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز نہیں کہ غیر مسلمان فوج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے یا ان کی مدد کرے۔ اگر کرے گا تو یہ حکم "من حمل علینا السلاح فلیس منا" اور نص

قرآنی ”مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِدًا فَقَدْ آوَاهُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا“ (۴:۹۳) وہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جائے گا۔ اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

(۶) جب کسی اسلامی حکومت یا جماعت پر غیر مسلم حملہ کریں یا حملہ کا قصد کریں یا ان کی آزادی و خود مختاری کو کسی دوسری طرح نقصان پہنچانا چاہیں تو ہر ملک کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے ان کی مدد کرنا اور حملہ کرنے والوں سے لڑنا، فرض ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ حملہ آور زیادہ طاقتور ہوں اور ان کے مقابلہ کی کافی طاقت ان مسلمانوں اور وہاں کی اسلامی حکومت میں نہ ہو اس صورت میں جہاد کی فرضیت علی الکفایہ نہ ہوگی بلکہ مثل نماز روزہ کے فرض عین ہوگی۔

(۷) اگر خلیفہ اسلام کو دشمنوں کا کوئی ایسا طاقتور گروہ گھیر لے کہ ان کا مقابلہ کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو اور بلا تمام مسلمانان عالم کی فوری مدد و نصرت کے اسلامی ممالک کی حفاظت نہ ہو سکے تو اس صورت میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا یہ ایک وقت فرض ہوگا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اس کی مدد کریں اور اس کے دشمنوں پر حملہ آور ہوں۔

(۸) اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرہ عرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد بھی داخل ہے۔ پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے یا اس کو خلیفہ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے ہی کا مسئلہ نہ ہوگا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی اسلام کی مرکزی سر زمین پر کفر کا اثر چھا رہا ہے۔ پس اس حالت میں تمام مسلمانان عالم کا اولین فرض ہوگا کہ اس قبضہ کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے لیے وقف کریں۔

(۹) اسلام کے مقابلات مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریفین۔ اس کے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جالوں کی قربانیاں اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ میں جانے نہ دیں۔ علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہوگا بلکہ ایک وقت وہ یہ ایک دفعہ تمام مسلمان عالم کا۔

(۱۰) اس صورت میں جو فرض شرعی مسلمانوں پر عائد ہوگا اس میں پہلی چیز ”ترک“ ہے۔ دوسری ”اختیار“۔ ”ترک“ سے مقصود یہ ہے کہ تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا پڑیں گے جن میں برائش گورنمنٹ کی اعانت و موالات ہو۔ ”اختیار“ سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام وسائل اختیار کرنے پڑیں گے جن کے ذریعے فریضہ دفاع انجام پاسکے۔

و تلک عشرة کاملہ



## خلیفۃ المسلمین اور گورنمنٹ برطانیہ

جبکہ اسلام کے اہل اور اپنے پیروں کے لیے دائمی احکام کا یہ حال ہے تو یکا یک ۴ اگست ۱۹۱۳ء کو عالمگیر جنگ عالم کا شرارہ وسطیورپ میں چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی تمدن کا تمام آتھکیر مادہ جنگ بھڑک اٹھا اور اللہ الموقدہ النی تطلع علی الافئدہ“ (۶:۱۰۳-۷)۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جنگ نے مسلمانان ہند کے لیے ایک ایسی نازک صورت اختیار کر لی جو برطانیہ کی حکومت ہند کی پوری تاریخ میں آج تک کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ یعنی خلیفۃ المسلمین کی فوجیں بھی میدان جنگ میں مشغول پیکار نظر آئیں اور ترکی کے برخلاف برطانیہ نے اعلان جنگ کر دیا۔

اس اعلان جنگ کی اطلاع جب سرکاری طور پر ہندوستان میں شہر کی گئی تو ساتھ ہی حسب ذیل امور کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔

(۱) ترکی حکومت کے ساتھ ہماری جنگ وقامی ہے نہ کہ حملہ آورانہ۔ ہم نے دو ماہ تک ہر طرح کا مخالفا نہ اور جنگ جو یا نہ سلوک برداشت کیا اور پوری کوشش کی کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے۔ لیکن ترکی گورنمنٹ نے برابر اپنے حملے جاری رکھے۔ اب مجبوراً ہم کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا ہے۔

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو ان کے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے۔ اسلام کے تمام مقدس مقامات محفوظ رہیں گے جن میں عراق بھی داخل ہے۔ ان کے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ اسلام کے مقدس مقام خلافت کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ آئے گی۔ ہماری جنگ موجودہ ترکی وزارت سے ہے جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔ خلیفۃ المسلمین سے اور اسلام سے نہیں ہے۔ گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ اپنے تمام ظلیموں کی جانب سے ان باتوں کی ذمہ داری لیتی ہے۔

یہ خلاصہ اس سرکاری اعلان کا ہے جو پہلی نومبر ۱۹۱۳ء کو اعلان جنگ کی اطلاع کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف اٹھیا نے شائع کیا تھا اور پھر تمام صوبوں میں سرکاری طور پر اس کی اشاعت کی گئی تھی۔ حتیٰ کہ ہر کشتری، ہر ضلع، ہر صدر مقام، ہر شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے مقامی حکام نے اس کی نقلیں ہانپی تھیں اور ذہانی بھی پڑھ کر سنا لیا تھا۔ برٹش اٹھیا کا کوئی مسلمان گھرایا نہیں ملے گا جو اس اعلان سے بے خبر چھوڑ

دیا گیا ہو۔ بعد کو "نیر ایسٹ" وغیرہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ مصر سوڈان میں بھی مجسمہ کی اعلان شائع کیا گیا تھا۔

اس اعلان کے بعد بھی ہمیشہ ذمہ دار حکام ہندو انگلستان کی زبان سے یہ دونوں باتیں بار بار ظاہر ہوتی رہیں۔ اگر کسی اظہار و بیان کی مضبوطی میں اعلان کی تکرار و اشاعت کی کثرت و وسعت کو دخل ہے تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ جس قدر کثرت و تکرار کے ساتھ یہ اعلان شائع کیا گیا شاید ہی کوئی انسانی وعدہ اس قدر دہرایا گیا ہو۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس وقت میدان جنگ کا کیا حال تھا؟ برٹش گورنمنٹ کو اپنی زندگی کے لیے لاکھوں سپاہیوں اور توپوں کی جس قدر ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ اس اعلان اور اس کی کامیابی کی ضرورت تھی۔ اگر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں ذرا بھی بے چینی پیدا ہو جاتی تو نہیں معلوم جنگ کی تاریخ کیسا پلٹا کھاتی اور آج نتائج کا کیا حال ہوتا۔

اس اعلان کا نتیجہ وہی نکلا جو مطلوب تھا۔ یعنی مسلمانان ہند پر صورت حال مشتبه ہو گئی۔ نادان و حیلہ جو علماء اس خیال میں پڑ گئے کہ جب ترکوں نے انگلستان و دہلی متحدہ پر حملہ کیا ہے تو شرعاً صورت دفاع کی نہیں ہے بلکہ حملہ و هجوم کی ہے۔ اس لیے اس میں شرکت فرض کفایہ کا حکم رکھتی ہے نہ کہ فرض عین کا۔ پس شرعاً ضروری نہیں کہ مسلمان ہند بھی اس میں حصہ لیں۔ عام مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ برٹش گورنمنٹ صرف اپنا بچاؤ کر رہی ہے۔ اس کا مقصود اسلامی ممالک پر قبضہ و تصرف کرنا یا خلیفہ اسلام کی حکومت کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ نیز اسلام کے مقدس مقامات یعنی جزیرہ عرب اور بیت المقدس وغیرہ ہر حال میں محفوظ رہیں گے۔ ان تمام باتوں کا نہ صرف انگلستان کی جانب سے وعدہ کیا جاتا ہے بلکہ تمام حلیف حکومتوں کی جانب سے بھی۔

نہایت انوس اور روسیائی کے ساتھ اقرار کرتا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا نہ یہ مذہبی فیصلہ صحیح تھا نہ وعدوں اور اعلان پر اعتماد۔ انہوں نے اپنی تیرہ سو سالہ تاریخ حیات میں شاید ہی کوئی ایسی قوی و مذہبی غلطی کی ہوگی جیسی اس موقع پر کی اور جس کے نتائج کی پہلی قسط آج ان کے سامنے ہے وَمَا نَفْخُفْهِیْ صُدُورُہُمْ اَنْکَبُزٌ" (۱۱۸:۳) لَمَّا كَانَ اللّٰهُ لِيَبْطِلَہُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَہُمْ يَظْلِمُوْنَ" (۷۰:۹)

تھوڑی دیر کے لیے اس سے قطع نظر کر لو کہ احکام شرع کی بنا پر یہ رائے کہاں تک صحیح تھی صرف اس پہلو سے دیکھو کہ جن وعدوں پر بھروسہ کیا گیا ان کا حال کیا تھا؟ پرانے وقتوں کی طرح موجودہ زمانے کی سوسائٹی بھی اشخاص کے لیے ضروری سمجھتی ہے کہ

ایفائے عہد میں اپنے تئیں شریف ثابت کریں لیکن بیسویں صدی کی تہذیب میں حکومتوں کے لیے شریف ہونا چنداں ضروری بات نہیں ہے۔ اگر طاقت موجود ہے تو پھر اخلاقی صداقت کے مطالبہ کا وہم و گمان بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جب وعدوں کا ایفا اور عہد و پیمان کی پابندی کمزور حکومتوں کے ساتھ ضروری نہیں سمجھی جاتی، تو پھر محکوم و بے سروسامان رعایا کے ساتھ کیوں ضروری سمجھی جائے جو اپنی وفاداری میں کتے کی طرح قابل تعریف مگر بے زبانی میں اسی کی طرح بے بس بھی ہے۔

انگلستان کی حکومت نے نیپولین کے عہد سے لے کر آج تک اپنے وعدوں کو جس طرح پورا کیا ہے، ان کی عبرت انگیز سرگزشت صفحات تاریخ پر ثبت ہے۔

برطانوی وعدوں کے اعتماد اور ان کے ایفا کی اخلاقی نمائش کا یہ پہلا ہی موقع نہیں ہے۔ ۱۵ جولائی ۱۸۱۵ء کو جب نیپولین نے براقان نامی انگریزی جہاز پر قدم رکھا تھا تو اس نے بھی انگلستان کے وعدوں پر اعتماد ہی کیا تھا۔ کچھ بے اعتمادی نہ کی تھی لیکن خود اسی کے لفظوں میں انگلستان نے ہاتھ بڑھا کر اپنا مہمان بنانے کے لیے بلایا اور جب وہ آ گیا تو اس کا خاتمہ کر دیا۔

سینٹ ہلینا کی سنگلاخ چٹانیں آج تک سمندر کے طوفان کے اندر انگریزی موعہد کی اخلاقی قدر و قیمت کا اعلان کر رہی ہیں!

۳۔ اگست ۱۸۱۵ء کو جنگ وائرلوی کے بعد جب شہر پیرس متحدہ افواج کے حوالے کیا گیا اور اس عہد نامہ کو فرانسیسیوں نے عہد نامہ سمجھا۔ جس پر انگلستان کے نامور ہیرو ڈیوک آف ویلنگٹن کے دستخط تھے تو یقیناً انہوں نے بھی انگلستان پر اعتماد ہی کیا تھا۔ لیکن قبضہ کے بعد جب یہ نتیجہ نکلا کہ اس پر تاریخ کا اہل فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور خود انگریز مورخوں کی زبانی اس کا افسانہ خوینیں سن لیا جاسکتا ہے۔

خود ہندوستان کے گزشتہ سو سال کی تاریخ ہی اس کے لیے کافی ہے، دوسرے ملکوں کی سرگزشتوں کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت کیا ہے!

شمشاد خانہ پروردماز کے کتومت

تاہم بد بخت مسلمانوں نے بھروسہ کیا اور جنگ کے نتائج کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ ان کا روپیہ ان کی جائیں، ان کے ملک کی تمام قومیں بے دریغ خرچ کی گئیں۔ دنیا کی آخری اسلامی حکومت و خلافت کے مٹانے میں ان کی ہر چیز نے پورا پورا کام دیا۔ یہاں تک کہ برٹش گورنمنٹ اپنی تاریخ حیات کے سب سے بڑے مہلک وقت سے بچ گئی اور وہ فتح مندی مکمل ہو گئی جس کا پہلا نتیجہ اسلامی خلافت کی بربادی و جہاں ہے۔

انشاء جنگ ہی میں اس اعتماد کے تمام نتائج ظاہر ہو گئے تھے۔ بغداد پر انگریزی فوج قابض

ہو گئی تھی جو جریرہ عرب کی مقدس سرزمین میں داخل ہے۔ عین حدود حرم مکہ کے اندر سازشیں کر کے بغاوت کرائی گئی اور اس کی وجہ سے جس قدر توہین اس مقدس مقام کی ہوئی تھی وہ ہو کر رہی۔ پھر بھی مسلمانان ہند اپنے اہتمام سے دستبرداری ہوئے اور اس انتظار میں رہے کہ جنگ کی عارضی حالتیں ہیں۔ صلح کے بعد برطانوی اعلان و مواعید کی مقدس صداقت تمام عالم پر آشکارا ہو جائے گی۔



KITABOSUNNAT.COM

## موجودہ و آئندہ حالت اور احکام شرعیہ

بحث کے اس نکلنے کو ہم واپس نہ دیکھ کر دیتے ہیں کہ جنگ کے بعد ان وعدوں اور اعلانات کا کیا نتیجہ نکلا؟ نہ ہم ان ہم اعلانات کا یہاں ذکر کریں گے جن کا سلسلہ برابر اٹھائے جنگ میں بھی جاری رہا۔ مثلاً وزیراعظم کی تقریر ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کیونکہ یہ تمام باتیں دنیا کے سامنے ہیں اور سورج کی روشنی جن چیزوں کو دکھلا دے ان کے لیے بحث و نظر کی روشنی سے مدد لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ہم کو یہاں صرف ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ نہ اب کوئی بات ہمارے لیے سوچنے سمجھنے کی باقی رہی ہے نہ گورنمنٹ کے لیے۔

دو طرفہ موجودہ و آئندہ حالت کا سوال ہے۔

احکام شرعیہ اور پرگزر رکھے ہیں۔ پس اگر موجودہ حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور صلح کے نام سے اسلامی خلافت کے خلاف وہی حملہ آورانہ جنگ عمل میں لائی گئی جس کا اظہار ہو رہا ہے تو نتائج حسب ذیل ہوں گے:

(۱) جس وقت خلیفہ المسلمین نے جنگ میں شرکت کی ہے تو پرنس گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ حملہ ان کی جانب سے ہے، انگلستان و خلفاء کی جانب سے نہیں ہے۔ لیکن اب موجودہ حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ یعنی خلیفہ المسلمین کسی غیر مسلم ملک و حکومت پر حملہ آور نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم حکومتیں مسلمان آبادیوں اور خلیفہ اسلام کی حکومت پر قابض ہو رہی ہیں اور خلیفہ المسلمین پر حملہ آور ہیں پس اگر اس حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور عارضی صلح کے بعد بھی یہی حال رہا تو مسلمانوں کے لیے قطعاً صورت دفاع اور تغیر عام کی پیدا ہو جائے گی جب جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ حملہ و هجوم کی صورت نہ ہوگی کہ فرض علی الکفایہ ہو۔ لہذا ہندوستان کے ہر مسلمان کا یہ شرعی فرض ہوگا کہ خلیفہ المسلمین اور ان تمام اسلامی آبادیوں کی اعانت کے لیے اٹھ کھڑا ہو، جہاں سے اسلامی حکومت مٹائی جا رہی ہے۔

(۲) یہ حقیقت پہلے سے آشکارا تھی مگر چار سال کی جنگ اور اس کے نتائج نے آخری درجہ یقین تک ظاہر کر دی کہ نہ تو خلیفہ المسلمین کی موجودہ طاقت غیر مسلم خلیفوں کے مقابلے کے لیے کافی ہے، نہ موجودہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی۔ یعنی وہ ٹکست کھا چکے ہیں اور بعض مقامات کے مسلمانوں کی

درماندگی و تباہی غایت درجہ ہلاکت تک پہنچ چکی ہے۔ جیسے ولایت سرنا وغیرہ کے مسلمان۔ پس اس بنا پر بھی مسلمانان ہند کا فرض شرعی ہوگا کہ ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ اگر ایک مقام کے مسلمان دشمن کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو دیگر ممالک کے مسلمانوں پر دفاع میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے۔

(۳) جن بلاد اسلامیہ پر غیر مسلم دخل و تصرف کرنا چاہتے ہیں یا کر چکے ہیں مثلاً ایڈریا نوبیل تھریس ایشیائے کوچک، سرنا، عراق، فلسطین، ان کے قرب و جوار میں مسلمانوں کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں جو دشمنوں کے دفاع میں مددگار ہو سکے اور اس کی اعانت کی وجہ سے مسلمانان ہند بری الذمہ ہو جائیں۔ پس اس بنا پر بھی ساری شرعی ذمہ داری مسلمانان ہند ہی کے ذمہ عائد ہوتی ہے۔ جن کی تعداد دنیا کی تمام اسلامی آبادیوں سے زیادہ ہے اور جو بہت سی باتوں میں دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بہتر حالت رکھتے ہیں۔

(۴) عراق کا تمام خطہ دریائے دجلہ تک جزیرہ عرب میں داخل ہے پس اگر انگریزی قبضہ وہاں قائم رہا یا کسی طرح کا بھی انگریزی اقتدار حکم برداری اور نگرانی کے نام سے حاصل کیا گیا تو یہ صریح جزیرہ عرب پر غیر مسلم اقتدار ہوگا اور از روئے شرع مسلمانان ہند کا فرض ہوگا کہ اس اقتدار کے دور کرنے کے لیے حریف کا مقابلہ کریں۔

(۵) بیت المقدس اسلام کے مقامات مقدسہ میں داخل ہے۔ اگر اس پر غیر مسلم اقتدار قائم رکھا جائے گا تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کا بھی فرض ہوگا کہ دفاع کے لیے مستعد ہو جائیں۔

(۶) غرضیکہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وفادار برٹش شہری کی زندگی بسر کرنا شرعاً جائز ہو جائے گا اور یہ فرائض کی سب سے بڑی کشمکش ہوگی۔ جس میں کوئی انسانی جماعت جتلا ہو سکتی ہے یعنی بہ مجرد ان حالات کے برٹش گورنمنٹ کی حیثیت آزر وئے شرع یہ ہو جائے گی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی حملہ آور دشمن ہے اور اس لیے اس سلوک کی مستحق ہے جو از روئے شرع مسلمانوں کو حملہ آور حریف کے ساتھ کرنا چاہیے۔ جب ایسا ہوا تو مسلمان مجبور ہوں گے کہ دور ہوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔ یا برٹش گورنمنٹ کا ساتھ دیں یا اسلام کا۔ یہ ناممکن ہوگا کہ دونوں تعلق ایک وقت میں جمع کیے جاسکیں۔

کیا چھ کروڑ سے زائد انسانوں کو اس کشمکش میں جتلا کر دینا کوئی عاقبت اندیشانہ عمل ہو سکتا ہے! فرصت کی آخری گھڑیاں گزر رہی ہیں۔ اگر عارضی محمدی کا گھمنڈ مہلت دے تو گورنمنٹ اس سوال پر غور کر لے۔



اگر انگلستان کے وزراء (پارلیمنٹ کے افسروں میں) وعدہ اس لیے نہیں کیا کرتے کہ وفا کیا جائے تو کم از کم اس ایک وعدہ کو تو اس اخلاقی کلیہ سے مستثنیٰ کر دینا چاہیے جس کو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کا بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے یعنی کامل مذہبی آزادی کا وعدہ۔ اسی وعدہ کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں ہر قوم کی طرح مسلمان بھی روزمرہ اپنے مذہبی فرائض انجام دے رہے ہیں، ان کی مسجدیں قائم ہیں۔ پانچ وقت اذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ کوئی حاکم مسلمانوں سے یہ نہیں کہتا کہ نماز نہ پڑھو۔

لیکن اگر برٹش گورنمنٹ بلاو اسلام کے خلاف اپنے موجودہ طرز عمل پر قائم رہی، اس کے جہاز اسلامی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لیے سمندروں میں دوڑتے رہے، اس کی فوجیں عراق کی سرزمین پر قابض رہیں جو مقدس جزیرہ عرب میں داخل ہے اور ساتھ ہی وہ اس کی بھی متوقع رہی کہ ہندوستان کے بد بخت مسلمان اس کے قیادار بنے رہیں تو اس کے متنی یہ ہوں گے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے مذہب کے چھوٹے چھوٹے حکموں میں تو آزادی دینے کے لیے تیار ہے۔ لیکن جو احکام اسلام کے بنیادی عقائد ہیں اور ان بڑے حکموں میں داخل ہیں۔ جن کے ترک کر دینے سے مسلمان مسلمان نہیں رہتا۔ ان کے لیے چاہتی ہے کہ حق و آزادی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں اور برطانیہ کی وفاداری کی خاطر اپنے اسلام سے باغی ہو جائیں۔

وہ مسلمانوں کو آزادی دیتی ہے کہ نماز پڑھیں جو مذہبی احکام میں شاخ کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسلامی خلافت و امامت پر حملہ آور بھی ہے جو شاخ نہیں بلکہ بنیاد اور جڑ کے حکم میں داخل ہے۔ وہ نماز پڑھنے میں مداخلت نہیں کرے گی جس کے نہ پڑھنے سے مسلمان گناہ گار ہو جاتا ہے۔ لیکن خلیفہ المسلمین کو ان کی حکومت و مملکت سے محروم کر دے گی جن کی مدد نہ کرنے سے مسلمان گناہ گار ہی نہیں بلکہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جاتا ہے!

وہ مسلمانوں کو حج کے سفر سے نہیں روکتی کیونکہ یہ ان کا مذہبی عمل ہے لیکن وہ خلیفہ المسلمین کو اپنی فوجی طاقت سے محصور کر کے مجبور کرے گی کہ اسلامی مملکتوں کو غیر مسلموں کے حوالے کر دیں۔ اس وقت مسلمان دفاع کے لیے انھیں گے تو کہے گی کہ بغاوت ہے۔ پھر کیا دفاع مسلمانوں کا مذہبی عمل نہ ہوگا اور کیا مذہبی عمل؟ ایسا عمل کہ شرعاً ہزاروں حج سے بڑھ کر حج اس کے لیے چھوڑ دیا جاسکتا ہے لیکن حج کی خاطر وہ نہیں چھوڑا جاسکتا۔

مسلمان ہندوستان کی مسجدوں اور ان کے اندر کی نمازوں کو لے کر کیا کریں گے جن کی اجازت دے دینے پر برٹش گورنمنٹ کی آزادی کو ناز ہے جبکہ شریعت کے وہ احکام ان کے سامنے آجائیں گے جن کی تعمیل ہزار نمازوں سے بھی بڑھ کر اور ہزار روزوں سے بھی اشد و اہم ہے اور جن کی نافرمانی کے بعد نہ تو ان کی نمازیں ہی ان کے لیے سود مند رہیں گے نہ ان کے روزے ہی ان کو نجات دلا سکیں گے!

## باب

## ترک و اختیار (ترک موالات)

اس صورت میں مسلمانوں پر ترک و اختیار دونوں طرح کے احکام شرعاً عائد ہوں گے۔  
”ترک“ سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اس وقت کر رہے ہیں ترک کر دینی پڑیں گی۔

”اختیار“ سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اس وقت نہیں کر رہے کرنی پڑیں گی۔  
اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز وہ ہے جس کو شریعت نے ”ترک موالات“ سے تعبیر کیا ہے۔  
یعنی جو غیر مسلم مسلمانوں کے حریف و دشمن اور حملہ آور فریق کا حکم رکھتے ہوں ان سے تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا جو محبت، خدمت اور اعانت پر مبنی ہوں۔ اگر کوئی مسلمان ایسا تعلق رکھے گا تو اس کا شمار بھی شریعت کے نزدیک انہی غیر مسلموں میں ہوگا مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کر دی ہے۔ تمام غیر مسلم اقوام و افراد کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں، نہ ان پر حملہ آور ہیں، نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں۔ یعنی لڑتے ہیں، حملہ آور ہیں، اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں یا کر چکے ہیں۔

اسلام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کو نیکی، محبت اور ہر طرح کے احسان و خیر خواہی کا سلوک کرنا چاہیے، اسلام اس سے ہرگز مانع نہیں۔ حالیکہ محبت اس کی دعوت حق کا اصل الاصول ہے۔ البتہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ وہ اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان رکھیں۔ اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کی شریعت کے دشمنوں میں ہوگا۔ ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے شریعت درگزر کر سکتی ہے۔ لیکن اگر دوسری قسم کے غیر مسلموں سے محبت کرتا ہے۔ یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے تو یہ گناہ نہیں ہے نفاق ہے اور منافق مومن نہیں ہے۔

قرآن نے یہ تقسیم سورہ محمّد میں کر دی ہے۔ لَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الْاٰلِيٰنَ لَمۡ يَقَابِلُوْكُمْ

فِي الَّذِينَ وَلَّمْ يَخْرِجُوَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَ تُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ  
الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُواكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَ  
ظَاهَرُوا بِعَدَاوَتِكُمْ أَنْ تَوَلَّوهُمْ ۗ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (٨: ٦٠-٩)

اور اسی سورہ کے اوائل میں فرمایا، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ  
أَوْلِيَاءَ تَلْفُظُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ (١: ٦٠) مسلمانو! جو غیر مسلم  
تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمن ہیں ان کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اور سورہ مائدہ میں ہے: لَا تَتَّخِذُوا  
الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۗ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (٥١: ٥)  
ان یہود و نصاریٰ کو جو مسلمانوں کی دشمنی اور نقصان رسانی میں سرگرم ہوں، اپنا دوست نہ بناؤ اور جو مسلمان  
انہیں دوست بنائے گا خدا کے حضور اس کا شمار بھی انہی میں ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ واضح فرمایا: لَا يَتَّخِذِ  
الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (٢٨: ٣) اور لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ  
دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (١٣٣: ٣) یعنی جبکہ غیر مسلموں اور مسلمانوں میں باہم جگہ ہو تو مسلمانوں کو نہیں  
چاہیے کہ اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر ان کے دشمنوں کو اپنا دوست بنائیں۔ من دون المومنین جہاں جہاں  
آیا ہے اس نے واضح کر دیا ہے کہ مقصود ہر قسم کے غیر مسلموں سے ترک موالات نہیں ہے بلکہ ایک خاص  
قسم کے محارب غیر مسلموں سے اور ایک خاص حالت جگہ میں اسی طرح سورہ عمران میں ہے: لَا  
تَتَّخِذُوا بِطَانَةَ مَنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُو نَكُمْ حِيَالًا ۗ وَذُوَا مَا عَيْنْتُمْ ۗ قَدْ نَدَّتِ الْبَطْنَاءُ مِنْ  
أَوْلِيَائِهِمْ ۗ وَمَا تَخِطِي صُدُورُهُمْ الْحَكِيمُ (١١٨: ٣)

یہاں ضمنی بات بھی واضح ہوگئی کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کو شرعاً کیسا  
تعلق رکھنا چاہیے؟ سو معلوم ہو گیا کہ قرآن کی اس تقسیم کی بموجب وہ دوسری قسم میں داخل ہیں۔ پس ان  
کے ساتھ برو احسان اور نیکی و ہمدردی کرنے سے شریعت ہرگز ہرگز نہیں روکتی۔ آج تک انہوں نے نہ کبھی  
اسلامی ممالک پر حملہ کیا، نہ مسلمانوں سے قتال فی الدین کیا، نہ کسی اسلامی ملک سے مسلمانوں کے اخراج  
کا باعث ہوئے۔



## واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ

سورہ ممتحنہ کے شان نزول کا واقعہ اس بارے میں مسلمانوں کے لیے بڑا ہی عبرت انگیز ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت طلحہ سے مروی ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین صحابہ اور مشرکائے بدر میں سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کا قصد کیا تو انہوں نے اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے ایک محل لکھ کر مکہ میں اطلاع دے دی جاتی تھی۔ وحی الہی سے آنحضرت اس پر مطلع ہو گئے اور راستے ہی میں سے محل پکڑوا منگوا لیا۔ جب حاطب سے پوچھا گیا تو انہوں نے معذرت کی "ما فعلت هذا كفرا ولا ارتدادا" میں نے کفر اور ارتداد اور اسلام کی مخالفت کے خیال سے ایسا نہیں کیا۔ صرف اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے محل بھیج دیا تھا، میری نیت بری نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ انہیں قتل کر دیں اور کہا "انہ منافق قد خان الله ورسوله" یہ منافق ہے، اس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ہے۔ اس پر سورہ ممتحنہ کا نزول ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَعْبُدُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْفُونَ إِلَيْهِمْ  
بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ. (۱:۶۰)

مسلمانو! خدا کے اور خود اپنے دشمنوں کو ایسا دوست نہ بناؤ کہ محبت الفت کے ان سے تعلقات رکھو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام سے انکار کر چکے ہیں اور اللہ اور اس کے دین برحق کے دشمن ہیں۔

اس واقعہ میں ہمارے لیے بڑی ہی عبرت ہے۔ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین و بدرین میں سے تھے۔ انہوں نے صرف اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے محل لکھا تھا۔ دشمنان اسلام کی مدد کرنا مقصود نہ تھا۔ اس پر بھی اللہ کی جانب سے یہ عتاب نازل ہوا اور حضرت عمرؓ قتل کر دینے کے لیے اٹھے کہ یہ منافق ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ جب باوجود علاقہ قربت، مخالف و محارب فریق کے ساتھ اتنا تعلق بھی گوارا نہیں کیا گیا تو پھر ان مسلمانوں کا شرعاً کیا حکم ہونا چاہیے جو برٹش گورنمنٹ کے محارب فریق ہونے پر بھی ہر طرح کی محبت و ممولات اور اعانت و مشارکت کے تعلقات اس کے ساتھ رکھتے ہیں اور جن کا اب تک یہ حال ہے کہ اس کے درباروں کے دیئے ہوئے بے سود خطابوں کو بھی ترک کر دینا ان کے

نفس حق فراموش پر گراں گزر رہا ہے۔

علی الخصوص ان مدعیان علم و تقدس کا حال قابلِ تماشایہ جن کو ان کی بارگاہوں سے محسوس العلماء کے خطابات ملے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں اسلام کی دینی ریاست کا اولین حق دار اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائی کا سب سے زیادہ مستحق ظاہر کرتے ہیں۔ یا سبحان اللہ! مسلمانوں پر ان کی قومی بدبختی کا اس سے بڑھ کر اور کون سا وقت آسکتا ہے! جن لوگوں کو اسلام اور اس کی کتاب قطعاً منافق قرار دے رہی ہو اور جو اللہ کے نزدیک اس کے بھی حقدار نہ ہوں کہ مسلمانوں کی صف میں جگہ پائیں ان کو مسلمانوں کی ریاست و پیشوائی کا دعویٰ ہو، وہ مسلمانوں کی بڑی بڑی درسگاہوں کے مالک ہوں، جہاں صبح و شام قال اللہ اور قال الرسول کا چرچا رہتا ہے اور پھر اس سے بھی عجیب تو یہ کہ بہت سے مسلمان ہوں گے جو ان کی پیشوائی کو جان و دل سے مان رہے ہوں اور ان کے آگے عقیدت و ارادت کا سر جھکا کر اللہ اور اس کے رسول سے گردن موڑ رہے ہوں۔

مدار روزگار سفلہ پر درر اتماشا کن!

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الْكُفْرَانَ أَوْلِيَاءُ مِنْ ذُنُوبِ الْمُؤْمِنِينَ أَتَيْتُمُوهُمْ  
عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا (۱۳۹:۴)

جو مسلمان، مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کے مخالف غیر مسلموں کو اپنا دوست بنا رہے ہیں تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بارگاہوں سے عزت حاصل کریں؟ اگر عزت ہی کی طلب ہے تو یاد رکھیں کہ اصلی عزت دینے والے وہ نہیں ہیں عزت اللہ کے لیے ہے اور ایک مسلمان کو مل سکتی ہے تو اسی کی چوٹ سے۔

سورہ نساء میں یہ تمام خصالتیں منافقوں کی قرار دی ہیں جن میں آج ہمارے بڑے بڑے مدعیان علم و محنت جتلا ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں اسلام و کفر دونوں سے ساز باز رکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی رہیں اور اسلام کے مخالفوں سے بھی رسم درواہ جاری رہے۔ مَثَلُهُمْ فِي هَٰذَا كَأَنَّهُمْ هُوَ لَآءٍ وَلَا إِلَىٰ هُوَ لَآءٍ (۱۳۳:۴) تو ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا۔  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكُفْرَانَ أَوْلِيَاءَ مِنْ ذُنُوبِ الْمُؤْمِنِينَ أَتَرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ  
عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ۚ إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ هِيَ التُّرَابِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۱۳۵-۱۳۳:۴)

اسلام تو ایک مسلمان کے لیے یہ بات بھی جائز نہیں رکھتا کہ اگر اس کے ماں باپ، بھائی بہن، مسلمانوں سے لڑ رہے ہوں تو ان سے بھی کسی طرح کا واسطہ رکھے۔ لَا تَتَّخِذُوا آتِهَاءَ كُمْ وَ  
إِخْوَانِكُمْ أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّ اسْتَعْبٰوُ الْكُفْرَ عَلَى الْإِيْمَانِ طَوْمَن يَتَوَلَّوْهُم يَنْكُرْ فَاُولٰٓئِكَ هُم

الظَّالِمُونَ (۲۳:۹) اور جو مسلمان ایسے وقتوں میں محارب غیر مسلموں سے محبت و اعانت کا تعلق رکھیں خواہ وہ ان کے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں، ان کے مومن ہونے کی صاف صاف نفی کر رہا ہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ (۲۲:۵۸) مہاجرین صحابہ نے اس حکم کی تصویر بن کر دنیا کو دکھلایا کہ ایمان کے معنی کیا ہیں؟

پس اب فیصلہ کر لو کہ ان لوگوں کا حکم کیا ہونا چاہیے جو ایسے وقتوں میں بھی محارب غیر مسلموں کے دیئے ہوئے خطابوں سے پیار کریں گے ان کے دیئے ہوئے تمغوں کو (جن سے اکثر اسلام فروشی ہی کے صلہ میں ملے ہیں۔ اپنے سینوں پر جگہ دیں گے، ان کی بارگاہوں میں جا کر اطاعت و تعبد کا سر جھکا لیں گے، اور آہ، ان سب سے بھی بڑھ کر وہ، جو ان کی راہوں میں غلاموں کی طرح جھجھکیں گے ان کے حکموں پر کتوں کی طرح لوٹیں گے، ان کی خدمت و چاکری کے عشق میں اپنے دین و ایمان تک کو نثار کر دیں گے: فِإِنَّهُ وَلِلْمُسْلِمِينَ مِنْ هَذِهِ الْفَاقِرَةِ الَّتِي هِيَ اعْظَمُ فَوَاقِرِ الدِّينِ، الرِّزِيَّةُ الَّتِي مَارَزَى بِمِثْلِهَا سَبِيلَ الْمُؤْمِنِينَ:

لمثل هذا يدوب القلب من كمد

ان كان في القلب اسلام و ايمان



## هل للامام ان يمنع المتخلفين والقاعدین من الکلام معه والزيارة و نحوه؟

ایک اہم سوال شرعاً یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو مسلمان باوجود تبلیغ و تفہیم محارب غیر مسلموں سے ترک مواصلات نہ کریں اور ان کی مؤدت و اعانت سے باز نہ آئیں ان کے ساتھ مسلمانوں کو کیا سلوک کرنا چاہیے۔

حضرت کعب بن مالکؓ اور غزوہ تبوک کے متخلفین کا واقعہ گزشتہ باب میں گزر چکا ہے اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو مسلمان مصالحت امت کے خلاف روش اختیار کریں اور دشمنان ملت کے دفاع میں باوجود استطاعت حصہ نہ لیں، ان سے بھی مسلمانوں کو ترک مواصلات کروینا چاہیے۔

امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب بامرہا ہے هل للامام ان يمنع المجرمین و اهل المعصیہ من الکلام معه والزيارة و نحوه؟ یعنی کیا مسلمانوں کے امام کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ جو لوگ شرعی جرائم کے مرتکب ہوں ان سے ملنے بات چیت کرنے اور اسی طرح کے دیگر تعلقات رکھنے سے لوگوں کو روک دے؟ اور پھر اس میں حضرت کعب بن مالکؓ کی روایت درج کی ہے۔ گویا اس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ امام کو ایسا کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ زجر و تمبیہ اور عبرت پذیری کے لیے ایسا کرنا اعمال نبوت کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوگا۔

امام بخاری کا یہ استدلال نہایت واضح اور صاف ہے۔ آنحضرتؐ نے تمام مسلمانوں کو حکم دے دیا تھا کہ کسی طرح کا واسطہ ان لوگوں سے نہ رکھیں، نہ سلام کریں، نہ کلام کریں، نہ ملیں چلیں۔ یہاں تک کہ ان کو بیویوں تک سے تعلقات زوجیت رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ ”ضالقت علیہم الارض بمارحبت“ پس اس سے ثابت ہوا کہ جب کبھی اسلام اور امت کی حفاظت اور دفاع کا وقت آجائے اور تمام مسلمانوں کا اس میں شریک ہونا ضروری ہو تو جس مسلمان کی طرف سے اس میں سستی و کاہلی ہو یا انکار و تحلف ہو اس کا جرم عند اللہ نہایت شدید و عظیم ہے اور مسلمانوں کی جماعت کو حق پہنچتا ہے کہ زجر و تمبیہ کے لیے اس کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ان تینوں شخصیات کے ساتھ کیا گیا تھا اور

جب تک وہ اپنے رویہ سے باز نہ آجائیں کوئی مسلمان ان سے کسی طرح کا علاقہ نہ رکھے۔ جب ان مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک جائز ہوا جو سابقین انصار اور شرکاء بدر میں سے تھے اور جن کا تصور بجز سستی اور کاٹلی کے اور کچھ نہ تھا تو جو لوگ مرتع طور پر اعداء اسلام کے ساتھ اطاعت و اعانت کے تعلقات رکھیں اور دفاع اسلام کی سعی و تدبیر میں شامل ہونے سے صاف صاف انکار کریں ان کے لیے تو ایسا حکم دینا نہ صرف جائز و مشروع ہوگا بلکہ بھیجا واجب و لازم ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے امام حسن بصری کا کیا خوب قول نقل کیا ہے قال یا سبحان الله ما اكل هؤلاء الثلاثة مالا حراما، ولا سفكوا دما حراما ولا افهسوا لى الارض اصابعهم و اسمعتم و ضاقت بهم الارض بما رحبت فكيف بمن يواقع الفواحش والكبائر؟

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ”و فيها ترك السلام على من اذنب و جواز هجره اكثر من ثلاث و اما النهى عن الهجر فوق الثلاث لمحمول على من لم يكن هجره شرعا“ یعنی اس واقعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ بجز میں شرع سے ترک سلام و کلام کرنا جائز ہے اور تین دن سے زیادہ ان سے ترک تعلق کیا جاسکتا ہے۔ باقی رہی حدیث لا یحل لرجل ان یتھجر اصحابه فوق ثلاث یعنی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے ہجر ہے تو اس سے مقصود وہ ہجرتی ہے جو بلا سبب شرعی ہو اور اس واقعہ میں ہجرتی کا حکم جرم شرعی کے ارتکاب کی بنا پر ہوا۔ پس زیادہ عرصہ تک ترک تعلق جائز ہے۔

حافظ ابن قیم نے بھی حدیثی میں اس واقعہ سے یہ حکم مستنبط کیا ہے اور اپنے مخصوص طرز میں شرح بحث کی ہے۔

## حواشی

۱۔ امام بخاری اپنی عادت کے مطابق حدیث کعب کو مختلف ابواب میں لائے ہیں۔ باب تذکرہ یمن کتاب الاحکام کا آخری باب ہے اور مفصل حدیث کتاب المغازی میں ہے۔ کتاب المغازی کی شرح میں حافظ موصوف کی یہ عبارت ملے گی۔ (ج ۸: ۹)



## ایک شبہ اور اس کا ازالہ

بے جا نہ ہوگا، اگر یہاں ایک شبہ دور کر دیا جائے جو اس معاملہ کی نسبت ہوا ہے اور ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ”استعدل بعض المتأخرین لکولہما لم یشهدا بدر اہما وقع فی قصۃ حاطب وان النبی صلعم لم یہجرہ ولا عاقبہ مع کونہ جس علیہ بل قال لعمر لماہم بقتلہ لعل اللہ اطلع علی اہل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم۔ قال واین ذنب التعلف من ذنب الجس؟“ یعنی بعض متأخرین نے اس سے انکار کیا ہے کہ مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ شہداء بدر میں سے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کو یہ سزا نہ دی جاتی۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ سے محظ و کتابت کی اور وہ جرم بڑا ہی سخت جرم تھا یعنی جاسوسی کا تھا۔ اس پر بھی بیچہ بدری ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا اور لوگوں کو ان کے ساتھ ترک تعلق کا حکم نہیں دیا۔ کعب اور ان کے ساتھیوں کا اس سے بڑھ کر تو قصور نہ تھا؟ پھر اتنی بڑی سخت سزا ان کو کیوں دی گئی؟ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاطب کی معافی ان کے بدری ہونے کی وجہ سے تھی اور یہ لوگ اس لیے ماخوذ ہوئے کہ بدری نہ تھے۔ انہما

پھر حافظ موصوف نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ لوگ ضرور بدری تھے حاطب کو اس لیے کوئی سزا نہیں دی گئی کہ انہوں نے اپنے اہل و عیال کی حفاظت کا خطر پیش کیا تھا لیکن ان لوگوں کے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ پھر آگے چل کر سبکی کا جواب نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کو سخت سزا اس لیے دی گئی کہ انصار میں سے تھے اور انصار نے آنحضرت کی حمایت کا خاص طور پر وعدہ کیا تھا۔ ان پر دوسروں سے کہیں زیادہ معیت و نصرت فرض تھی۔ اس میں کوتاہی ہوئی تو مستحق تعزیر ہوئے۔

ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ شبہ جس قدر تعجب انگیز ہے اس سے کہیں زیادہ ان اکابر و اعلام کے جوابات و تعلیلات تعجب انگیز ہیں۔ سخت حیرانی ہوتی ہے کہ ایک نہایت صاف و واضح معاملہ کی نسبت کیوں اس قدر غیر ضروری کاوشیں کی گئیں اور کیوں اصلی علت سامنے نہ آئی؟

حضرت ہلال اور مرارہ کا بدری ہونا مسلم ہے۔ بخاری کی روایت میں خود حضرت کعب کہتے ہیں ”رجلین صالحین قد شہدوا بدر“ اور حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ اور اس معاملہ میں کسی طرح کی مناقات نہیں ہے۔ دونوں معاملے اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اس واقعہ پر جن لوگوں کو تعجب ہوا

انہوں نے حکم دفاع کی اہمیت پر نظر نہ ڈالی۔ اگر اس پر غور کر لیتے تو یہ شبہ پیدا ہی نہ ہوتا اور نہ ان کمزور توجیہوں کی ضرورت پیش آتی۔

ایک صورت عام طور پر حفظ ملک و نصرت قوم کی ہے اور ایک صورت خاص دشمن کے حملہ و جھوم کی ہے۔ پہلی حالت میں اگر جنگی احکام کی تعمیل میں سستی و کاہلی ہو تو اس درجہ سنگین نہیں ہوتی جس قدر دوسری حالت میں۔ پہلی حالت اندرونی امن کی ہے، دوسری بیرونی حملہ و جنگ کی۔ جنگ و دفاع کی حالت میں ایک ذرا سی سستی اور کاہلی بھی اتنا بڑا جرم ہوتی ہے کہ اس کی پاداش میں موت کی سزا کو بھی سخت نہیں کہا جاسکتا۔ اسی بنا پر شریعت نے ایک حالت حمیہ جہاد و رباط خلیل و استعداد کار کی قرار دی ہے دوسری حالت ”دفاع“ اور نفیر کی بتلائی۔ جب کسی دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہو اور مسلم و غیر مسلم جنگ کی حالت پیدا ہو گئی ہو تو وہ حالت دفاع کی ہے۔

حاطب بن ابن بلتعہ کا واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں امن تھا۔ قریش یا کسی دوسرے دشمن کی طرف سے اس وقت حملہ کا خوف نہ تھا۔ خود مسلمان مکہ پر حملہ کرنے والے تھے۔ کیونکہ قریش نے اپنا عہد و پیمانہ توڑ دیا تھا۔

لیکن حضرت کعب بن مالک کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہوں نے اس وقت ادائے فرض میں سستی کی جب دشمن کے حملہ و جھوم کا اعلان ہو چکا تھا اور چالیس ہزار روپیوں کے اجتماع کی خبریں آچکی تھیں۔ وہ حملہ کا وقت نہ تھا دفاع کا تھا۔ امام نے حکم دے دیا تھا اور نفیر عام کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت ادائے فرض میں غفلت کرنا ایسا سنگین جرم ہے کہ کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا۔ پس ضروری تھا کہ عبرت کے لیے کوئی سخت طرز عمل اختیار کیا جاتا تاکہ آئندہ ایسی غفلتوں کی کسی کو جرات نہ ہو۔

تعب ہے کہ حافظ ابن قیم کو بھی ”ہڈی“ میں یہی شبہ لاحق ہوا اور اسی لیے انہوں نے ہلال اور مراءہ کے بدری ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ وَالْفَلَطُ لَا يَعْصِمُهُ الْإِنْسَانُ



## گورنمنٹ کے لیے اصلی سوال

گورنمنٹ صرف اپنے فوائد و اغراض ہی سامنے رکھ کر غور کرے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو جو دنیا اور زندگی کی ساری چیزوں سے زیادہ اپنے مذہب کو محبوب رکھتے ہیں، ایک ایسی اہل اور لاعلاج کش کش میں ڈال دینا بہتر ہوگا جس میں ایک طرف ان کے مذہبی احکام ہیں دوسری طرف برٹش گورنمنٹ؟ اور دونوں ہاتھ آپس میں لڑتی ہیں کہ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتیں۔

اگر انسان کے ہاتھ اشارے کر کے طوفان اور بجلیوں کو بلا سکتے ہیں تو یقیناً برٹش گورنمنٹ اس وقت اس آدمی کی طرح ہے جو سمندر کے کنارے کھڑا ہے اور اپنا ہاتھ ہاتھ بلا ہلا کر طوفانوں کو دعوت دے رہا ہو۔

فی الحقیقت یہ نہ تو کوئی الجھاؤ ہے نہ کوئی مشکل مسئلہ۔ بالکل صاف اور سیدھی سی بات ہے بشرطیکہ حاکمانہ غرور اور طاقت کا نشہ چند لمحوں کے لیے عقل و انصاف کو کام کرنے دے۔

مسلمانوں کا مطالبہ شرعی احکام کا مطالبہ ہے۔ اسلام کے احکام کوئی راز نہیں ہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو۔ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز زیر درس و تدریس رہتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہیے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟

اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔ یا مسلمانوں کے لیے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو اور وہ اپنے مذہبی احکام کی بنا پر برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہو جائے پر مجبور ہو جائیں۔

یا پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے نہ وہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔ اس کو صرف زیادہ سے زیادہ زمین چاہیے زیادہ سے زیادہ حکومت چاہیے موصول کے تیل کے چشمے چاہئیں، عراق کی زرخیز زمین کی دولت چاہیے اور اسلامی خلافت کا خاتمہ تاکہ دنیا میں اس کا کوئی اسلامی حریف باقی نہ رہے۔ اگر ایسا کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی احکام متصادم ہوتے ہیں، تو ہوں۔ اگر ان پر طرح طرح کے اشد فرائض عائد ہو جاتے ہیں تو

ہوا کریں۔ ان کو ہر حال میں برٹش گورنمنٹ کا وقادار غلام بنا رہنا چاہیے اگر چہ اس کی خاطر انہیں اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہو جانا پڑے۔

اس کے بعد مسلمانوں کے لیے بھی نہایت آسان ہو جائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور و غل میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لیے پسند کر لیں۔



KITABOSUNNAT.COM

## نظام عمل مسلمانان ہند اور نظام جماعت

لیکن ہمارے لیے اصلی سوال اب یہ نہیں رہا ہے کہ گورنمنٹ کو کیا کرنا تھا صرف یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اس بارے میں مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آ جائیں جس میں ایک عرصہ سے جتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔

”جماعتی زندگی کی معصیت“ سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک ”جماعت“ بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوهہ جھل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر کم ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات کجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنی چاہتے ہیں، کیشیاں بناتے ہیں اور کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں لیکن یہ تمام اجماعی نمائشیں شریعت کی نظروں میں ”بھیڑ“ اور ”انبوهہ“ کا حکم رکھتی ہیں جماعت کا حکم نہیں رکھتیں۔ ”بھیڑ“ اور ”جماعت“ میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آ جاتی ہے جب کوئی تماشا ہو رہا۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت، ایک حالت اور ایک ہی امام کے پیچھے جمع ہوتی ہیں۔

شریعت نے مسلمانوں کے لیے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دیے ہیں۔ وہاں ان کے لیے ایک اجماعی نظام بھی قرار دے دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی اجماع کا نام ہے۔ افراد و اشخاص کوئی شے نہیں۔ جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و عادات میں سرگرم ہوں لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں اور قوم جماعتی معصیت میں جتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکا یک برباد نہیں کر دیتے بلکہ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا خم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا خم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

فحشی اعمال کی اصلاح و درنگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہو سکتی

۴

کتاب وسنت نے جماعتی زندگی کے تین رکن بتلائے ہیں:

تمام لوگ کسی ایک صاحب علم و عمل مسلمان پر جمع ہو جائیں اور وہ ان کا امام ہو وہ جو کچھ تعلیم دے، ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں۔

قرآن وسنت کے ماتحت اس کے جو کچھ احکام ہوں، ان کی بلاچون و چرا تعمیل و اطاعت کریں۔

سب کی زبانیں گوئی ہوں۔ صرف اسی کی زبان گویا ہو۔ سب کے دماغ بیکار ہو جائیں صرف اسی کا دماغ کار فرما ہو۔ لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ۔ صرف دل ہو جو قبول کرے اور صرف ہاتھ پاؤں ہوں جو عمل کریں۔

اگر ایسا نہیں ہے تو ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، جانوروں کا ایک جنگل ہے، کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے۔ مگر نہ تو "جماعت" ہے نہ "امت" نہ "قوم" نہ "اجتماع" اثبتیں ہیں مگر دیوار نہیں۔ کنکر ہیں، مگر پہاڑ نہیں۔ قطرے ہیں مگر دریا نہیں۔ کڑیاں ہیں جو کلوے کلوے کر دی جاسکتی ہیں مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار کر سکتی ہیں۔

کسی گزشتہ فصل میں بہ حسن شرح حدیث حارث اشعری "جماعت" کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے اس موقع پر وہ پیش نظر ہے۔

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا، نہ کہ دانہ ڈالنے کا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی جدوجہد کی تمام گذشتہ زندگی ہم مشکل دے حاصلی میں ضائع کر دی۔ حتیٰ کہ سچ و حق وہ وقت آ گیا جس کی تباہیوں کا تخیل پیدا کر کے کبھی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے: لَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا فَأَلَّيْ لَهُمْ إِذَا جَاءَ نُهُمْ ذُكْرُهُمْ (۱۸:۲۷)۔ اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا۔ سچے کام کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے، مگر جب کبھی کیا جائے سچائی ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی وقت ناموافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف۔ اس کے کرنے میں جس قدر دیر کی جائے گی معصیت اور ہلاکی ہے لیکن جب کبھی کرویا جائے، سچائی اور نیکی ہے اور اس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی۔

تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص کاموں کا نام سن پاتے ہو اور پھر جینے چلانے لگتے ہو اور جس طرح اونگھتا ہوا آدی ایک مرتبہ چونک اٹھتا ہے، یکا یک اعتقاد

اور عمل دونوں تمہیں یاد آجاتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں میں ہی تمہاری مصیبت وجود میں آتی ہے نہ کامیابی کی راہ کسی خاص کام کے پڑ جانے پر موقوف ہے۔ تمہاری مصیبت دائمی، تمہارا ماتم پیشگی کا، تمہارا روگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سایا ہوا اور تمہاری نحوست جو میں گھنے تمہاری ساتھی ہے اور ٹھیک اسی کی طرح تمہاری کامیابی و خوشحالی بھی ہر وقت تمہارے سائے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی ہے اور ہر آن و ہر لمحہ تمہارے وجود کے اندر سائی ہوئی ہے۔

تم وقت پر سامنے آجانے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھلے جاتے ہو؟ اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ درست کیوں نہیں کر لیتے؟ جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا، روزے نئے روگ لگتے رہیں گے۔ خلافت کا مسئلہ کل سے سامنے آیا ہے، مگر تمہاری بربادی کا مسئلہ کل ہی سے نہیں شروع ہوا۔ پس تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے اور قوم و فرد کو دونوں اعتباروں سے ٹھیک ٹھیک اسلامی زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ اس ایک کام کے انجام پانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے۔ سوال حکومتوں کے نکل جانے کا نہیں ہے ایمان کی گم نشکلی اور محرومی کا ہے۔

درازی شب و بیداری من این ہمہ نیست

زبخت من خبر آرید تا کجا نھست

اسی مسئلہ خلافت کو دیکھو! شرعی اور سیاسی، دونوں پہلوؤں سے کس قدر اہم اور نازک معاملہ ہے؟ اگر آج مسلمانوں میں ان کے ائمہ و مشاہیر موجود ہوتے تو ان میں سے بھی ہر شخص زبان نہ کھولتا کسی ایک صاحب نظر و عمل کے احکام پر سب کار بند ہو جاتے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں آج تمہارا حال کیا ہو رہا ہے؟ کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے۔ اسی فتنی سے اس پہاڑ کو بھی کترنا چاہتے ہو۔ ہر زبان جو یزیدیں پیش کر رہی ہے، ہر قلم امام و مجتہد کی طرح احکام نافذ کر رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی دہنے بلاتا ہے، کوئی بانئیں۔ کیا اس طوائف الملوکی اور ذمی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا پورا اندر ہے، یہ ہم سر ہو سکتی ہے؟

شرعی پہلو سے مسئلہ کا یہ حال کہ ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب و سنت کے معارف و خواص سے معمور ہو۔ وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر ان کے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر ایک ایک لمحہ کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر ٹھیک ٹھیک منطبق کرے اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد کھائے شرع صادر کرتا رہے۔ نہ ہر عالم اس کا اہل ہے نہ ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس

سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو جو کام فوجوں اور حکومتوں کی طاقت سے انجام پاسکتا ہے اس کو تم صرف اپنی جماعتی قوت کے استعمال سے حاصل کر سکتے ہو۔ پھر کس قدر نامرادی ہے کہ وہ قوت بھی ناپید ہے؟

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں، وہ جوش و سرگرمی کی کمی ہے اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے لیکن اگر صحیح راہ عمل نہ اختیار کی گئی تو یہی بات سب سے زیادہ معزز بھی ہو جاسکتی ہے۔ جذبات کی مثال اسٹیم کی سی ہے۔ بغیر اسٹیم کے کچھ نہیں ہو سکتا لیکن وہ بھی بغیر مشین اور سائق (ڈرائیور) کے کچھ نہیں کر سکتی۔ مشین اس کی طاقت کو ترتیب دیتی اور ڈرائیور اس سے کام لیتا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک اور مہلک چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ کاش وہ نہ ہوتی۔ وہ ٹرین کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے مگر انجنوں کو ٹکرا کر ہزاروں انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے۔

”جذبات“ اسی وقت کام دے سکتے ہیں جب ان کو مرتب کرنے اور ان پر حکم و تقاضا کے لیے ”ادراک“ اور ”دماغ“ بھی موجود ہو۔ وذلک من عمل النہوۃ ولكن لا یعقلہا الا العالمون۔

بہر حال اس وقت اور ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے راہ عمل ”یہی ہے کہ مسلمان سب سے پہلے اسلام کی جماعتی زندگی اختیار کر لیں۔ اسی پر مسئلہ خلافت اسلامی کے بھی تمام مہمات و اعمال موقوف ہیں۔ تمام مسلمانوں کو ان ہمدردانہ ملت کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور تمام ملک میں اس کی شاخوں کے قیام کا سر و سامان کیا۔ لیکن خلافت کمیٹی کا نظام مسلمانوں کو جماعتی و شرعی نظام کے قیام سے مستغنی نہیں کر دے سکتا۔ خلافت کمیٹی روپیہ جمع کرے گی، ایجنسی نیشن جاری رکھے گی، تبلیغ و اشاعت کرے گی۔ لیکن نہ تو وہ قوم کو سنہال سکتی ہے نہ کمیٹیوں سے ”جماعت“ پیدا ہو سکتی ہے نہ شرعی نظام کی قائم مقامی ہو سکتی ہے۔ وہ خود احکام شرعیہ کے علم کے لیے، اپنے قیام و تکمیل کے لیے۔ رفع تفرقہ و انتشار کے لیے اور روح اجتماع و قوام کے نفوذ کے لیے ایک بالاتر قوت حاکمہ و نافذ کی محتاج ہے اور اگر وہ قوت نہیں ہے تو پھر اس کی ہستی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔

نظام شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سوچتا رہے کہ مسئلہ خلافت کے لیے کیا کرنا چاہیے اور اخباروں میں آنریبل لکھے جائیں کہ علمی راہ کیا ہونی چاہیے؟ اور نہ ہر شخص یا چند آدمیوں کی بنا کی ہوئی کمیٹی کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو کسی خاص راہ کی طرف دعوت دینا شروع کر دے۔ یہ کام صرف ایک صاحب نظر و اجتہاد کا ہے جس کو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو۔ وہ وقت اور حالات پر اصول و احکام شریعت کو منطبق کرے گا۔ ایک ایک جزئیہ حوادث و واقعات پر پوری کارروائی و نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالے گا۔ امت و شرع کے اصول مصالح و مقاصد اس کے سامنے ہوں گے، کسی ایک گوشے ہی میں مستغرق نہ



ہو جائے گا کہ باقی تمام گوشوں سے بے پردہ ہو جائے۔

حفظت شیئاً و غایت عنک اشیاء

سب سے بڑھ کر یہ کہ اعمالِ مہمہ امت کی راہِ حق میں منہاجِ نبوت پر اس کا قدم استوار ہوگا اور ان ساری باتوں کے علم و بصیرت کے بعد ہر وقت، ہر قسم، ہر حالت، ہر جماعت کے لیے احکامِ شرعیہ کا استنباط کر سکے گا۔

KITABOSUNNAT.COM

زبان زکنتہ فرو مائتہ و راز من باقیست  
بضاعت سخن آخشد و سخن باقیست

عزیزان ملت! اس طول طویل محبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس میں کوئی بات

بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر تھی ہو۔ یہ تمام وہی انسانہ کہن ہے جو پچھلے دس سالوں سے برابر دہراتا رہا ہوں اور اگر ”الہلال و”البلاغ“ کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہو گئی ہیں تو تم اس کی تصدیق کرو گے تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا، اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں وَلٰكِنْ لَا تَذٰحِبُوْنَ النَّاصِحِيْنَ (۷۹:۷)۔ افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامہ کے بندے اور وقتی جذبات و العجاور پیمان کی مخلوق ہو، تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر اور نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی ہو جاتے ہو۔ تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اتنا ہی تمہارا انحراف آسان ہے اور اسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت ہے اور نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دل ہے، نہ دماغ، و سادس ہیں جن کو تم انکار سمجھتے ہو۔ خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو۔ خدا را بتلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آج جن ہاتوں کے لیے تم در رہے ہو، یہ وہی ہاتھ ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بن کر نکلتی تھیں۔ مگر تمہارے سینے کے اندر دل نہیں پھر کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے ٹکرا کر واپس آ جاتی تھیں؟ اور تم یک قلم انکار و اعراض میں غرق تھے

تم نے اعراض ہی نہیں کیا۔ بلکہ جَعَلُوا اَصَابِعَهُمْ لِيٰ اِذِ اَنهٰمْ وَاَسْتَفْشَسُوْا لِيَاہُمْ وَاَصْرُوْا وَاَسْتَكْبَرُوْا وَاَسْتَكْبَرُوْا (۷۹:۷) کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کر دیں۔ میں نے تم میں سے ہر گردہ کو نڈولا۔ میں نے دلوں اور زروحوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی کوئی بھیڑ دیکھی فریاد کی۔ جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا۔ لیکن فَلَمَّ يَدْرِ فُھُمْ دُعَاۤءِ حٰی اِلَّا فِرَارًا (۷۹:۷) بہت کم رو میں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔ یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشہ قید و بند میں چلا گیا۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن ٹکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں اب میں پھر تم

میں واپس آ گیا ہوں لیکن تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں بھی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے جیسے کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آئی۔ تم مجھے بلا تے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر اتارو۔ ایسے پر جوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتح منہ فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہیں اور پھر اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لے کر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے اور تمہارے اس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مر جھائی ہوئی ہیں۔

انسوس اتم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو اور تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں ایک بے یارو آشا غریب الوطن ہوں۔

من بہر جمعے نالاں شدم	جنت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یا رمن	وز دروں من نہ جنت اسرار من
سرم از نالہ من دور نیست	لیک کس را گوش آں منظور نیست

میری راپوں میں نہ کبھی تہدیلی ہوئی نہ میرے سفر میں کبھی پیمین و سیار کا تذبذب پیش آیا ہے۔ تہدیلیاں لکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولیٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں۔ انسانی تقلید اس کا سرچشمہ ہے اور انسانوں اور قوموں کا اجراع اس کا منبع۔ لیکن ان عقائد میں کبھی تہدیلی نہیں ہو سکتی جو وحی و منزل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہیں۔ الحمد للہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا وہ میرے عقائد و معلومات تھے، تمہارے بڑوں کی طرح آراء و منظومات نہ تھے۔ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۲۸:۵۳) اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا، بہتوں نے استہزاء کیا۔ کتنوں ہی نے کہہ دیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی ہناوٹ اور مافوق الفطرت دعویٰ کا اعلان ہے: یہویدان بفضصل علیہنا۔ بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری اور ایک طرح کی ادبیانہ افسوس گری ہے: اکتبہا لہی قملی علیہ بکورة و أصیلا (۵:۲۵) لیکن دیکھو! ہلا! خرفرتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ سب اسی راہ پر چل پڑے۔ بہتوں نے دانستہ اور بہتوں نے نادانستہ، مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔ آج تم سب انہیں ”مافوق الفطرت دعویٰ“ اور ”ساحرانہ فصاحت طرازوں“ کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے ہو اور ”قیام شریعت“ اور ”تقدیم واجاع شریعت“ اور ”حفظ و دفاع ملت“ کے ناموں سے موسوم کرتے ہو۔

پس جبکہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے

تجربہ کا وقت آ گیا۔ راہ عمل کے لیے تمہارا رخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو اور میری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بلا چکا ہوں۔ تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بوسوگتھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت لے لو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کرو۔ کھو

فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ ۗ وَالْقَوْصُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ

(۴۴:۴۰)



## ضمیمہ (۱) جدول سنین خلافت اسلامیہ

سنہ ہجری	سنہ شمسی	نام خلفاء	نمبر
۱۱	۶۳۲	ابوبکر صدیق	۱
۱۳	۶۳۴	عمر بن خطاب	۲
۲۳	۶۴۴	عثمان بن عفان	۳
۳۵	۶۵۲	علی بن ابی طالب	۴
		سلسلہ بنو امیہ	
۴۱	۶۶۱	معاویہ بن ابی سفیان	۵
۶۰	۶۸۰	یزید بن معاویہ	۶
۶۳	۶۸۳	معاویہ بن یزید	۷
۶۳	۶۸۳	مروان بن الحکم	۸
۶۵	۶۸۳	عبدالملک بن مروان	۹
۸۶	۷۰۵	الولید بن الملک	۱۰
۹۶	۷۱۴	سلیمان بن عبدالملک	۱۱
۹۹	۷۱۷	عمر بن عبدالعزیز	۱۲
۱۰۱	۷۱۹	یزید بن عبدالملک	۱۳
۱۰۵	۷۲۳	ہشام بن عبدالملک	۱۴
۱۲۵	۷۴۲	الولید بن یزید بن عبدالملک	۱۵
۱۲۶	۷۴۳	یزید بن الولید	۱۶
۱۲۶	۷۴۳	ابراہیم بن الولید	۱۷
۱۲۷	۷۴۴	مروان بن محمد بن مروان	۱۸
		سلسلہ عباسیہ	
۱۳۲	۷۴۹	ابوالعباس سفاح	۱۹

٤٥٣	١٣٤	ابو جعفر منصور	٢٠
٤٤٣	١٥٨	المهدي بن منصور	٢١
٤٨٥	١٦٩	المهادي بن المهدي	٢٢
٤٨٦	١٤٠	هارون الرشيد بن المهدي	٢٣
٨٠٨	١٩٣	محمد الامين بن هارون	٢٣
٨١٣	١٩٨	الماسون بن هارون	٢٥
٨٣٣	٢١٨	المختصم بن هارون	٢٦
٨٣٢	٢٢٤	الواثق بن المختصم	٢٤
٨٣٤	٢٣٢	التوكل على الله بن المختصم	٢٨
٨٦١	٢٣٤	المستنصر بالله بن التوكل	٢٩
٨٦٢	٢٣٨	المستعين بالله بن المختصم	٣٠
٨٦٦	٢٥٢	المحرر بالله بن التوكل	٣١
٨٦٩	٢٥٥	المهدي بالله بن الواثق	٣٢
٨٤٠	٢٥٦	المستمد بالله بن التوكل	٣٣
٨٩٢	٢٤٩	المستهد بالله بن الموفق	٣٣
٩٠٨	٢٩٥	المقتدر بالله بن الموفق	٣٥
٩٣٣	٣٢٢	الراضي بالله بن المقتدر	٣٦
٩٣٥	٣٢٩	المستغنى بالله بن المقتدر	٣٤
٩٣٣	٣٣٣	المستغنى بالله بن المستغنى	٣٨
٩٣٦	٣٣٣	الطبع بالله بن المقتدر	٣٩
٩٤٢	٣٦٣	الطابع بالله بن الطبع	٤٠
٩٩١	٣٨١	القادر بالله بن المقتدر	٤١
١٠٣١	٣٣٢	القائم بامر الله بن القادر	٤٢
١٠٤٥	٣٦٤	المقتدى بالله بن القائم	٤٣
١٠٩٣	٣٨٤	المستظهر بالله بن المقتدى	٤٤
١١١٨	٥١٢	المسرشد بالله بن المستظهر	٤٥
١١٣٥	٥٢٩	الرشيد بن المسرشد	٤٦

۱۱۳۶	۵۳۰	المختص بن المستعمر	۴۷
۱۱۶۰	۵۵۵	المستعجب بالله بن المختص	۴۸
۱۱۸۰	۵۶۶	المستغنى بنور الله بن المستعجب	۴۹
۱۱۷۰	۵۷۵	الناصر الدين الله بن المختص	۵۰
۱۲۲۵	۶۶۲	الظاهر بالله بن الناصر	۵۱
۱۲۲۳	۶۶۳	المستعصر بالله بن الظاهر	۵۲
۱۲۲۳	۶۶۰	المستعصم بالله بن المستعصر	۵۳
		عباسية مصر	
۱۲۵۸	۶۵۶	المستعصر بالله	۵۴
۱۲۶۲	۶۶۱	الحاكم بامر الله	۵۵
۱۳۰۱	۷۰۱	المستغنى بالله	۵۶
۱۳۳۹	۷۴۰	الواثق بالله	۵۷
۱۳۴۱	۷۴۲	الحاكم بامر الله	۵۸
۱۳۵۲	۷۵۳	المستعبد بالله	۵۹
۱۳۶۱	۷۶۳	التوكل على الله	۶۰
۱۳۸۳	۷۸۵	الواثق بالله	۶۱
۱۴۰۱	۸۰۸	المستعصم بالله	۶۲
۱۴۱۲	۸۱۵	المستعبد بالله	۶۳
۱۴۳۱	۸۴۰	المستغنى بالله	۶۴
۱۴۵۰	۸۵۳	القائم بامر الله	۶۵
۱۴۵۳	۸۵۹	المستعجب بالله	۶۶
۱۴۷۹	۸۸۳	التوكل على الله	۶۷
۱۴۹۷	۹۰۳	المستعجب بالله	۶۸
۱۵۰۶	۹۱۲	التوكل على الله	۶۹
		سلسله عثمانية	
۱۵۱۷	۹۲۳	سليم خان اول	۷۰
۱۵۲۰	۹۲۶	سليمان اول	۷۱

۱۵۶۶	۹۷۳	سلیم ثانی	۷۲
۱۵۷۳	۹۵۲	مراد ثالث	۷۳
۱۵۹۶	۱۰۰۳	عمر ثالث	۷۴
۱۶۰۳	۱۰۱۲	احمد اول	۷۵
۱۶۱۸	۱۰۲۷	مصطفیٰ اول	۷۶
۱۶۱۸	۱۰۲۷	عثمان ثانی	۷۷
۱۶۲۳	۱۰۳۲	مراد رابع	۷۸
۱۶۳۰	۱۰۳۹	ابراہیم اول	۷۹
۱۶۷۳	۱۰۵۳	عمر رابع	۸۰
۱۶۸۷	۱۰۹۹	سلیمان ثانی	۸۱
۱۶۹۱	۱۱۰۲	احمد ثانی	۸۲
۱۶۹۵	۱۱۰۶	مصطفیٰ ثانی	۸۳
۱۷۰۳	۱۱۱۵	احمد ثالث	۸۴
۱۷۳۰	۱۱۳۲	عمر اول	۸۵
۱۷۵۳	۱۱۴۸	عثمان ثالث	۸۶
۱۷۵۷	۱۱۷۱	مصطفیٰ ثالث	۸۷
۱۷۷۳	۱۱۸۷	عبد المجید اول	۸۸
۱۷۸۹	۱۲۰۳	سلیم ثالث	۸۹
۱۸۰۷	۱۲۲۲	مصطفیٰ رابع	۹۰
۱۸۰۸	۱۲۲۳	محمود ثانی	۹۱
۱۸۳۹	۱۲۵۵	عبد المجید	۹۲
۱۸۶۱	۱۲۷۷	عبد العزیز	۹۳
۱۸۷۶	۱۲۹۳	مراد خامس	۹۴
۱۸۷۶	۱۲۹۳	عبد الحمید ثانی	۹۵
۱۹۰۸	۱۳۲۳	عمر خامس	۹۶
		امیر المومنین السلطان محمد خان	۹۷
۱۹۱۸	۱۳۳۶	سادس خلد اللہ ملک و شوکت	



(۲)

## مواعید و عہود

اس کتاب میں گورنمنٹ انگلستان و ہند کے جن وعدوں اور سرکاری اعلانات کی طرف جا رہا ہے، اشارہ کیا گیا ہے، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

(۱) گورنمنٹ آف انڈیا کا اعلان جوڑکی کے شامل جنگ ہونے کے بعد ۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو شائع

ہوا:

برطانیہ عظمیٰ اور ترکی میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ برطانیہ کو اس کا سخت افسوس ہے کہ یہ بڑے مشورے اور بلا کسی اشتعال کے اور خوب سوچ سمجھ کر دولت عثمانیہ کی طرف سے عمل میں لائی ہے لہذا ہر ایک سلسلے و دسترائے ہند ہر جمعی کی گورنمنٹ کے حکم کے مطابق عرب کے مقامات مقدسہ کے بارے میں جن میں عراق کے متبرک مقامات اور ہندو گاہ جدہ بھی شامل ہے، مندرجہ ذیل اعلانات کرتے ہیں ”کہ ہر جمعی کی نہایت وفا دار مسلم رعایا کو غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اس جنگ میں مذہبی جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ان مقامات مقدسہ اور ہندو گاہ جدہ پر برطانیہ بری و بحری طاقتوں سے کبھی حملہ نہ ہوگا۔ نہ ان کو ستایا جائے گا جب تک کہ حجاج و زائرین ہند سے جو ان مقامات مقدسہ میں جائیں، کوئی پھینٹ چھاڑ نہ کی جائے۔ ہر جمعی کی گورنمنٹ کی آستد عا پر گورنمنٹ فرانس و روس نے بھی اسی طرح کا یقین دلایا ہے۔

(۲) ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اپنی مشہور تقریر میں کہا : ”ہم اس لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دارالحکومت سے محروم کر دیں یا ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز و شہرہ آفاق علاقے لے لیں جن میں ترکی النسل آبادی کا جزو غالب ہے۔

ہم اس بات کے بھی مخالف نہیں کہ جن علاقوں میں ترکی نژاد آبادی ہے، وہاں ترکوں کی سلطنت قائم ہے یا قسطنطنیہ اس کا پایہ حکومت ہو۔ البتہ بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کے درمیانی راستہ کو بین الاقوامی ضبط و نگرانی میں لانے کے بعد ہماری رائے میں عرب آرمینیا، عراق، شام اور فلسطین اپنی

اپنی جداگانہ قومی حکومتوں کے مستحق ہیں۔

وزیر اعظم نے یہ جو کچھ کہا تھا؟ کیا محض ان کی ذاتی رائے تھی جس کی ذمہ داری صرف ان پر عائد ہوتی ہے یا برطانیہ کا سرکاری اعلان تھا؟ اور اگر سرکاری اعلان تھا تو صرف وزارت اور اس کی گورنمنٹ کا تھا یا تمام برٹش قوم اور امپائر کا؟

اس کا جواب اس تمہید سے ملتا ہے جو اس تقریر کے ابتدا میں موجود ہے:

”اس تمام بحث و گفتگو کے بعد جو قلمرو کے مختلف انجیال اور مختلف الرائے طبقوں کے نمائندوں کے ساتھ ہوئی ہے میں خوشی سے اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ آج جو کلمات کہوں گا ان کے لیے گو تھا حکومت ہی ذمہ دار ہوگی مگر ہمارے جنگی مقاصد، شرائط صلح کی نوعیت اور اس کی غرض و قیامت کے متعلق میرے جو بیانات آپ سے اور آپ کی معرفت تمام دنیا سے ہوں گے، ان سے تمام قوم متحد و متفق ہے۔ میں دلیری کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں صرف گورنمنٹ کے مافی الضمیر ہی کی نہیں بلکہ تمام قوم اور تمام قلمرو کی بحیثیت مجموعی ترجمانی کر رہا ہوں۔

پھر ۲۶ فروری ۱۹۲۰ء کو ہاؤس آف کامنز میں تقریر کرتے ہوئے اس اعلان کی نسبت وزیر اعظم کہتے ہیں۔

”ہمارا وہ اعلان بہت وسیع السنہ تھا اور بہت کچھ سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ تمام جماعتوں کی مرضی کے مطابق تھا۔ مزدوروں کی جماعت بھی اس سے متفق تھی۔“

(۳) پریسیڈنٹ امریکہ مسٹر لن نے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو چودہ شرطوں کا اعلان کیا تھا جو با اتفاق فریقین صلح کے لیے بنیادی شرطیں قرار پائی تھیں ان میں بارہویں شرط یہ تھی۔

”موجودہ سلطنت عثمانیہ میں ترکی کا جو حصہ ہے اس کو یقین دلا یا جائے گا کہ اس کی وہ سلطنت محفوظ رہے گی لیکن دوسری اقوام جو سلطنت ترکی کے زیر حکومت ہیں انکو بھی اس کا اطمینان دلا دیا جائے کہ ان کی جان و مال محفوظ رہے اور ان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔“



(۳)

## ایفاء عہد

یہ وعدے جس طرح پورے کیے گئے، ان کی مختصر تفصیل یہ ہے

(۱) گورنمنٹ ہند نے عراق پر حملہ کیا جس کا بڑا حصہ جزیرہ عرب کے مقدس حدود میں داخل ہے۔

(۲) ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو بصرہ پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی بندرگاہ اور زیارت گاہ ہے۔

(۳) ۲۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو عراق کی مشہور زیارت گاہ سلمان پارک پر حملہ کیا گیا جہاں حضرت سلمان

فارسی کا مزار ہے۔

(۴) مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

(۵) ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس میں برطانوی فوجیں داخل ہوئیں اور انگریزی قبضہ کا اعلان کیا

گیا جو اسلام کی مقدس زیارت گاہ اور تین مقدس مقامات میں سے ایک اہم مقام ہے۔

(۶) ۵ جون ۱۹۱۹ء کو خاص سرزمین حجاز میں سازش کی گئی اور شریف مکہ سے بغاوت کرائی گئی۔ اس

بغاوت کی وجہ سے اس محترم دارالامن میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا اور حدود و حرم میں گولہ باری ہوئی۔

(۷) حسب تصریح نامہ نگار لندن ٹائمز بندرگاہ جدہ پر گولہ باری کی گئی۔

(۸) ہجر اس کے ہوئی جہاز نے عین مدینہ طیبہ کی فضا میں چکر لگائے (جیسا کہ ڈاکٹر ہارٹھ نے

فروری ۱۹۲۰ء کو ٹائون ہال آکسفورڈ کی تقریر میں بیان کیا؟

(۹) کوفہ، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہیں ہیں۔

(۱۰) ترکی کو تقریریں کے علاقہ سے مع ایڈریا ٹولپل کے محروم کر دیا گیا جہاں مسلمانوں کی سب سے

زیادہ آبادی ہے۔

(۱۱) صلح نامہ، ترکی کی دفعہ ۳۶ کے مطابق ترکی سے اس کے دارالسلطنت کی خود مختارانہ فرمانروائی

بھی سلب کر لی گئی اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

(۱۲) سمرنا جو ایشیائے کوچک کا مشہور زرخیز مقام ہے، ترکی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ وہاں کی مسلمان

آبادی پر یونانوں نے اس قدر ظلم و ستم کیے کہ بے شمار جانیں ہلاک و تباہ ہو گئیں اور ہورہی ہیں۔

(۱۳) صلح نامہ کی شرائط نے بقیہ ایشیائے کوچک کے مالی اور ہر طرح کے فوجی اختیارات کی

خود مختاری سے بھی ترکی کو محروم کر دیا ہے۔ وہ ایک محدود تعداد سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتا۔ چند چھوٹے

جنگی جہازوں کے علاوہ کوئی بحری قوت حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنی عیسائی رعایا پر اسے کوئی اختیار نہیں رہا۔ اس کی حیثیت بالکل ایک ماتحت ریاست کی سی ہو گئی ہے جو برائے نام پادشاہت سے ملقب کر دی گئی ہو۔ (۱۳) صلح نامہ کی دفعہ ۳۹ کے بموجب سلطان المعظم کے وہ تمام دینی و اسلامی اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں جو بحیثیت خلیفۃ المسلمین انہیں حاصل تھے اور جن کے الگ کر دینے کے بعد خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس دفعہ کا منشا یہ ہے۔

”حکومت ترکی اپنے تمام اختیارات سے جو حکم برداری کے یا دوسری طرح کے مسلمانوں پر رکھتی ہے بالکل دست بردار ہوتی ہے۔“ ترکی بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی طرح کے اختیارات ان ممالک پر نہ رکھے گی جو ترکی سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔“

حالانکہ شرعاً منصب خلافت کے معنی یہ ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں اور تمام دنیا کی اسلامی حکومتوں پر اس کو ایک بالاتر اختیار ہو اور وہ تمام اسلامی دنیا میں ایک مرکزی اسلامی اقتدار کی حیثیت رکھے لیکن اس دفعہ نے ترکی کو ان تمام اختیارات خلافت سے محروم کر دیا اور اسلامی خلافت اپنے کامل معنوں میں پارہ پارہ ہو گئی۔

(۱۵) شام کو ترکی سے الگ کر کے آزادی نہیں دی گئی بلکہ فرانس کی حکم برداری و بالادستی ماننے پر مجبور کیا گیا۔ شام کی تمام آبادی انسانیت و صداقت عہد کے نام پر فریاد کرتی رہی اور فرانس کی فوجوں نے اس پر جبراً قبضہ کر لیا۔

(۱۶) عراق کی آبادی کو خود مختاری و آزادی نہیں دی گئی بلکہ برطانیہ نے اس کی حکم برداری کا دعویٰ کیا اور اس پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ وہاں کی آبادی ایٹھے عہد کا مطالبہ کرتے کرتے مایوس ہو گئی اور اب بزدل شمشیر اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ ان کو ”باغی“ کہا جا رہا ہے حالانکہ اگر برطانیہ کے اعلانات سچے تھے اور اس کی فوجیں ”رعایا“ بنانے کے لیے نہیں بلکہ آزاد کرانے کے لیے کی گئی تھیں تو وہ ”باغی“ کیونکر ہو سکتے ہیں بغاوت کا اطلاق رعایا کی شورش پر ہوتا ہے نہ کہ کسی آزاد جماعت کی شمشیر زنی پر۔

(۱۷) یہ تمام نتائج صلح نامہ ترکی کے ہیں لیکن قبل اس کے کہ ترکی اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ صلح کرے برٹش فوجوں نے دارالخلافہ قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت بالکل ایک نظر بندی قیدی کی سی ہو گئی۔ اس قبضہ کی وجہ سے اسلام کے دارالخلافہ میں جو درواغیز واقعات و حوادث پیش آئے اور عثمانی خلافت عظمیٰ کی متصل پانچ صدیوں میں پہلی مرتبہ جو توہین ہوئی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ وہ سلوک ہے جو نہ تو جرمنی کے ساتھ کیا گیا نہ آسٹریلیا کے ساتھ اور نہ کسی دوسرے فریق جنگ کے ساتھ۔

